بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

1892

سورۃ الملک (67)

آیت نمبر (1 تا 5)

ط	ب	ق

(س) طَبَقًا بادل کا فضا کو ڈھانپ لینا۔ عمارت کی منزل کے اوپر اور منزل ہونا۔

طَبَقٌ اسم ذات بھی ہے۔ کسی چیز کے اوپر کی چیز۔ منزل کے اوپر کی منزل۔ ﴿ لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ ﴾ (84/الانشقاق:19) ''تم لوگ لازماً چڑھو گے ایک منزل پر ایک منزل سے۔''

(مفاعلہ) طِبَاقًا مُطَابَقَةً (۱) ایک چیز کا دوسری کے مطابق ہونا۔ (۲) ایک جیسی چیزوں کا ایک دوسرے کے اوپر ہونا۔ زیر مطالعہ آیت۔3

ترجمہ

تَبٰرَكَ الَّذِیۡ	بِیَدِهِ	الۡمُلۡكُ ۫	وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ	قَدِیۡرُ ۙ﴿۱﴾
بابرکت ہوئی وہ (ذات)	جس کے ہاتھ میں	ساری بادشاہت ہے	اور وہ ہر چیز پر	قدرت رکھنے والا ہے

الَّذِیۡ خَلَقَ	الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوةَ	لِیَبۡلُوَكُمۡ	اَیُّكُمۡ اَحۡسَنُ
جس نے پیدا کیا	موت کو اور حیات کو	تاکہ وہ جانچے تم لوگوں کو (کہ)	تم لوگوں کا کون زیادہ اچھا ہے

عَمَلًا ؕ	وَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۙ﴿۲﴾	الَّذِیۡ خَلَقَ	سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ	طِبَاقًا ؕ
بلحاظ عمل کے	اور وہ ہی بالادست ہے بے انتہا بخشنے والا ہے	جس نے پیدا کیا	سات آسمانوں کو	تلے اوپر ہوتے ہوئے

مَا تَرٰی	فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ	مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ	فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ
تو نہیں دیکھے گا	رحمان کی تخلیق میں	کسی طرح بھی ہم آہنگ نہ ہونا	پس تو لوٹا بصارت کو

هَلۡ تَرٰی	مِنۡ فُطُوۡرٍ ﴿۳﴾	ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ	كَرَّتَیۡنِ	یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡكَ الۡبَصَرُ
کیا تو دیکھتا ہے	کچھ بھی شگاف	پھر تو لوٹا بصارت کو	دوبارہ	تو پلٹ آئے گی تیری طرف بصارت

خَاسِئًا	وَّهُوَ حَسِیۡرٌ ﴿۴﴾	وَلَقَدۡ زَیَّنَّا	السَّمَآءَ الدُّنۡیَا	بِمَصَابِیۡحَ
تھکی ماندی ہوتے ہوئے	اس حال میں کہ وہ ناکام ہوگی	اور بیشک ہم نے سجایا ہے	نزدیکی (دنیوی) آسمان کو	چراغوں سے

وَجَعَلۡنٰهَا	رُجُوۡمًا	لِّلشَّیٰطِیۡنِ	وَاَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ	عَذَابَ السَّعِیۡرِ ﴿۵﴾
اور ہم نے بنایا ان (چراغوں) کو	سنگسار کرنے کے ذرائع	شیطانوں کے لیے	اور ہم نے تیار کیا ان کے لیے	بھڑکتی آگ کا عذاب

نوٹ:1 حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ سورۃ عذاب کو روکنے والی اور عذاب سے نجات دلانے والی ہے۔ یہ اپنے پڑھنے والے کو عذاب قبر سے بچائے گی۔ (معارف القرآن) 1892

نوٹ:2 آیت۔2 میں ہے کہ اس نے پیدا کیا موت اور حیات کو۔ حیات کے لیے پیدا کرنے کا لفظ تو اپنی جگہ ظاہر ہے، کہ حیات ایک وجودی چیز ہے۔ لیکن موت جو بظاہر ایک عدم کا نام ہے، اس کے ساتھ تخلیق کا تعلق کس طرح ہوا۔ اس کے جواب میں ائمہ تفسیر سے متعدد اقوال منقول ہیں۔ سب سے زیادہ واضح بات یہ ہے کہ موت عدم محض کا نام نہیں ہے بلکہ روح اور بدن کا تعلق منقطع کر کے روح کو ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل کرنے کا نام ہے اور یہ ایک وجودی چیز ہے۔ غرض جس طرح حیات ایک حال (یعنی حالت) ہے جو جسم انسانی پر طاری ہوتا ہے، اسی طرح موت بھی ایک ایسا ہی حال ہے۔ (معارف القرآن)

اس دنیا میں انسانوں کے مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ اس نے اس لیے شروع کیا ہے کہ ان کا امتحان لے کہ کس انسان کا عمل زیادہ بہتر ہے۔ اس مختصر سے فقرے میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ موت اور حیات اسی کی طرف سے ہے، کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے والا ہے نہ موت دینے والا۔ دوسرے یہ کہ انسان جیسی مخلوق، جسے نیکی اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی ہے، اس کی نہ زندگی بے مقصد ہے نہ موت۔ خالق نے اسے یہاں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ زندگی اس کے لیے امتحان کی مہلت ہے اور موت کے معنی یہ ہیں کہ اس کے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ اسی امتحان کی غرض سے خالق نے ہر ایک کو عمل کا موقع دیا ہے تا کہ وہ دنیا میں کام کر کے اپنی اچھائی یا برائی کا اظہار کر سکے۔ چوتھے یہ کہ خالق ہی اس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا بُرا۔ اعمال کی اچھائی اور برائی کا معیار تجویز کرنا امتحان دینے والوں کا کام نہیں ہے بلکہ امتحان لینے والے کا کام ہے۔ اس لیے جو بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہے اسے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ امتحان لینے والے کے نزدیک حسنِ عمل کیا ہے۔ پانچواں نکتہ خود امتحان کے مفہوم میں پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ جس کا جیسا عمل ہوگا اسی کے مطابق اس کو جزا دی جائے گی۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:3 (آیت 5۔7) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہی تارے شیطانوں پر پھینک مارے جاتے ہیں اور یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ شہاب ثاقب صرف شیطانوں کو مارنے ہی کے لیے گراتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تاروں سے جو بے حد و حساب شہابِ ثاقب نکل کر کائنات میں انتہائی تیز رفتاری سے گھومتے رہتے ہیں اور جن کی بارش زمین پر بھی ہر وقت ہوتی رہتی ہے، وہ اس امر میں مانع ہے کہ زمین کے شیاطین عالم بالا میں جا سکیں۔ اگر وہ اوپر جانے کی کوشش کریں بھی تو یہ شہابِ ثاقب انہیں مار بھگاتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ ان شہابیوں کی حقیقت کیا ہے، تو اس بارے میں انسان کی معلومات اس وقت تک کسی قطعی تحقیق سے قاصر ہیں۔ تاہم جس قدر بھی حقائق اور واقعات اب تک انسان کے علم میں آئے ہیں اور زمین پر گرے ہوئے شہابیوں کے معائنے سے جو معلومات حاصل کی گئی ہیں ان کے بناء پر سائنس دانوں میں سب سے زیادہ مقبول نظریہ یہی ہے کہ یہ شہابیے کسی سیارے کے انفجار کی بدولت نکل کر خلا میں گھومتے رہتے ہیں اور پھر کسی وقت زمین کی کشش کے دائرے میں آ کر ادھر کا رخ کر لیتے ہیں۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (6تا14)

ترکیب (آیت۔7۔8) اِذَا اور کُلَّمَا حرف شرط ہیں۔ اس لیے افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔ تَمَیَّزُ کی پہچان یہ ہے کہ نہ تو یہ تَمَیَّزَ (باب تفعل کا ماضی) ہے اور نہ ہی یہ تُمَیِّزُ (باب تفعیل کا مضارع) ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ باب تفعّل کا مضارع تَتَمَیَّزُ ہے جس کی ایک تا گری ہوئی ہے۔ خَازِنٌ کی جمع خَزَنَةٌ ہے۔ یہاں یہ سَئَلَ کا فاعل اسم ظاہر ہے اس لیے فاعل جمع ہونے کے باوجود فعل سَئَلَ واحد آیا ہے (آیت۔9) قَالُوْا سے پہلے کوئی حرف شرط نہیں ہے لیکن پھر بھی فعل ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا کیونکہ یہ قیامت کا بیان ہے۔ (دیکھیں آیت۔2۔27، نوٹ 3)۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ میں اِنْ کی بعد اِلَّا آ رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اِنْ نافیہ

ہے۔(آیت۔10)اس آیت کے مختلف ترجمے ممکن ہیں۔لَوْ کو شرطیہ(اگر)مان کر بھی ترجمہ ہوسکتا ہے اور اسے تمنی(کاش)مان کر بھی ترجمہ ہوسکتا ہے۔دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔اسی طرح کُنَّا نَسْمَعُ کو ماضی استمراری بھی مانا جاسکتا ہے اور کُنَّا کو نَسْمَعُ ناقص مان لیں تو اس میں شامل نَحْنُ کی ضمیر اس کا اسم اور نَسْمَعُ اس کی خبر ہوگی۔دونوں ترجمے درست ہوں گے۔(آیت۔11)سُحْقًا کسی فعل محذوف کا مفعول ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔(آیت۔14)اس کے بھی دو ترجمے ممکن ہیں،ایک یہ کہ اَلَا کو حرف تنبیہ(خبردار۔سن لو)مان کر ترجمہ کیا جائے۔دوسرے یہ کہ ہمزہ کو استفہامیہ(کیا)مان کر اور لَا یَعْلَمُ کو فعل نفی مان کر ترجمہ کیا جائے۔دونوں ترجمے درست ہوں گے۔

ترجمہ

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا	بِرَبِّهِمْ	عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ	وَبِئْسَ	الْمَصِيْرُ ۝۶
اوران کے لیے جنہوں نے انکار کیا	اپنے رب کا	جہنم کا عذاب ہے	اور بہت بری ہے(وہ)	لوٹنے کی جگہ

اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا	سَمِعُوْا لَهَا	شَهِيْقًا	وَّهِيَ تَفُوْرُ ۝۷	تَكَادُ تَمَيَّزُ
جب وہ ڈالے جائیں گے اس میں	تو وہ سنیں گے اس میں	رینکنے والی آواز	اس حال میں کہ وہ ابلتی ہوگی	قریب ہے کہ وہ پھٹ پڑے گی

مِنَ الْغَيْظِ ؕ	كُلَّمَآ	اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ	سَاَلَهُمْ	خَزَنَتُهَآ	اَلَمْ يَاْتِكُمْ
شدید غصہ سے	جب کبھی بھی	ڈالا جائے گا اس میں کسی گروہ کو	تو پوچھیں گے ان سے	اس(جہنم)کے داروغہ لوگ	کیا نہیں پہنچا تمہارے پاس

نَذِيْرٌ ۝۸	قَالُوْا بَلٰى	قَدْ جَآءَنَا	نَذِيْرٌ ۙ	فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا
کوئی خبردار کرنے والا	وہ لوگ کہیں گے کیوں نہیں	آچکا تھا ہمارے پاس	ایک خبردار کرنے والا	تو ہم نے جھٹلایا اور ہم نے کہا

مَا نَزَّلَ اللّٰهُ	مِنْ شَيْءٍ ۚ	اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا	فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝۹
نہیں اتاری اللہ نے	کوئی بھی چیز	نہیں ہو تم(خبردار کرنے والے)لوگ مگر	ایک بڑی گمراہی میں

وَقَالُوْا	لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ	اَوْ نَعْقِلُ	مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۰
اور وہ(جہنمی)لوگ کہیں گے	کاش ہم سنا کرتے	یا عقل استعمال کیا کرتے	تو ہم نہ ہوتے آگ والوں میں

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ	فَسُحْقًا	لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۱	اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ
پھر وہ لوگ اعتراف کریں گے اپنے گناہ کا	(تو ثابت ہوگی)دوری(رحمت سے)	آگ والوں کے لیے	بیشک جو لوگ مرعوب رہتے ہیں اپنے رب سے

بِالْغَيْبِ	لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ	وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۲	وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ	اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ	اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ
اَن دیکھے میں	ان کے لیے مغفرت ہے	اور بڑا اجر ہے	اور تم لوگ چھپاؤ اپنی بات کو	یا نمایاں کرو اس کو	بیشک وہ(تو)جاننے والا ہے

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾	اَ	لَا يَعْلَمُ	مَنْ خَلَقَ ؕ	وَهُوَ اللَّطِيْفُ	الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾ ع
سینوں والی (بات) کو (بھی)	کیا	نہیں جانے گا	وہ جس نے پیدا کیا	درآنحالیکہ وہی باریک بین ہے	باخبر ہے

6892

نوٹ: 1

آیت۔7 میں شَهِيْقٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو گدھے کی سی آواز کے لیے بولا جاتا ہے۔اس فقرے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ خود جہنم کی آواز ہوگی، اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ آواز جہنم سے آ رہی ہوگی جہاں ان سے پہلے گرے ہوتے لوگ چیخیں مار رہے ہوں گے۔اس دوسرے مفہوم کی تائید سورۃ ہودؑ کی آیت۔106 سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں یہ دوزخی لوگ ہانپیں گے اور پھنکاریں گے اور پہلے مفہوم کی تائید سورۂ فرقان کی آیت۔12۔سے ہوتی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ دوزخ میں جاتے ہوئے یہ لوگ دور ہی سے اس کے غضب اور جوش کی آوازیں سنیں گے۔اس بنا پر صحیح یہ ہے کہ شور خود جہنم کا بھی ہوگا اور جہنمیوں کا بھی۔(تفہیم القرآن)

آیت نمبر (15 تا 22)

ترکیب

(آیت۔15) رِزْقِهٖ کی ضمیر هُوَ الَّذِیْ کے لیے ہے۔اگر اَلْاَرْضَ کے لیے ہوتی تو رِزْقَهَا آتا۔(آیت۔17۔18) نَذِيْرِ اور نَكِيْرِ کی ر پر کسرہ بتا رہی ہے کہ ان کے آگے یائے متکلم محذوف ہیں اور یہ دراصل نَذِيْرِیْ اور نَكِيْرِیْ ہیں (آیت۔20) اَمَّنْ دراصل اَمْ مَنْ ہے جس کو ملا کر لکھا گیا ہے۔(آیت۔21) اَمْسَكَ میں شامل هُوَ کی ضمیر کو اگر قریبی مرجع هٰذَا الَّذِیْ کے لیے مانیں تو جملہ بے معنی ہو جاتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضمیر اَلرَّحْمٰن کے لیے ہے۔(آیت۔22) يَمْشِیْ فعل لازم ہے۔اس لیے مُكِبًّا اور سَوِيًّا اس کے مفعول نہیں ہو سکتے بلکہ یہ حال ہیں۔

ترجمہ

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ	ذَلُوْلًا	فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا
وہ، وہ ہے جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو	رام (تابعدار) کی ہوئی	پس تم لوگ چلو اس کے کندھوں (راستوں) میں

وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ	وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾	ءَاَمِنْتُمْ	مَّنْ فِی السَّمَآءِ
اور کھاؤ اس (اللہ) کے رزق میں سے	اور اس ہی کی طرف دوبارہ اٹھنا ہے	کیا تم لوگ امن میں (نڈر) ہو گئے	اُس سے جو آسمان میں ہے

اَنْ يَّخْسِفَ	بِكُمُ الْاَرْضَ	فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾ لا	اَمْ اَمِنْتُمْ
(اس سے) کہ وہ دھنسا دے	تمہارے ساتھ زمین کو	پھر جب ہی وہ کپکپاتی ہو	یا تم لوگ امن میں ہو گئے

مَّنْ فِی السَّمَآءِ	اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ	حَاصِبًا ؕ	فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ	نَذِيْرِ ﴿۱۷﴾
اُس سے جو آسمان میں ہے	کہ وہ بھیج دے تم لوگوں پر	کنکریاں مارنے والی تند ہوا	پھر تم جان لو گے (کہ) کیسا تھا	میرا خبردار کرنے والا

وَلَقَدْ كَذَّبَ	الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	فَكَيْفَ كَانَ	نَكِيْرِ ﴿۱۸﴾
اور بیشک جھٹلا چکے ہیں	وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے	تو (دیکھو کہ) کیسا تھا	میرا عدم عرفان

اَوَلَمْ يَرَوْا	اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ	صٰٓفّٰتٍ	وَّيَقْبِضْنَ ۛ	مَا يُمْسِكُهُنَّ
اور کیا انہوں نے غور ہی نہیں کیا	پرندوں کی طرف اپنے اوپر	صف بچھانے (پھیلانے) والے ہوتے ہوئے	اور سمیٹتے ہوئے	نہیں تھامتا ان کو (کوئی)

اِلَّا الرَّحۡمٰنُ ؕ	اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیۡءٍۭ	بَصِیۡرٌ ﴿۱۹﴾	اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ	هُوَ جُنۡدٌ لَّكُمۡ
سوائے رحمٰن کے	بیشک وہ ہر چیز کو	دیکھنے والا ہے	یا کون یہ ہے جو (کہ)	وہ ہو ایسا لشکر تمہارے لیے

یَنۡصُرُكُمۡ	مِّنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ ؕ	اِنِ الۡكٰفِرُوۡنَ	اِلَّا فِیۡ غُرُوۡرٍ ﴿۲۰﴾
جو مدد کرے تمہاری	رحمٰن کے بجائے	نہیں ہیں کافر لوگ	مگر کچھ فریبوں میں (مبتلا)

اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ	یَرۡزُقُكُمۡ	اِنۡ اَمۡسَكَ رِزۡقَهٗ ۚ	بَلۡ لَّجُّوۡا	فِیۡ عُتُوٍّ
یا کون یہ ہے جو	روزی دے تم کو	اگر وہ (رحمٰن) روک لے اپنا رزق	بلکہ وہ لوگ اڑے رہے	سرکشی کرنے میں

وَّنُفُوۡرٍ ﴿۲۱﴾	اَفَمَنۡ یَّمۡشِیۡ	مُكِبًّا	عَلٰی وَجۡهِهٖۤ
اور بیزاریوں میں	تو کیا وہ جو چلتا ہے	اوندھا کرنے والا ہوتے ہوئے (خود کو)	اپنے چہرے کے بل

اَهۡدٰۤی	اَمَّنۡ یَّمۡشِیۡ	سَوِیًّا	عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۲۲﴾
زیادہ ہدایت پر ہے	یا وہ چلتا ہے	کامل (سیدھا) ہوتے ہوئے	ایک سیدھے راستے پر

نوٹ:1

فرمایا کہ زمین کو تمہارے لیے ہم نے ایسا مطیع بنا دیا کہ تم اس کے مونڈھوں (کندھوں) پر چڑھتے پھرو۔ مطلب یہ ہے کہ زمین کو حق تعالیٰ نے ایک ایسا قوام (مادہ) بخشا ہے کہ نہ تو پانی کی طرح بہنے والا ہے، نہ روئی اور کیچڑ کی طرح دبنے والا، کیونکہ زمین ایسی ہوتی تو اس پر کسی انسان کا ٹھہرنا ناممکن ہوتا۔ اسی طرح زمین کو لوہے یا پتھر کی طرح سخت بھی نہیں بنایا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس میں درخت اور کھیتی نہ بوئی جاسکتی، کنویں اور نہریں نہ کھودی جاسکتیں اور اس کو کھود کر اونچی عمارتوں کی بنیاد نہ رکھی جاسکتی۔ اس قوام (نرم مادے) کے ساتھ اس کو ایسا سکون بخشا کہ اس پر عمارتیں ٹھہر سکیں اور چلنے پھرنے والوں کو لغزش نہ ہو۔ (معارف القرآن)

نوٹ:2

مَنۡ فِی السَّمَآءِ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں رہتا ہے بلکہ یہ بات اس لحاظ سے فرمائی گئی ہے کہ انسان فطری طور پر جب خدا سے رجوع کرنا چاہتا ہے تو آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ دعا مانگتا ہے تو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتابوں کو کتب سماوی کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات کچھ انسان کی فطرت ہی میں ہے کہ وہ جب خدا کا تصور کرتا ہے تو اس کا ذہن آسمان کی طرف جاتا ہے۔ اسی بات کو ملحوظ رکھ کے اللہ تعالیٰ کے متعلق یہاں مَنۡ فِی السَّمَآءِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس میں اس شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کو آسمان میں مقیم قرار دیتا ہے۔ یہ شبہ آخر کیسے پیدا ہوسکتا ہے جب کہ اسی سورۂ ملک کے آغاز میں فرمایا جاچکا ہے کہ جس نے تہہ بہ تہہ سات آسمان پیدا کیے اور سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ (پس تم جدھر بھی رخ کرو اُس طرف اللہ کا رخ ہے) (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

آیت۔22۔ میں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ ان لوگوں پر ہدایت کی راہ کیوں نہیں کھل رہی ہے اور سمجھانے کے باوجود یہ گمراہی میں بھٹک رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنی خواہشوں کے غلام ہیں۔ جس طرح کتا زمین کو سونگتا ہوا چلتا ہے کہ شائد کوئی چیز کھانے کی مل جائے۔ اسی طرح ان لوگوں کی رہنما بھی عقل کے بجائے ان کی خواہش ہے اور یہ سر جھکائے، آنکھیں بند کیے اپنی خواہش کے پیچھے چل رہے ہیں۔ خواہش کے پیچھے چلنے والا کبھی ہدایت کی راہ نہیں پاسکتا۔ ہدایت کی راہ اس کو ملتی ہے جو سیدھی راہ پر سر اٹھا کر دہنے بائیں اور آگے پیچھے کا جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے انسان کو مستوی القامت پیدا کیا، جانوروں کی طرح زمین کی طرف جھکا ہوا نہیں پیدا کیا۔ لیکن بہت سے انسان جانوروں ہی کی روش کی تقلید کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اس اعلیٰ خصوصیت کو کھو بیٹھتے ہیں جو انسان کا اصلی شرف ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ

رہے کہ خواہش کے پیچھے چلنے والوں کی مثال قرآن میں جگہ جگہ جانوروں سے دی گئی ہے۔ (تدبر قرآن) 6892

آیت نمبر (23 تا 30)

ترجمہ

قُلْ	هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ	وَجَعَلَ لَكُمُ	السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ
آپؐ کہیے	وہ، وہ ہے جس نے اٹھایا تم لوگوں کو	اور بنائے تمہارے لیے	سماعت اور بصارتیں اور دل
قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾	قُلْ هُوَ الَّذِيْ	ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ	وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾
بہت تھوڑا تم لوگ شکر کرتے ہو	آپؐ کہیے وہ، وہ ہے جس نے	بکھیرا تم لوگوں کو زمین میں	اور اس کی طرف ہی تم لوگ اکٹھا کیے جاؤ گے
وَيَقُوْلُوْنَ	مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ	اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾	قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ
اور یہ لوگ کہتے ہیں	کب ہے یہ وعدہ	اگر تم لوگ سچے ہو	آپؐ کہیے اور علم تو بس
عِنْدَ اللّٰهِ ۖ	وَاِنَّمَآ اَنَا	نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۶﴾	
اللہ کے پاس ہے	اور میں تو صرف	ایک کھلا کھلا خبردار کرنے والا ہوں	
فَلَمَّا رَاَوْهُ	زُلْفَةً	سِيْٓـَٔتْ	
پھر جب وہ دیکھیں گے اُس (وعدہ) کو	قریب میں	تو بگاڑے جائیں گے	
وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ	كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿۲۷﴾	قُلْ اَرَءَيْتُمْ
ان لوگوں کے چہرے جنہوں نے کفر کیا	اور کہا جائے گا یہ ہے وہ	تم لوگ جس کو مانگا کرتے تھے	آپؐ کہیے کیا تم لوگوں نے غور کیا
اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ	وَمَنْ مَّعِيَ	اَوْ رَحِمَنَا ۙ	فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ
اگر ہلاک کر دے مجھ کو اللہ	اور ان کو (بھی) جو میرے ساتھ ہیں	یا رحم کرے ہم پر	تو کون بچائے گا کافروں کو
مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾	قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ	اٰمَنَّا بِهٖ	وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ
ایک دردناک عذاب سے	آپؐ کہیے وہی رحمٰن ہے	ہم ایمان لائے جس پر	اور اس پر ہی ہم نے بھروسہ کیا
فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ	فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۹﴾	قُلْ اَرَءَيْتُمْ	
پس تم لوگ جان لوگے کون وہ ہے جو	ایک کھلی گمراہی میں ہے	آپؐ کہیے کیا تم لوگوں نے غور کیا	
اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ	غَوْرًا	فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ	بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿۳۰﴾ ع
اگر ہو جائے تمہارا پانی	زمین میں جذب	تو کون لائے گا تمہارے پاس	کچھ رواں پانی

نوٹ:1

آیت۔23۔میں اعضاء انسانی میں اُن تین اعضاء کا ذکر ہے جن پر علم وادراک اور شعور موقوف ہے۔فلاسفہ نے علم وادراک کے پانچ ذریعے بیان کیے ہیں جن کو حواس خمسہ کہا جاتا ہے۔ان پانچ چیزوں میں سے صرف دو کا ذکر کیا ہے یعنی کان اور آنکھ۔وجہ یہ ہے کہ سونگھنے، چکھنے اور چھونے سے بہت کم چیزوں کا علم انسان کو حاصل ہوتا ہے۔اس کی معلومات کا بڑا مدار سننے اور دیکھنے پر ہے۔اور ان میں بھی سننے کو مقدم کیا گیا ہے۔غور کرو تو معلوم ہوگا کہ انسان کو اپنی عمر میں جتنی معلومات ہوتی ہیں ان میں سنی ہوئی چیزیں بہ نسبت دیکھی ہوئی چیزوں کے بدرجہا زائد ہوتی ہیں۔بیشتر معلومات انسانی انہیں دو راہوں سے حاصل ہوتی ہیں اور تیسری چیز قلب پر موقوف ہے۔جبکہ فلاسفہ (یعنی فلسفی لوگ) دماغ کو اس کا مرکز مانتے ہیں۔(معارف القرآن)۔

حواس خمسہ سے حاصل شدہ معلومات کے ضمن میں دماغ یعنی عقل اور دل، دونوں کا اپنا اپنا ایک رول ہے جس کی وضاحت آیت۔7/179، نوٹ۔2 میں کی جا چکی ہے۔اسے دوبارہ دیکھ لیں۔(مرتب)

نوٹ:2

آیت۔24۔میں اس حقیقت کی یاددہانی کردی ہے کہ ایک کسان اپنے کھیت میں کوئی فصل بوتا ہے، اس کو کھاد اور پانی دیتا ہے، چرند و پرند سے اس کی حفاظت کرتا ہے تو ہر دیکھنے والا بن بتائے یہ جانتا ہے کہ ایک دن وہ اس کو کاٹے گا اور اس کے دانے اور بھس کو الگ الگ کرے گا۔آخر یہ واضح حقیقت خدا کے متعلق تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔اگر تم عقل سے کام لو (آیت۔23 کے حوالے سے) تو یہ واضح حقیقت نہایت آسانی سے سمجھ میں آجانی چاہیے کہ جس خدا نے تم کو زمین میں بویا (پھیلایا) ہے اور تمہاری پرورش کر رہا ہے وہ تم کو یونہی نہیں چھوڑ رکھے گا، بلکہ وہ اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹ کر اپنے کھلیان میں جمع کرے گا۔پھر اس کے دانے کو بھس سے الگ کرے گا اور اس کو کھتے میں جمع کر کے بھس کو جلادے گا۔یہ امر واضح رہے کہ قرآن نے یہاں جو حقیقت نہایت سادہ لفظوں میں بیان کردی ہے، قدیم صحیفوں خصوصاً انجیل میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔(تدبر قرآن)

نوٹ:3

آخر سورۃ میں (آیت۔30) پھر ایک جملہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ زمین پر بسنے والو اور اس کو کھود کر کنویں بنانے والو اور اس کے پانی سے اپنے پینے پلانے اور نباتات اگانے کا کام لینے والو، اس بات کو مت بھولو کہ یہ سب چیزیں کوئی تمہاری ذاتی جاگیر نہیں ہیں، بلکہ صرف حق تعالیٰ کا عطیہ ہیں۔پانی اس نے برسایا، پانی کو برف کی شکل میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر اس نے لاد دیا، پھر برف کو آہستہ آہستہ پگھلا کر پہاڑوں کے عروق کے ذریعہ زمین کے اندر اس نے اتارا اور بغیر کسی پائپ لائن کے پوری زمین میں اس کا ایسا جال پھیلا دیا کہ جہاں چاہو زمین کھود کر پانی نکال لو۔مگر یہ پانی اس نے زمین کی اوپری سطح پر رکھا ہے جس کو چند فٹ یا چند گز زمین کھود کر نکالا جاسکتا ہے۔یہ مالک و خالق کا عطیہ ہے اگر وہ چاہے تو اس پانی کو زمین کی نیچے کی سطح پر اتار دے جہاں تک تمہاری رسائی ممکن نہ ہو۔تو تمہاری کون سی طاقت ہے جو اس جاری پانی کو حاصل کر سکے۔حدیث میں ہے کہ جب آدمی اس آیت کی تلاوت کرے تو اس کو کہنا چاہیے اَللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْن۔یعنی اللہ ہی پھر اس کو لاسکتا ہے، ہماری کسی کی طاقت نہیں۔(معارف القرآن)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

1892

سورۃ القلم (68)

آیت نمبر (1 تا 16)

ترجمہ

نٓ	وَالۡقَلَمِ	وَمَا یَسۡطُرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾	مَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ	بِمَجۡنُوۡنٍ ۚ﴿۲﴾
۔	قسم ہے قلم کی	اور اس کی جو وہ لکھتے ہیں	نہیں ہیں آپؐ اپنے رب کی نعمت کے سبب سے	کوئی مجنون

وَاِنَّ لَکَ	لَاَجۡرًا	غَیۡرَ مَمۡنُوۡنٍ ۚ﴿۳﴾	وَاِنَّکَ	لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ﴿۴﴾
اور بیشک آپؐ کے لیے	یقیناً ایک ایسا اجر ہے جو	منقطع ہونے والا نہیں ہے	اور بیشک آپؐ	یقیناً عظیم اخلاقیات پر ہیں

فَسَتُبۡصِرُ	وَیُبۡصِرُوۡنَ ۙ﴿۵﴾	بِاَیِّیۡکُمُ	الۡمَفۡتُوۡنُ ﴿۶﴾	اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ
پس آپؐ دیکھیں گے	اور یہ لوگ (بھی) دیکھ لیں گے	تمہارے کس کے ساتھ	مبتلاء فتنہ (شخص) ہے	بیشک آپ کا رب ہی خوب جاننے والا ہے

بِمَنۡ ضَلَّ	عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ۪	وَہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ ﴿۷﴾	فَلَا تُطِعِ الۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۸﴾
اس کو جو بھٹک گیا	اس کے راستے سے	اور وہ ہی خوب جاننے والا ہے ہدایت پانے والوں کو	تو آپؐ کہنا مت مانیں جھٹلانے والوں کا

وَدُّوۡا	لَوۡ تُدۡہِنُ	فَیُدۡہِنُوۡنَ ﴿۹﴾	وَلَا تُطِعۡ	کُلَّ حَلَّافٍ
ان لوگوں نے خواہش کی	کاش آپؐ ڈھیلے پڑیں	تو وہ لوگ بھی ڈھیلے پڑیں گے	تو آپؐ کہنا مت مانیں	کسی بھی بہت قسم کھانے والے کا

مَّہِیۡنٍ ۙ﴿۱۰﴾	ہَمَّازٍ	مَّشَّآءٍۭ	بِنَمِیۡمٍ ۙ﴿۱۱﴾	مَّنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ
کسی بے وقعت کا	کسی کثرت سے طعنہ دینے والے کا	بہت چغلی کھانے والا	چغلی کے ساتھ	بہت منع کرنے والا کسی بھی بھلائی سے

مُعۡتَدٍ	اَثِیۡمٍ ۙ﴿۱۲﴾	عُتُلٍّۭ	بَعۡدَ ذٰلِکَ	زَنِیۡمٍ ۙ﴿۱۳﴾	اَنۡ کَانَ
زیادتی کرنے والا	پکا گنہگار	بدمزاج	اس کے بعد (ساتھ)	بدذات بھی	(اس لیے) کہ وہ ہوا

ذَا مَالٍ وَّ بَنِیۡنَ ؕ﴿۱۴﴾	اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِ	اٰیٰتُنَا	قَالَ
مال اور بیٹوں والا	جب بھی پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اس کو	ہماری آیتیں	تو وہ کہتا ہے

اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۵﴾	سَنَسِمُہٗ	عَلَی الۡخُرۡطُوۡمِ ﴿۱۶﴾
پہلے لوگوں کی داستانیں ہیں	ہم داغ دیں گے اس کو	سونڈ (ناک) پر

نوٹ: 1 رسول کریمؐ کے وجود میں حق تعالیٰ نے تمام ہی اخلاق فاضلہ بدرجہ کمال جمع فرما دیئے تھے۔ خود آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مجھے اس کام کے لیے بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال رسول اللہؐ کی خدمت کی اس پوری مدت میں جو کام میں نے کیا، آپؐ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں کیا اور جو کام نہیں کیا اس پر کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں نہیں کیا۔ بی بی عائشہؓ فرماتی ہیں کہ

رسول اللہؐ نے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا بجز جہاد فی سبیل اللہ کے۔ آپؐ نے نہ کسی خادم کو، نہ کسی عورت کو کبھی مارا۔ ان میں سے کسی سے خطا ولغزش بھی ہوئی تو اس کا انتقام نہیں لیا بجز اس کے کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہو تو شرعی سزا جاری فرمائی۔ آپؐ نہ فحش گو تھے نہ فحش کے پاس جاتے تھے، نہ بازار میں شور وشغب کرتے تھے۔ برائی کا بدلہ کبھی برائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ معافی اور درگزر کا معاملہ فرماتے تھے۔ اور حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میزانِ عمل میں خلق حسن کے برابر کسی عمل کا وزن نہیں ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ گالی گلوچ کرنے والے بدزبان سے بغض رکھتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ مسلمان اپنے حسن خلق کی بدولت اس شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو ہمیشہ رات کو عبادت میں جاگتا اور دن بھر روزہ رکھتا ہو۔ اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ مجھے یمن کا عامل۔ (گورنر) مقرر کر کے بھیجنے کے وقت آخری وصیت جو آپؐ نے مجھے اس وقت فرمائی جبکہ میں اپنا ایک پاؤں رکاب میں رکھ چکا تھا، وہ یہ تھی کہ اے معاذؓ لوگوں سے حسن خلق کا برتاؤ کرنا۔ (معارف القرآن)

نوٹ: 1

آیت۔10۔ کو سابقہ آیت فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ پر عطف کر کے تاکید کے ساتھ پھر تنبیہ فرمائی کہ تم ہرلپاٹیے ذلیل کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ اشارہ کسی خاص شخص کی طرف نہیں ہے بلکہ قریش کی پوری قیادت کی اخلاقی پستی کی تصویر آگے کی چند آیتوں میں کھینچ دی گئی ہے اور مقصود یہ دکھانا ہے کہ ایک طرف پیغمبر کا بے مثال خلقِ عظیم ہے اور دوسری طرف قریش کے لیڈروں کا یہ کردار ہے جو بینا ہو رہا ہے۔ ان دونوں کے سامنے رکھ کر ہر منصف مزاج فیصلہ کر سکتا ہے کہ کون کس انجام سے دوچار ہونے والا ہے۔

یہ بات کہ یہاں کسی خاص شخص کا نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت کا کردار بیان ہو رہا ہے، مختلف پہلوؤں سے واضح ہے۔ (۱) اس کا عطف اَلْمُكَذِّبِيْنَ پر ہے اور مُكَذِّبِيْنَ سے مراد ظاہر ہے کہ کوئی متعین شخص نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت ہے۔ (۲) لفظ كُلَّ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں کسی متعین شخص کا کردار زیر بحث نہیں ہے بلکہ جماعت کا کردار ہے۔ (۳) یہاں جو کردار بیان ہوا ہے وہ قریش کی پوری قیادت پر تو ٹھیک ٹھیک منطبق ہو جاتا ہے لیکن ہر بات اگر کسی ایک شخص پر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے تو تکلف کرنا پڑے گا۔ (تدبر قرآن)

آیت نمبر (17 تا 33)

ص ر م

(ض) صَرْمًا (۱) کسی چیز کا ٹوٹنا (لازماً) کسی چیز کو کاٹنا (متعدی)۔ زیر مطالعہ آیت۔17۔

صَارِمٌ اسم الفاعل ہے۔ کاٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔22۔

صَرِيْمٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے اسم المفعول کے معنی میں۔ کاٹا ہوا۔ پھر اس فصل کے لیے بھی آتا ہے جو کاٹ لی گئی ہو اور اس زمین کے لیے بھی جس کی فصل کاٹ لی گئی ہو۔ زیر مطالعہ آیت۔20۔

ح ر د

(ض) حَرْدًا (۱) منع کرنا۔ (۲) ارادہ کرنا۔

حَرْدٌ اسم ذات بھی ہے۔ ارادہ۔ زیر مطالعہ آیت۔25۔

ترکیب

(آیت۔17) بَلَوْنٰهُمْ میں هُمْ کی ضمیر اہل مکہ کے لیے ہے۔ اَقْسَمُوْا میں شامل هُمْ کی ضمیر فاعلی اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ کے لیے ہے۔(آیت۔24) یہاں پر لَا يَدْخُلَنَّ کے دو امکانات ہیں۔ایک یہ کہ اس کو مضارع منفی مانا جائے جس پر نون ثقیلہ داخل ہوا ہے۔ایسی صورت میں ترجمہ ہوگا ''ہرگز داخل نہیں ہوگا۔'' دوسرا یہ کہ اس کو لائے نہی غائب لَا يَدْخُلْ مانا جائے جس پر نون ثقیلہ داخل ہوا ہے۔اس کا ترجمہ ہوگا ''چاہے کہ ہرگز داخل نہ ہو۔'' سیاق وسباق کے لحاظ سے دوسرے امکان کو ترجیح دینا بہتر ہے۔

ترجمہ

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ	كَمَا بَلَوْنَآ	اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ	اِذْ اَقْسَمُوْا
بیشک ہم نے آزمائش میں ڈالا ان کو	جیسے ہم نے آزمایا	باغ والوں کو	جب انہوں نے قسم کھائی

لَيَصْرِمُنَّهَا	مُصْبِحِيْنَ ۙ﴿۱۷﴾	وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾	فَطَافَ عَلَيْهَا
ہم لازماً کاٹیں گے اس (باغ کی فصل) کو	صبح کرنے والے ہوتے ہوئے	اور انہوں نے استثناء (ان شاء اللہ) نہیں کہا	تو گھوم گیا اس (باغ) پر

طَآئِفٌ	مِّنْ رَّبِّكَ	وَ	هُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾	فَاَصْبَحَتْ	كَالصَّرِيْمِ ۙ﴿۲۰﴾
ایک گھومنے والا (بگولہ)	آپؐ کے رب (کی طرف) سے	اس حال میں کہ	وہ لوگ نیند کرنے والے تھے	نتیجۃً وہ (باغ) صبح کو ہو گیا	کاٹے ہوئے کھیت کی مانند

فَتَنَادَوْا	مُصْبِحِيْنَ ۙ﴿۲۱﴾	اَنِ اغْدُوْا	عَلٰى حَرْثِكُمْ	اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾
تو انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا	صبح سویرے	کہ تم لوگ سویرے پہنچو	اپنی کھیتی پر	اگر تم لوگ ہو کاٹنے والے

فَانْطَلَقُوْا	وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۙ﴿۲۳﴾	اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا	الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ
تو وہ لوگ چلے	اور وہ لوگ باہم سرگوشی کرتے تھے	کہ چاہیے کہ ہرگز داخل نہ ہو اس (باغ) میں	آج تم پر

مِّسْكِيْنٌ ۙ﴿۲۴﴾	وَّغَدَوْا	عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾	فَلَمَّا رَاَوْهَا	قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۙ﴿۲۶﴾
کوئی مسکین	اور وہ سویرے نکلے	ایک ارادہ پر قادر ہوتے ہوئے	پھر جب انہوں نے دیکھا اس (باغ) کو	تو کہا بیشک ہم یقیناً راستہ بھولنے والے ہیں

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾	قَالَ اَوْسَطُهُمْ	اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ	لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾
(نہیں) بلکہ ہم محروم کیے گئے ہیں	کہا ان کے زیادہ افضل نے	کیا میں نے نہیں کہا تھا تم لوگوں سے	کہ تسبیح کیوں نہیں کرتے (اللہ کی)

قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ	اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾	فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ	يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾
انہوں نے کہا ہمارے رب کی پاکیزگی ہے	بیشک ہم تھے ظلم کرنے والے	تو سامنے ہوا ان کا کوئی کسی پر	باہم ملامت کرتے ہوئے

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ	اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾	عَسٰى رَبُّنَآ	اَنْ يُّبْدِلَنَا
انہوں نے کہا ہائے ہماری بربادی	ہم تھے حد سے بڑھنے والے	امید ہے ہمارے رب سے	کہ وہ بدلے میں دے ہم کو

خَيْرًا مِّنْهَآ	اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا	رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾	كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ
زیادہ بھلا اس (باغ) سے	بیشک ہم اپنے رب کی طرف	رغبت کرنے والے ہیں	ایسا ہوتا ہے (دنیوی) عذاب

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ	اَكْبَرُ ۘ	لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ ع
اور یقیناً آخرت کا عذاب (تو)	سب سے بڑا ہے	کاش یہ لوگ جانتے ہوتے

نوٹ: 1

بَلْ هُمْ میں ضمیر هُمْ کا مرجع ظاہر ہے کہ وہی لوگ ہوں گے جن کا کردار اوپر زیر بحث آیا ہے۔ یہ اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ وہ کردار کسی معین شخص کا نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت کا ہے، ورنہ جمع کی جگہ واحد ضمیر آتی۔ اسی طرح یہاں زبان کا ایک دوسرا نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ یہاں لفظ اَلْجَنَّةِ پر الف لام داخل ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص باغ والوں کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ تمثیلات میں لام تعریف یا اَلَّذِیْ اور اَلَّتِیْ وغیر جو آتے ہیں تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ کوئی معین ذات مدنظر ہے بلکہ اس سے مقصود صرف صورتِ حال کو مُشَخَّص و مَصَوَّر کرنا ہوتا ہے تاکہ قاری کے سامنے واقعہ کی پوری تفصیل آجائے۔ اس وجہ سے یہاں کسی خاص باغ کے مالکوں کی جستجو کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک خاکہ ہے جس میں قریش کے لیڈروں کے ذہن اور ان کے انجام کی تصویر اس طرح کھینچ دی گئی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ مخفی نہیں رہ گیا ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 2

لَا يَسْتَثْنُوْنَ کے معنی استثناء نہ کرنے کے ہیں اور مراد اس استثناء سے ان شاء اللہ کہنا ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے استثناء سے مراد یہ لیا ہے کہ ہم پورا پورا غلہ اور پھل لے آئیں گے اور فقراء کا حصہ مستثنیٰ نہیں کریں گے۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (34 تا 43)

ترکیب

قاعدہ یہ ہے کہ جملہ کے شروع میں اِنَّ (بیشک) آتا ہے۔ اور جملہ کے درمیان میں اَنَّ (کہ) آتا ہے۔ اس قاعدے کا ایک استثناء ہم آیت۔2/البقرۃ:25، نوٹ۔2۔ میں پڑھ چکے ہیں کہ قَالَ یا اس کے مشتقات سے شروع ہونے والے جملوں کے درمیان میں اِنَّ آتا ہے لیکن ایسی صورت میں اس کے معنیٰ ''کہ'' ہوتے ہیں۔ اس قاعدے کا دوسرا استثناء یہ ہے کہ اَنَّ کی خبر پر اگر لام تاکید آرہا ہو تو اس کی جگہ اِنَّ آتا ہے لیکن اس کے معنی اَنَّ (کہ) کے ہی ہوتے ہیں۔ اس حوالہ سے نوٹ کریں کہ آیت۔38۔39 میں لَمَا میں مَا پر لام تاکید آیا ہے اس لیے ان سے پہلے اِنَّ آیا ہے لیکن ان کے معنیٰ ''کہ'' ہی ہیں۔ تَخَيَّرُوْنَ اگر باب تفعیل سے ہوتا تو تُخَيِّرُوْنَ آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ باب تفعل سے تَتَخَيَّرُوْنَ ہے جس کی ایک تا گری ہوئی ہے۔ (آیت۔43) اَبْصَارُهُمْ جمع مکسر ہے اس لیے خَاشِعَةً مؤنث کا صیغہ آیا ہے اور یہ حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔

ترجمہ

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ	جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾	اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ
بیشک متقی لوگوں کے لیے ان کے رب کے پاس	دائمی نعمتوں کے باغات ہیں	تو کیا ہم بنائیں گے فرمانبرداروں کو

كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ ط	مَا لَكُمْ ۫	كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ ج	اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ
مجرموں کے جیسا	تمہیں کیا ہے	کیسا تم لوگ فیصلہ کرتے ہو	یا تمہارے لیے کوئی ایسی (آسمانی) کتاب ہے

فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ لا	اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ	لَمَا	تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾ ج
جس میں تم سبق پڑھتے ہو	کہ تمہارے لیے اس (کتاب) میں	ضرور وہ ہے جو	تم لوگ اپنے لیے پسند کرتے ہو

اَمۡ لَكُمۡ اَيۡمَانٌ عَلَيۡنَا	بَالِغَةٌ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۙ	اِنَّ لَكُمۡ	لَمَا	تَحۡكُمُوۡنَ ﴿۳۹﴾
یا تمہارے لیے ہم پر ایسی قسمیں ہیں جو	پہنچنے والی ہیں قیامت کے دن تک	کہ تمہارے لیے	ضرور وہ ہوگا جو	تم لوگ آڈر دو گے

سَلۡهُمۡ اَيُّهُمۡ	بِذٰلِكَ زَعِيۡمٌ ﴿۴۰﴾	اَمۡ لَهُمۡ شُرَكَآءُ	فَلۡيَاۡتُوۡا بِشُرَكَآئِهِمۡ
آپ پوچھیں ان سے کہ ان کا کون	اس کی ضمانت دینے والا ہے	یا ان کے لیے کچھ شریک ہیں	تو چاہیے کہ وہ آئیں اپنے شریکوں کے ساتھ

اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ﴿۴۱﴾	يَوۡمَ يُكۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ	وَّيُدۡعَوۡنَ اِلَى السُّجُوۡدِ
اگر وہ لوگ سچے ہیں	جس دن پردہ اٹھایا جائے گا پنڈلی سے	اور ان کو بلایا جائے گا سجدہ کرنے کی طرف

فَلَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ۙ﴿۴۲﴾	خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ	تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ ؕ
تو وہ استطاعت نہ رکھتے ہوں گے	جھکی پڑیں گی ان کی نظریں	چھا جائے گی ان پر ذلت

وَقَدۡ كَانُوۡا يُدۡعَوۡنَ	اِلَى السُّجُوۡدِ	وَهُمۡ سٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾
حالانکہ وہ بلائے گئے تھے	سجدہ کرنے کی طرف	اس حال میں کہ وہ صحیح سالم تھے

نوٹ: 1

ان آیات میں نیک بندوں کی جزاء کا ذکر ہے اور اس کے بعد مشرکین کے ایک اور باطل دعوے کا رَدّ ہے۔ کفار مکہ کہا کرتے تھے کہ اول تو قیامت آنے والی نہیں ہے اور دوبارہ زندہ ہو کر حساب کتاب کا قصہ سب افسانہ ہے۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی گیا تو ہمیں وہاں بھی ایسی ہی نعمتیں ملیں گی جیسے دنیا میں ملی ہیں۔ اس کا جواب دیا گیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نیک بندوں اور مجرموں کو برابر کر دے گا۔ یہ کیسا عجیب وغریب فیصلہ ہے جس کی نہ کوئی سند نہ دلیل نہ کسی آسمانی کتاب سے اس کا ثبوت اور نہ ہی اللہ کی طرف سے کوئی وعدہ وعید کہ وہاں بھی تمہیں نعمت دے گا۔

ان آیات کے مذکورہ طرز استدلال سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کا آنا حساب کتاب کا ہونا اور نیک و بد کی جزاء وسزا، یہ سب عقلاً ضروری ہے (یعنی انسانی عقل اس کا تقاضہ کرتی ہے) دنیا میں ہر شخص اس کا مشاہدہ کرتا ہے اور کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا میں عموماً بدکار اور ظالم نفع میں رہتے ہیں اور مزے اڑاتے ہیں۔ پھر وہ نہ خوف خدا کو جانیں، نہ آخرت کو مانیں، نہ کسی شرم وحیا کے پابند ہوں اور اپنے نفس کی خواہشات کو جس طرح چاہیں پورا کرتے ہیں جبکہ نیک آدمی اوّل تو خدا سے ڈرتا ہے اور اگر وہ نہ ہو تو برادری کی شرم وحیات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دنیا کے کارخانے میں تو بدکار اور بدمعاش کامیاب اور نیک شریف آدمی ناکام نظر آتا ہے۔ اب اگر آگے بھی کوئی ایسا وقت نہ آئے جس میں حق اور ناحق کا صحیح انصاف ہو، نیک کو اچھا بدلہ ملے اور بد کو سزا ملے تو پھر اوّل تو کسی برائی کو برائی کہنا لغو اور بے معنیٰ ہو جاتا ہے اور دوم یہ کہ پھر عدل وانصاف کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔ جو لوگ خدا کے وجود کے قائل ہیں وہ اس کا کیا جواب دیں گے کہ خدا تعالیٰ کا انصاف کہاں گیا۔

رہا یہ خیال کہ دنیا میں مجرم پکڑا جاتا ہے اور سزا پاتا ہے۔ اس طرح شریف آدمی کا امتیاز اسی دنیا میں واضح ہو جاتا ہے اور عدل و انصاف حکومتوں کے قوانین سے قائم ہو جاتا ہے (تو پھر دوبارہ زندہ ہو کر حساب کتاب اور جزاء وسزا کی کیا ضرورت ہے۔ مرتب) یہ اس لیے غلط ہے کہ اوّل تو ہر جگہ اور ہر حال میں حکومت کی نگرانی ہو ہی نہیں سکتی، جہاں ہو جاوے وہاں عدالتی ثبوت ہر جگہ بہم پہنچانا آسان نہیں اور

جہاں ثبوت بھی بہم پہنچ جائے تو زور وزر اور رشوت وسفارش اور دباؤ کے کتنے چور دروازے ہیں جن سے مجرم نکل بھاگتا ہے۔ اس دنیا کی حکومتی اور عدالتی جرم وسزا کا جائزہ لیا جائے تو یہاں پر سزا صرف وہ بے عقل اور بے سہارا آدمی پاتا ہے جو کوئی چور دروازہ نہ نکال سکے۔ باقی سب مجرم آزاد پھرتے ہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ عقلاً ایک ایسا وقت آنا ضروری ہے جب سب کا حساب ہو اور جہاں مجرموں کے لیے چور دروازہ نہ ہو۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔42۔ میں يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ کے الفاظ کے متعلق صحابہ کرامؓ اور تابعین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ الفاظ محاورے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ عربی محاورے کے مطابق سخت وقت آپڑنے کو کشفِ ساق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک اور قول کے مطابق اس میں کشفِ ساق سے مراد حقائق پر سے پردہ اٹھانا لیا گیا ہے۔ اس تاویل کی رو سے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز تمام حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں گی اور لوگوں کے اعمال کھل کر سامنے آجائیں گے اور قیامت کے دن اس بات کا مظاہرہ کرایا جائے گا کہ دنیا میں کون اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا تھا اور کون اس سے منحرف تھا۔ اس غرض کے لیے لوگوں کو بلایا جائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ بجالائیں۔ جو لوگ دنیا میں عبادت گزار تھے وہ سج دہ ریز ہو جائیں گے اور جنہوں نے دنیا میں اللہ کے آگے سر نیاز جھکانے سے انکار کیا تھا ان کی کمر تختہ ہو جائے گی اور ان کے لیے یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہاں عبادت گزار ہونے کا جھوٹا مظاہرہ کر سکیں۔ (تفہیم القرآن)۔

استادِ محترم پروفیسر حافظ احمد یار صاحب مرحوم نے کشفِ ساق کے محاورے کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ عرب کے لوگوں کا لباس ٹخنوں تک ہوتا ہے۔ جب کوئی دشمن حملہ آور ہوتا تھا یا ڈاکو آجاتے تھے تو یہ لوگ اپنے کپڑے گھٹنوں کے اوپر باندھ کر لڑنے کے لیے یا بھاگنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اس طرح کشف ساق کے محاورے میں کسی کام کے لیے تیار ہو جانے کا مفہوم ہے۔ حافظ صاحب کی اس وضاحت سے ذہن اردو محاورے کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اس مفہوم کی ادائیگی کے لیے اردو میں ہم کہتے ہیں، کسی کام کے لیے کمر کس لینا۔ بہر حال حافظ صاحب کی وضاحت کے مطابق اس آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ جس دن دوبارہ زندہ کر کے اللہ کے حضور پیش کرنے کے لیے لوگوں کو تیار کیا جائے گا اور اس تیاری کا پہلا مرحلہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ اس وقت دو قومی نظریہ کھل کر سامنے آجائے گا۔

آیت نمبر (44 تا 52)

ترجمہ

فَذَرْنِيْ	وَمَنْ يُّكَذِّبُ	بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ؕ	سَنَسْتَدْرِجُهُمْ
تو آپ چھوڑ دیں مجھ کو	اور اس کو جو جھٹلاتا ہے	اِس بات (قرآن) کو	ہم بتدریج لے جائیں گے ان کو (خسران میں)

مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾	وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ	اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾
جہاں سے یہ لوگ جانتے نہیں ہیں	اور میں ڈھیل دیتا ہوں ان کو	بیشک میری تدبیر بڑی پکی ہے

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا	فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ	مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾	اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ
یا آپ مانگتے ہیں ان سے کوئی اجرت	تو وہ تاوان سے	لدے ہوئے ہیں	یا ان کے پاس غیب (کی خبر) ہے

فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾	فَاصْبِرْ	لِحُكْمِ رَبِّكَ	وَلَا تَكُنْ	كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ
تو وہ لوگ لکھتے ہیں	تو آپؐ ثابت قدم (منتظر) رہیں	اپنے رب کے حکم کے	اور آپؐ مت ہوں	مچھلی والے (یونسؑ) کی طرح

اِذْ نَادٰى	وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ ؕ	لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ	نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ
جب انہوںؑ نے پکارا (رب کو)	اس حال میں کہ وہ غم زدہ تھے	اگر نہ ہوتا کہ آلیاانؑ کو	ایک نعمت نے ان کے رب (کے پاس) سے

لَنُبِذَ	بِالْعَرَآءِ	وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾
تو ضرور وہ پھینکے گئے رہتے	اُس چٹیل میدان میں	اس حال میں کہ وہ مذمت کیے ہوئے ہوتے

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ	فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾	وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	لَيُزْلِقُوْنَكَ
پھر نوازاانؑ کو ان کے رب نے	تو اس نے کر دیا انؑ کو نیک لوگوں میں سے	اور بیشک ایسے لگتا ہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا	کہ وہ ضرور پھسلا دیں آپؐ کو

بِاَبْصَارِهِمْ	لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ	وَيَقُوْلُوْنَ
اپنی (غضبناک) نظروں سے	جب وہ سنتے ہیں اس یاددہانی (قرآن) کو	اور وہ لوگ کہتے ہیں

اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾ ۘ	وَمَا هُوَ	اِلَّا ذِكْرٌ	لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾ ع
بیشک یہ ضرور مجنون ہے	حالانکہ نہیں ہے وہ	سوائے ایک ایسی یاددہانی ہے جو	تمام جہانوں کے لیے ہے

نوٹ: 1

آیت۔44۔ میں ہے کہ آپؐ جھٹلانے والوں کو اور مجھے چھوڑ دیں۔ یہاں چھوڑنا ایک محاورہ کے طور پر فرمایا گیا ہے۔ مراد اس سے اللہ پر بھروسہ کرنا ہے۔ اور اس کا حاصل کلام یہ ہے کہ کفار کی طرف سے یہ مطالبہ بھی پیش ہوا کرتا تھا کہ اگر ہم واقعی اللہ کے مجرم ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب دینے پر قادر ہے تو پھر ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔ اس پر یہ فرمایا گیا کہ اپنی حکمت کو ہم خوب جانتے ہیں۔ ایک حد تک مہلت دیتے ہیں اور فوراً عذاب نہیں بھیج دیتے۔ پھر حضرت یونسؑ کے واقعہ کا ذکر فرما کر آنحضرت ﷺ کو نصیحت فرمائی کہ آپؐ ان لوگوں کے ایسے مطالبہ سے مغلوب نہ ہوں اور ان پر جلدی عذاب نازل کرنے کے خواہشمند نہ ہوں۔ اپنی حکمتوں، مصلحتوں کو ہم ہی جانتے ہیں۔ ہم پر توکل کریں۔ (معارف القرآن)۔

بے خبری میں بتدریج کسی کو تباہی کی طرف لے جانے کی صورت یہ ہے کہ ایک حق کے دشمن اور ظالم کو دنیا میں نعمتوں سے نوازا جائے، صحت، مال، اور دنیوی کامیابیاں عطا کی جائیں۔ جن سے دھوکا کھا کر وہ سمجھے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں خوب کر رہا ہوں۔ اس طرح وہ ظلم وطغیان میں زیادہ سے زیادہ غرق ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ جو نعمتیں اسے مل رہی ہیں وہ انعام نہیں ہیں بلکہ اس کی ہلاکت کا سامان ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل ایمان میں سے کسی کو اگر اللہ تعالیٰ دنیوی کامیابیوں اور یہاں کی نعمتوں سے نوازتا ہے تو یہ اس کا انعام ہیں۔ قرآن مجید میں کم از کم دو مقامات، الانفال۔28۔ اور التغابن۔15، میں براہِ راست اہل ایمان کو خطاب کر کے خبردار کیا گیا ہے کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد یعنی دنیا کی نعمتیں فتنہ یعنی آزمائش ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ جو ان آزمائشوں میں پورا اترے گا تو یہ دنیوی نعمتیں اس کی آخرت کی کامیابیوں اور انعام کا ذریعہ بن جائیں گی، ناکامی کی صورت میں یہی نعمتیں آخرت میں ناکامی اور خسارے کا باعث ہوں گی۔ (مرتب)

نوٹ:2 آیت۔49۔کوسورۃ الصّافات کی آیت۔142۔146 کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ 1892 میں ڈالے گئے تھے اس وقت تو وہ ملامت میں مبتلا تھے، لیکن جب انہوں نے اللہ کی تسبیح کی اور اپنے قصور کا اعتراف کر لیا تو اگرچہ وہ مچھلی کے پیٹ سے نکال کر بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینکے گئے تھے، مگر وہ اس وقت مذمت میں مبتلا نہ تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس جگہ ایک بیلدار درخت اگا دیا، تا کہ اس کے پتے ان پر سایہ کریں اور وہ اس کے پھل سے اپنی بھوک پیاس بھی دور کر سکیں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3 آیت۔51۔کا تعلق بھی صبر وثبات کی تلقین کے اس مضمون ہی سے ہے جو فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ میں بیان ہوا ہے۔یعنی اگرچہ حالات نہایت سخت ہیں کہ کفار جب قرآن سنتے ہیں تو تمہیں اس طرح گھورتے ہیں جیسے وہ اپنی نگاہوں کے زور سے تمہیں دھکیل کر تمہارے مقام سے تم کو پھسلا دیں گے اور جوش غضب میں تمہیں خبطی اور مجنون بتاتے ہیں لیکن ان کے اس رویہ کے باوجود تم اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ یہاں ابتدائے سورہ کی آیت مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ، ذہن میں تازہ کر لیجئے۔سورہ جس مضمون سے شروع ہوئی تھی اسی پر ختم ہو رہی ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:4 آیات۔51۔52 کے ضمن میں کچھ مفسرین نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔انسان کی نظر بد لگ جانا اور اس سے کسی انسان کو نقصان اور بیماری بلکہ ہلاکت تک پہنچ جانا حقیقت ہے اور احادیث میں اس کا حق ہونا وارد ہے۔ یہ بات عرب میں بھی معروف ومشہور تھی اور مکہ میں ایک شخص نظر لگانے میں بڑا مشہور تھا۔ اونٹوں یا جانوروں کو نظر لگا دیتا تو وہ ہلاک ہو جاتے۔ کفارِ مکہ کو رسول اللہ ﷺ سے عداوت تو تھی ہی اور وہ آپ کو ایذاء پہنچانے کی ہر طرح کی کوشش کیا کرتے تھے۔ان کو یہ سوجھی کہ اُس شخص سے رسول اللہ ﷺ کو نظر لگواؤ۔تو لوگ اس کو بلا لائے۔اس نے نظر بد لگانے کی اپنی پوری کوشش کر لی مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی حفاظت فرمائی۔ یہ آیات اسی سلسلہ میں نازل ہوئیں اور لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ میں اسی نگاہ بد لگانے کو بیان فرمایا گیا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ جس شخص کو کسی انسان کی نظر بد لگ گئی ہو اس پر یہ آیات پڑھ کر دم کر دینا اس کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔(معارف القرآن)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الحاقۃ (69)

آیت نمبر (1 تا 12)

ح	س	م

(ض) حَسْمًا کسی چیز کو جڑ سے کاٹ دینا

حُسُوْمٌ صفت ہے۔نامبارک۔منحوس۔زیر مطالعہ آیت۔7

ص ر ع

6892

(ف) صَرْعًا زمین پر پٹخ دینا۔ پچھاڑنا

صَرِیْعٌ ج صَرْعٰی ۔ فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت ہے اسم المفعول کے معنی میں۔ پٹخا ہوا۔ پچھاڑا ہوا۔ زیر مطالعہ آیت۔7

ترجمہ

اَلْحَآقَّةُ ۙ﴿۱﴾	مَا الْحَآقَّةُ ۚ﴿۲﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ؕ﴿۳﴾
وہ ثابت ہونے والی	کیا ہے وہ ثابت ہونے والی	اور تم کیا جانو کیا ہے وہ ثابت ہونے والی (قیامت)

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ	بِالْقَارِعَةِ ﴿۴﴾	فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا	بِالطَّاغِيَةِ ﴿۵﴾
جھٹلایا ثمود نے اور عاد نے	اس کھٹکھٹانے والی (قیامت) کو	پس وہ جو ثمود تھے تو ان کو ہلاک کیا گیا	حد سے گزرنے والی (چنگھاڑ) سے

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا	بِرِيْحٍ	صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ﴿۶﴾	سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ
اور وہ جو عاد تھے تو ان کو ہلاک کیا گیا	ایک ایسی ہوا سے جو	حد سے زیادہ تیز و تند تھی	اس (اللہ) نے مطیع (مسلط) کیا اس (ہوا) کو ان لوگوں پر

سَبْعَ لَيَالٍ	وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ	حُسُوْمًا ۙ	فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا	صَرْعٰى ۙ
سات راتوں	اور آٹھ دنوں تک	منحوس ہوتے ہوئے	پس تو دیکھتا ہے اُس قوم کو اُس (سرزمین) میں	پچھاڑے ہوئے

كَاَنَّهُمْ	اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۚ﴿۷﴾	فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ	مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ﴿۸﴾
جیسے کہ وہ ہوں	کچھ اوندھی ہونے والی کھجوروں کے تنے	تو کیا تو دیکھتا ہے ان لوگوں کی	کوئی بھی باقی رہنے والی (جان)

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ	وَالْمُؤْتَفِكٰتُ	بِالْخَاطِئَةِ ۚ﴿۹﴾	فَعَصَوْا
اور آیا فرعون اور وہ لوگ جو اس سے پہلے تھے	اور الٹنے والی بستیوں (والے)	(ہر ایک) خطا کرنے والی (جان) کے ساتھ	پھر ان لوگوں نے نافرمانی کی

رَسُوْلَ رَبِّهِمْ	فَاَخَذَهُمْ	اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴿۱۰﴾	اِنَّا لَمَّا
اپنے رب کے رسول کی	تو اس نے پکڑا ان کو	ایک اٹھنے والی (شدید) پکڑ میں	بیشک ہم نے، اس وقت جب

طَغَا الْمَآءُ	حَمَلْنٰكُمْ	فِي الْجَارِيَةِ ﴿۱۱﴾
جوش میں آیا پانی	سوار کیا تم لوگوں کو	اُس جاری ہونے والی (کشتی) میں

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ	تَذْكِرَةً	وَّتَعِيَهَآ	اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾
تاکہ ہم بنائیں اس (کشتی) کو تمہارے لیے	ایک یاددہانی	اور تاکہ یاد رکھے اس کو	کوئی یاد رکھنے والا کان

نوٹ: 1 سابقہ سورہ القلم سے اس سورہ کو گہری مناسبت ہے۔ دونوں کا عمود (یعنی مرکزی موضوع) ایک ہی ہے یعنی اثبات عذاب (دنیا میں آنے والے عذاب) اور قیامت (دنیا کا خاتمہ)۔ البتہ نہج استدلال دونوں میں الگ الگ ہے۔ قرآن کی عظمت وصداقت جس طرح سابق سورہ میں واضح کی گئی ہے اور اس کی تکذیب کے نتائج سے ڈرایا گیا ہے، اسی طرح اس سورہ میں بھی یہی مضمون زیر بحث آیا ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ سابق سورہ

میں یہ مضمون تمہید کی حیثیت سے ہے اور اس سورہ میں اختتام کے طور پر ہے۔ تذکیر و تعلیم کے پہلو سے ان دونوں اسلوبوں کی اہمیت الگ الگ ہے۔ (تدبر قرآن)۔ 1892

نوٹ:2 کفار مکہ چونکہ قیامت کو جھٹلا رہے تھے اور اس کے آنے کی خبر کو مذاق سمجھتے تھے اس لیے پہلے ان کو خبردار کیا گیا کہ وہ تو ہونی شدنی ہے، تم چاہے مانو یا نہ مانو، وہ بہرحال آ کر رہے گی۔ اس کے بعد ان کو بتایا گیا کہ یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ کوئی شخص ایک پیش آنے والے واقعہ کی خبر کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں، بلکہ اس کا نہایت گہرا تعلق قوموں کے اخلاق اور پھر ان کے مستقبل سے ہے۔ تم سے پہلے گزری ہوئی قوموں کی تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم نے بھی آخرت کا انکار کر کے اسی دنیا کی زندگی کو اصل زندگی سمجھا اور اس بات کو جھٹلا دیا کہ انسان کو آخر کار خدا کی عدالت میں اپنا حساب دینا ہوگا، وہ سخت اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہوئی، یہاں تک کہ خدا کے عذاب نے آ کر دنیا کو اس کے وجود سے پاک کر دیا۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (13 تا 37)

و ھ ی

(ض۔ح) وَهْيًا — کسی چیز کا بوسیدہ ہو کر پھٹ جانا۔ شگاف پڑنا۔ بوسیدہ ہونا۔

وَاهِيَة — مؤنث وَاهِيَةٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ پھٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔16۔

ق ط ف

(ض) قَطْفًا — پھل چننا۔

قِطْفٌ — ج قُطُوْفٌ۔ اسم ذات ہے۔ پھل۔ میوہ۔ زیر مطالعہ آیت۔33۔

ح ض ض

(ن) حَضًّا — کسی کام پر اکسانا۔ ترغیب دینا۔ زیر مطالعہ آیت۔34۔

(تفاعل) تَحَاضًّا — ایک دوسرے کو ترغیب دینا۔ ﴿وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۙ﴾ (89/الفجر:18) ''اور تم لوگ باہم ترغیب نہیں دیتے مسکین کے کھانا (کھلانے) پر۔ تَحٰضُّوْنَ دراصل تَتَحَاضُّوْنَ ہے جس کی ایک تا گری ہوئی ہے۔

ترکیب (آیت۔13) آگے قیامت کے واقعات کا ذکر ہے اس لیے بھی (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:27) اور بات اِذَا شرطیہ سے شروع ہو رہی ہے، اس لیے بھی آگے افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔ نُفِخَ کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے نَفْخَةٌ حالت رفع میں ہے۔ (آیت۔14) دُكَّتَا تثنیہ مؤنث کا صیغہ ہے۔ اس کا نائب فاعل اس میں شامل هُمَا کی ضمیر ہے جو اَلْاَرْضُ وَالْجِبَالُ کے لیے ہے اور محلاً حالت رفع میں ہے۔ دَكَّةً اس کا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ (آیت۔17) وَالْمَلَكُ پر الف لام کو لام تعریف بھی مانا جا سکتا ہے اور لامِ جنس بھی۔ ترجمے میں ہم لام جنس کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔18) ثلاثی مجرد اور باب افعال، دونوں کا مضارع مجہول ہم شکل ہو جاتا ہے۔ عبارت کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ یہاں تُعْرَضُوْنَ باب افعال کا نہیں بلکہ ثلاثی مجرد کا مضارع مجہول ہے۔ خَفِيَ کے

ساتھ صلہ کے استعمال سے مفہوم بدلتا ہے۔ خَفِیَ عَلَیْہِ (پوشیدہ ہوا اس پر یعنی اس سے پوشیدہ ہوا۔) خَفِیَ مِنْہُ۔ (پوشیدہ ہوا اس سے یعنی اس کا کوئی کام پوشیدہ ہوا) ترجمہ کرتے وقت اردو محاورے کا لحاظ کرنا ہوگا (آیت۔19) اُوْتِیَ کا نائب فاعل مَنْ ہے جو محلاً حالتِ رفع میں ہے، جبکہ کِتٰبَہٗ میں کِتٰبُ مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ کِتٰبِیَہْ دراصل کِتَابِیْ ہے جس پر ہائے سکت لگی ہوئی ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ259، نوٹ۔2)۔ اسی طرح آگے حِسَابِیَہْ۔ مَالِیَہْ۔ سُلْطٰنِیَہْ وغیرہ میں بھی یائے متکلم کے آگے ہائے سکت لگی ہے۔ نوٹ کرلیں کہ تائے تانیث پر جب وقف کرتے ہیں تو وہ بھی ہا کی آواز دیتی ہے لیکن کتابت میں اس پر تا کے دو نقطے آتے ہیں جیسے رَاضِیَۃٍ۔ عَالِیَۃٍ۔ دَانِیَۃٍ۔ اَلْقَاضِیَۃَ وغیرہ۔ جب کہ ہائے سکت نقطوں سے خالی ہوتی ہے۔ (آیت۔27) کَانَتْ کا اسم اس میں شامل ھِیَ کی ضمیر ہے جب کہ اَلْقَاضِیَۃَ اس کی خبر ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔

ترجمہ

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ	نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾	وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ
پھر جب پھونکا جائے گا صور میں	ایک ہی بار پھونکنا	اور اٹھائی جائے گی یہ زمین اور سارے پہاڑ

فَدُكَّتَا	دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾	فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ	الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾	وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ
پھر وہ دونوں کوٹ کر ہموار کیے جائیں گے	ایک ہی بار ہموار کرنا	تو اُس دن واقع ہوگی	وہ واقع ہونے والی (قیامت)	اور پھٹ جائے گا آسمان

فَهِیَ يَوْمَئِذٍ	وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾	وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا	وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ
تو وہ (آسمان) اُس دن	بوسیدہ ہوگا	اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے	اور اٹھائیں گے تیرے رب کا عرش

فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ	ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾	يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ	لَا تَخْفٰى	مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾
اپنے اوپر اس دن	آٹھ (فرشتے)	اس دن تم لوگ سامنے لائے جاؤ گے	چھپی نہیں ہوگی	تمہاری کوئی چھپنے والی (بات)

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ	كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ	فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ	اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿۱۹﴾	اِنِّیْ ظَنَنْتُ
پس وہ جو ہے جس کو دی گئی	اس کی کتاب اس کے داہنے ہاتھ میں	تو وہ کہے گا یہ لو	پڑھو میری کتاب	بیشک میں نے خیال کیا

اَنِّیْ مُلٰقٍ	حِسَابِيَهْ ﴿۲۰﴾	فَهُوَ فِیْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ	فِیْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۲۲﴾
کہ میں ملاقات کرنے والا ہوں	اپنے حساب سے	تو وہ من بھاتی زندگی گزارنے میں ہے	اونچا ہونے والے باغ میں

قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴿۲۳﴾	كُلُوْا وَاشْرَبُوْا	هَنِيْٓـًٔا	بِمَآ اَسْلَفْتُمْ
جس کے میوے قریب ہونے والے (جھکے ہوئے) ہوں گے	(کہا جائے گا) تم لوگ کھاؤ اور پیو	خوشگوار ہوتے ہوئے	بسبب اس کے جو تم لوگوں نے آگے بھیجا

فِی الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿۲۴﴾	وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ	كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ	فَيَقُوْلُ
گزرنے والے دنوں میں	اور وہ جو ہے جس کو دی گئی	اس کی کتاب اس کے بائیں ہاتھ میں	تو وہ کہے گا

يٰلَيْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ	كِتٰبِيَهْ ﴿۲۵﴾	وَلَمْ اَدْرِ	مَا حِسَابِيَهْ ﴿۲۶﴾	يٰلَيْتَهَا كَانَتِ
اے کاش مجھ کو دی ہی نہ جاتی	میری کتاب	اور میں جانتا ہی نہ	کیا ہے میرا حساب	اے کاش وہ (موت ہی) ہوتی

الْقَاضِيَةَ ﴿۲۷﴾	مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ	مَالِيَهْ ﴿۲۸﴾	هَلَكَ عَنِّيْ	سُلْطٰنِيَهْ ﴿۲۹﴾
فیصلہ کرنے (قصہ چکانے) والی	کیا کام آیا میرے	میرا مال	ہلاک (زائل) ہوا مجھ سے	میرا اختیار

خُذُوْهُ	فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾	ثُمَّ الْجَحِيْمَ	صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾	ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ
(کہا جائے گا) پکڑو اس کو	پھر طوق پہناؤ اس کو	پھر دہکتی آگ میں	تم لوگ بھونو اس کو	پھر ایک ایسی زنجیر میں

ذَرْعُهَا	سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا	فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾	اِنَّهٗ	كَانَ لَا يُؤْمِنُ
جس کی لمبائی	ستر ہاتھ ہے	تم لوگ ڈالو (جکڑو) اس کو	بیشک وہ	ایمان نہیں لاتا تھا

بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿۳۳﴾	وَلَا يَحُضُّ	عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۳۴﴾	فَلَيْسَ لَهُ
اس عظیم اللہ پر	اور ترغیب نہیں دیتا تھا (کسی کو)	مسکین کے کھانا (کھلانے) پر	تو نہیں ہے اس کے لیے

الْيَوْمَ هٰهُنَا	حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾	وَّلَا طَعَامٌ	اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿۳۶﴾	لَّا يَاْكُلُهٗٓ	اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ﴿۳۷﴾
آج یہاں	کوئی گرم جوش (دوست)	اور نہ چکھنے کی کوئی چیز	سوائے زخموں کے میل کچیل میں سے	نہیں کھاتے اس کو مگر	خطا (گناہ) کرنے والے

نوٹ: 1

زیر مطالعہ آیات کو پڑھتے ہوئے یہ بات ذہن میں ہونی چاہیے کہ قرآن مجید میں کہیں تو قیامت کے تین مراحل الگ الگ بیان کیے گئے ہیں جو یکے بعد دیگرے مختلف اوقات میں پیش آئیں گے۔ اور کہیں پہلے مرحلے سے آخری مرحلے تک کے واقعات کو سمیٹ کر یکجا کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ نمل آیت۔ 87۔ میں پہلے نَفَخِ صور کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب تمام دنیا کے انسان یک لخت ایک ہولناک آواز سے گھبرا اٹھیں گے۔ اس وقت نظام عالم کے درہم برہم ہونے کی وہ کیفیات ان کی آنکھوں کے سامنے پیش آئیں گی جو سورۂ حج آیات۔ 1، 2، سورۂ یٰسین آیات۔ 49۔ 50، اور سورۂ تکویر آیات۔ 1 تا 6 میں بیان ہوئی ہیں۔ سورۂ زمر آیات۔ 67 تا 70۔ میں دوسرے اور تیسرے نَفَخِ صور کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ایک نفخ پر سب لوگ مر کر گر جائیں گے اور اس کے بعد جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب جی اٹھیں گے اور خدا کی عدالت میں پیش ہو جائیں گے۔ سورۂ طٰہٰ آیات۔ 102 تا 112، سورۂ انبیاء آیات۔ 101 تا 103، سورۂ یٰسین آیات۔ 51 تا 53، اور سورۂ ق آیات۔ 20 تا 22 میں صرف تیسرے نَفَخِ صور کا ذکر ہے۔ لیکن یہاں اور دوسرے مقامات پر قرآن میں پہلے نَفَخِ صور سے لے کر جنت اور جہنم میں لوگوں کے داخل ہونے تک کے تمام واقعات کو ایک ہی سلسلہ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

قرآن مجید میں قیامت کے جو احوال بیان ہوئے ہیں ان کا تعلق متشابہات سے ہے۔ ہمارے فہم سے قریب لانے کے لیے ان کو ایسے لفظوں میں بیان کیا جاتا ہے جن سے ان کا ایک تصور ہمارے ذہن میں قائم ہو سکے۔ یہ احوال ایک نادیدہ عالم کے ہیں، ان کا تصور دینے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ان کی اصل حقیقت کا جاننا اس عالم میں ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے متعلق یہ ہدایت دی ہے کہ وہ جس طرح بیان ہوئے ہیں، اسی طرح ان پر اجمالی ایمان رکھا جائے۔ ان کی اصل حقیقت کے درپے نہ ہوا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ آدمی کسی فتنہ میں پڑ جائے۔ (تدبر قرآن)۔

قیامت کے روز عرش رحمٰن کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ قیامت سے پہلے تو یہ کام

چار فرشتوں کے سپرد ہے۔ قیامت کے روز ان کے ساتھ چار اور بڑھا دیئے جائیں گے۔ رہا یہ معاملہ کہ عرش رحمٰن کیا چیز ہے اور اس کی حقیقت اور شکل وصورت کیا ہے اور فرشتوں کا اس کو اٹھانا کس صورت سے ہے، یہ سب چیزیں وہ ہیں کہ عقل انسانی ان کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ ان مباحث میں پڑنے، ان پر غور وفکر کرنے اور سوالات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ صحابہ اور تابعین کا مسلک اس جیسے تمام معاملات میں یہ ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے کہ اس سے جو کچھ اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہ حق ہے اور اس کی حقیقت وکیفیت نامعلوم ہے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 3

سیدھے ہاتھ میں نامۂ اعمال کا دیا جانا ہی ظاہر کر دے گا کہ اس کا حساب بے باق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے نہیں بلکہ صالح انسان کی حیثیت سے پیش ہو رہا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ اعمال ناموں کی تقسیم کے وقت صالح انسان خود سیدھا ہاتھ بڑھا کر اپنا نامۂ اعمال لے گا، کیونکہ موت کے وقت سے میدان حشر میں حاضری تک اس کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا ہوگا اس کی وجہ سے اس کو پہلے ہی یہ اطمینان حاصل ہو چکا ہوگا کہ میں یہاں انعام پانے کے لیے پیش ہو رہا ہوں نہ کہ سزا پانے کے لیے۔ قرآن مجید میں یہ بات جگہ جگہ بڑی صراحت کے ساتھ بتائی گئی ہے کہ موت کے وقت ہی سے یہ بات انسان پر واضح ہو جاتی ہے کہ وہ نیک بخت آدمی کی حیثیت سے دوسرے عالم میں جا رہا ہے یا بد بخت آدمی کی حیثیت سے۔ پھر موت سے قیامت تک نیک انسان کے ساتھ مہمان کا سا معاملہ ہوتا ہے اور بد انسان کے ساتھ حوالاتی مجرم کا سا۔ اس کے بعد جب قیامت کے روز دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے اسی وقت سے صالحین کی حالت وکیفیت کچھ اور ہوتی ہے جبکہ کفار، منافقین اور مجرمین کی کچھ اور۔

سورۂ انشقاق میں فرمایا گیا ہے ''اور جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا'' غالباً اس کی صورت یہ ہوگی کہ مجرم کو چونکہ پہلے ہی سے اپنے مجرم ہونے کا علم ہوگا اور وہ جانتا ہوگا کہ اس کے نامۂ اعمال میں اس کا سارا کچا چٹھا درج ہے اس لیے وہ نہایت بے دلی کے ساتھ اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر اسے لے گا اور فوراً پیٹھ کے پیچھے چھپا لے گا تا کہ کوئی دوسرا اسے دیکھنے نہ پائے۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (36 تا 43)

و ت ن

وُتُوْنًا — پانی کا ہمیشہ بہنا اور نہ رکنا۔

وَتِیْنٌ — فَعِیْلٌ کا وزن ہے لیکن یہ اسم ذات ہے۔ دل کی رگ جس سے تمام رگوں میں خون جاتا ہے۔ زیر مطالعہ آیت۔46۔

ترکیب

آیت۔45) اس میں یہ نہیں کہا کہ لَاَخَذْنَاہُ بلکہ ضمیر مفعولی کے ساتھ مِنْ لگا دیا ہے کیونکہ کسی کو جب پکڑتے ہیں تو اس کا پورا جسم نہیں پکڑتے بلکہ جسم کا کوئی حصہ جیسے گردن یا ہاتھ وغیرہ پکڑتے ہیں۔ بالیمین (داہنے ہاتھ سے)۔ اس سے مراد ہے قوت سے۔ طاقت سے۔ (حافظ احمد یار صاحب کے کیسٹ سے ماخوذ)۔ اس آیت کے ترجمہ سے متعلق تدبر قرآن میں ہے کہ عام طور پر لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے ''ہم اس کا (پیغمبر کا) داہنا ہاتھ پکڑتے'' لیکن عربیت کے قاعدے سے اس کا ترجمہ ہونا چاہیے ''ہم اس کو اپنے قوی بازو سے پکڑتے۔'' اور تفسیر ابن جریر سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ (آیت۔47) لفظ اَحَدٌ میں کبھی جمع کا مفہوم ہوتا ہے۔ جیسے ہم کہیں کہ تم لوگوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم سب کے سب ایسے نہیں ہو۔ اس طرح اس جملہ میں لفظ ایک جمع کے مفہوم میں ہے۔ اس آیت میں بھی مِنْ اَحَدٍ جمع کے مفہوم میں ہے، اس لیے حَاجِزًا (واحد) کے بجائے حَاجِزِیْنَ (جمع) آیا ہے۔

ترجمہ

6892

فَلَآ	اُقْسِمُ	بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۙ﴿۳۸﴾	وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۙ﴿۳۹﴾	اِنَّهٗ
پس نہیں!	میں قسم کھاتا ہوں	اس کی جو تم لوگ دیکھتے ہو	اور اس کی جو تم لوگ نہیں دیکھتے	بیشک یہ (قرآن)

لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ﴿۴۰﴾	وَّمَا هُوَ	بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ	قَلِيْلًا مَّا	تُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۴۱﴾
یقیناً ایک بزرگ رسول کا کہا ہوا ہے	اور یہ (قرآن)	کسی شاعر کا کہا ہوا نہیں ہے	بہت ہی تھوڑا سا	تم لوگ ایمان لاتے ہو

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ	قَلِيْلًا مَّا	تَذَكَّرُوْنَ ؕ﴿۴۲﴾	تَنْزِيْلٌ	مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾
اور نہ کسی کاہن کا کہا ہوا ہے	بہت ہی تھوڑی سی	تم لوگ نصیحت پکڑتے ہو	(یہ) اتارا ہوا ہے	تمام جہانوں کے رب (کی طرف) سے

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا	بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۙ﴿۴۴﴾	لَاَخَذْنَا مِنْهُ	بِالْيَمِيْنِ ۙ﴿۴۵﴾
اور اگر وہ غلط منسوب کرتے ہم پر	باتوں کی کوئی (بات)	تو ہم ضرور پکڑتے اس کو	داہنے ہاتھ (پوری طاقت) سے

ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ	الْوَتِيْنَ ۚ﴿۴۶﴾	فَمَا مِنْكُمْ	مِّنْ اَحَدٍ	عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾
پھر ہم ضرور کاٹ دیتے اس سے	(اس کی) رگِ دل کو	تو نہ ہوتا تم میں سے	کوئی ایک بھی	اس سے روکنے والا

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ	لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾	وَاِنَّا لَنَعْلَمُ	اَنَّ مِنْكُمْ
اور بیشک یہ (قرآن) یقیناً ایک یاددہانی ہے	متقی لوگوں کے لیے	اور بیشک ہم یقیناً جانتے ہیں	کہ تم میں سے

مُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾	وَاِنَّهٗ	لَحَسْرَةٌ	عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾
کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں (اس کو)	اور بیشک یہ (جھٹلانا) ضرور	ایک حسرت ہوگا	انکار کرنے والوں پر

وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾	فَسَبِّحْ	بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۚ﴿۵۲﴾
اور بیشک یہ یقین کرنے کا حقدار ہے	تو پھر تو تسبیح کر	اپنے عظیم رب کے نام کی

نوٹ: 1

قسم سے پہلے اس طرح جولا آیا کرتا ہے وہ نہ تو زائد ہوتا ہے اور نہ قسم کی نفی کے لیے، بلکہ یہ قسم سے پہلے مخاطب کی بات کی تردید کے لیے آتا ہے۔ قرآن میں جہاں کوئی قسم کھائی گئی ہے بالعموم دعوے کی شہادت اور اس کی دلیل کے طور پر کھائی گئی ہے۔ یہاں اصل دعویٰ اثباتِ جزاء و سزا ہے۔ قیامت اور جزاء وسزا پر قرآن نے جو دلائل دیے ہیں وہ پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکے ہیں اور اس سورہ میں بھی زیر بحث آئے ہیں۔ ان پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کا تعلق آفاق وانفس کے ان شواہد سے بھی ہے جو آنکھوں سے دیکھے جاسکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ان صفات اور آخرت کے ان احوال سے بھی ہے جو آنکھوں سے تو نہیں دیکھے جاسکتی لیکن عقل سے سمجھے جاسکتے ہیں۔ اسی سورہ میں جزاء وسزا پر جو دلیل قائم کی گئی ہے وہ پہلے قوموں کی تاریخ اور ان کی تباہی کے آثار سے قائم کی گئی ہے۔ پھر عالم غیب کے وہ احوال سنائے گئے ہیں جن سے اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کو سابقہ پیش آنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک کا تعلق اس عالم سے ہے جس کی گواہی تاریخ کے صفحات اور زمین کے آثار میں موجود ہے۔ اور دوسرے کا تعلق اس نادیدہ عالم سے ہے جس کو ہر چند یہاں آنکھوں سے تو نہیں دیکھا جاسکتا لیکن عقل اس کو تسلیم

کرتی ہے کیونکہ خالق کی صفات اور اس جہاں میں پیش آنے والے مکافاتِ عمل کے واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ انہی دو طرح کی دلیلوں کو گواہی میں پیش کر کے منکروں کو آگاہ فرمایا ہے کہ قرآن جس جزاء وسزا سے تمہیں آگاہ کر رہا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ اس عالم مشہود اور عالم غیر مشہود کے دلائل اس کی تائید میں ہیں۔ اس کو کسی شاعر کا کلام قرار دے کر جھٹلانے کی کوشش مت کرو۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔40 میں رسول کریم سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور سورۂ تکویر (آیت۔19) میں اس سے مراد حضرت جبریلؑ ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہاں قرآن کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ کفار مکہ جبریلؑ کو نہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شاعر اور کاہن کہتے تھے جبکہ سورۂ تکویر میں قرآن کو رسول کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ وہ رسول بڑی قوت والا ہے، صاحب عرش کے ہاں بلند مرتبہ ہے، وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو روشن افق پر دیکھا ہے۔ قریب قریب یہی مضمون سورۂ نجم کی آیات۔5 تا 10 میں حضرت جبریلؑ کے متعلق بیان ہوا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جبریلؑ کا قول کس معنی میں کہا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ اس کو حضورؐ کی زبان سے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے جبریلؑ کی زبان سے سن رہے تھے۔ اس لیے ایک لحاظ سے یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول تھا اور دوسرے لحاظ سے جبریلؑ کا قول، لیکن آگے چل کر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ فی الاصل یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ خود رسول کا لفظ بھی اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ان دونوں کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ پیغامبر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اس کو پیغام بھیجنے والے کی طرف سے پیش کیا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیات۔44 تا 47 میں ایک خاص واقعہ کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ اگر خدانخواستہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا۔ اس میں کوئی عام ضابطہ بیان نہیں کیا گیا کہ جو شخص بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے، ہمیشہ اس کو ہلاک ہی کر دیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا لیکن ان پر کوئی ایسا عذاب نہیں آیا۔ (معارف القرآن)۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ جس طرح بادشاہ ایک شخص کو کسی منصب پر مامور کر کے اور سند و فرمان وغیرہ دے کر کسی طرف روانہ کرتے ہیں۔ اب اگر اس شخص سے اُس خدمت میں کچھ خیانت ہوئی یا بادشاہ پر کچھ جھوٹ باندھنا اس سے ثابت ہوا تو اسی وقت بلا توقف اس کا تدارک کرتے ہیں۔ لیکن اگر سڑک کوٹنے والا مزدور یا جھاڑو دینے والا بھنگی بکتا پھرے کہ گورنمنٹ کا میرے لیے یہ فرمان ہے یا میرے ذریعہ سے یہ احکام دیئے گئے ہیں، تو کون اس کی بات پر کان دھرتا ہے اور کون اس کے دعووں سے تعرض کرتا ہے۔ بہرحال آیت ہذا میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر استدلال نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ بتلایا گیا ہے کہ قرآن کریم خالص اللہ کا کلام ہے جس میں ایک حرف یا ایک شوشہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی طرف سے شامل نہیں کر سکتے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ شان ہے کہ کوئی بات اللہ کی طرف منسوب کر دیں جو اس نے نہ کی ہو۔ تورات سفر استثناء کے اٹھارویں باب میں بیسواں فقرہ یہ ہے، لیکن وہ نبی ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ ہی قتل کیا جائے۔'' (ترجمہ شیخ الہند)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6892

سورۃ المعارج (70)

آیت نمبر (1 تا 18)

ع ھ ن

(ض) عَهۡنًا شاخ کا لچکنا اور ٹوٹنے کے قریب ہونا۔
عِهۡنٌ رنگی ہوئی اون۔ آیت۔ زیر مطالعہ۔9۔

ل ظ ی

(س) لَظًّى آگ کا بھڑکنا۔
لَظٰى آگ کا شعلہ جہنم کا اسم علم بھی ہے۔ زیر مطالعہ آیت۔15۔
(تفعل) تَلَظُّيًا غصّہ سے جل اٹھنا۔ ﴿ فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ نَارًا تَلَظّٰى ﴾ (92/اللیل:14) ''تو میں نے خبردار کر دیا تم لوگوں کو ایک ایسی آگ سے جو غصّہ سے جل اٹھے گی۔''

ترکیب (آیت۔2) لَيۡسَ لَهٗ میں ـهٗ کی ضمیر بِعَذَابٍ کے لیے ہے۔ (آیت۔3) مِنَ اللّٰهِ کا تعلق دَافِعٌ سے بھی مانا جاسکتا ہے۔ اس وقت معنی ہوں گے کہ اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا اور اس کا تعلق بِعَذَابٍ سے بھی مانا جاسکتا ہے۔ اس وقت معنی ہوں گے کہ وہ عذاب اللہ کی طرف سے واقع ہونے والا ہے۔ مِنَ اللّٰهِ سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے دَافِعٌ سے اس کا متعلق ہونا قابل ترجیح تھا لیکن آگے کی عبارت کا تقاضہ ہے کہ اس کو بِعَذَابٍ سے متعلق مانا جائے۔ (آیت۔6۔7) يَرَوۡنَهٗ اور نَرٰىهُ دونوں کی ضمیر مفعولی يَوۡمٍ کے لیے ہے جس سے مراد عَذَابٌ وَاقِعٌ والا دن یعنی قیامت ہے۔ (آیت۔11) بَصَّرَ (باب تفعیل) کے دو مفعول آتے ہیں۔ کس کو دکھایا اور کیا دکھایا۔ یہاں اس کا مضارع مجہول آیا ہے۔ يُبَصَّرُوۡنَهُمۡ میں شامل هُمۡ کی ضمیر اس کا مفعولِ اوّل ہے جو اب نائب فاعل کہلائے گا اور یہ ضمیر حَمِيۡمٌ کے لیے ہے۔ اس کے آگے هُمۡ کی ضمیر مفعولی اس کے مفعول ثانی کے لیے ہے۔ یہ ضمیر حَمِيۡمًا کے لیے ہے۔

ترجمہ

سَاَلَ سَآئِلٌۢ	بِعَذَابٍ	وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾	لِّلۡكٰفِرِيۡنَ لَيۡسَ لَهٗ	دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾
مانگا ایک مانگنے والے نے	ایک ایسا عذاب جو	واقع ہونے والا ہے	کافروں کے لیے نہیں ہے جس کو	کوئی دفع کرنے والا

مِّنَ اللّٰهِ ذِى الۡمَعَارِجِ ؕ﴿۳﴾	تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ
جو بلندیوں والے اللہ (کی طرف) سے ہوگا	چڑھیں گے فرشتے اور الروح (جبریلؑ)

اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ	كَانَ مِقۡدَارُهٗ	خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ ۚ﴿۴﴾	فَاصۡبِرۡ صَبۡرًا جَمِيۡلًا ﴿۵﴾
اس کی طرف ایک ایسے دن میں	ہے جس کے اندازے کا پیمانہ	پچاس ہزار سال ہے	تو آپ صبر کریں جیسے خوبصورت صبر کرنا ہوتا ہے

اِنَّهُمۡ يَرَوۡنَهٗ بَعِيۡدًا ۙ﴿۶﴾	وَّنَرٰىهُ قَرِيۡبًا ؕ﴿۷﴾	يَوۡمَ تَكُوۡنُ السَّمَآءُ	كَالۡمُهۡلِ ۙ﴿۸﴾
بیشک وہ لوگ دیکھتے ہیں اس (قیامت) کو دور ہوتے ہوئے	اور ہم دیکھتے ہیں اس کو قریب	جس دن ہو جائے گا آسمان	پگھلی ہوئی دھات کی مانند

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ	كَالْعِهْنِ ۝٩	وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ	حَمِيْمًا ۝١٠
اور ہو جائیں گے پہاڑ	رنگی ہوئی اون کی مانند	اور نہیں پوچھے گا کوئی دوست	کسی دوست سے (خیر خیریت)

يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ	يَوَدُّ الْمُجْرِمُ	لَوْ يَفْتَدِيْ
ان (دوستوں) کو دکھائے جائیں گے وہ سب (دوست)	تمنا کریں گے سارے مجرم	کاش وہ خود کو چھڑا لیں

مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ	بِبَنِيْهِ ۝١١	وَصَاحِبَتِهٖ	وَاَخِيْهِ ۝١٢
اس دن کے عذاب سے	بدلے میں دے کر اپنے بیٹے کو	اور اپنی ساتھ والی (بیوی) کو	اور اپنے بھائی کو

وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ	تُـْٔوِيْهِ ۝١٣	وَمَنْ فِي الْاَرْضِ	جَمِيْعًا ۙ
اور اپنے اُس کنبے کو جو	ٹھکانہ دیتا تھا اس کو	اور ان کو جو زمین میں ہیں	سب کے سب کو

ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۙ ۝١٤	كَلَّا ؕ	اِنَّهَا لَظٰى ۙ ۝١٥	نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝١٦
پھر وہ (فدیہ دینا) نجات دلائے اس کو	ہرگز نہیں	بیشک یہ آگ کی تپش ہے	اُدھیڑنے والی ہوتے ہوئے چمڑی کو

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ	وَتَوَلّٰى ۙ ۝١٧	وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝١٨
وہ (تپش) بلائے گی اس کو جس نے پیٹھ پھیری	اور روگردانی کی	اور جمع کیا (مال) پھر محفوظ رکھا

نوٹ: 1

ایک دن کا ایک ہزار سال یا پچاس ہزار سال کے برابر ہونے کا کیا مفہوم ہے، اس کی ایک وضاحت آیت نمبر۔22/47، نوٹ۔2۔ میں کی جا چکی ہے جبکہ ہمارے طلباء کے علم میں یہ بات بھی ہونی چاہیے کہ ہمارے مفسرین نے ان آیات کو کس طرح سمجھا ہے اور ان کی کیا وضاحت کی ہے۔ چنانچہ اس موقع پر ہم مفسرین کی رائے نقل کر رہے ہیں

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ عذاب جس کا اوپر ذکر آیا ہے، اس کا وقوع اس روز ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس دن کے متعلق سوال کیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہو گی کہ یہ دن کتنا دراز ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ یہ دن مومن پر اتنا ہلکا ہوگا کہ ایک نماز فرض ادا کرنے کے وقت سے بھی کم ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ یہ دن مومنین کے لیے اتنا ہوگا جتنا ظہر و عصر کے درمیان ہوتا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ اس دن کا یہ طول کہ پچاس ہزار سال کا ہوگا، ایک اضافی امر ہے، کہ کفار کے لیے اتنا دراز اور مومنوں کے لیے اتنا مختصر ہوتا۔

اس آیت میں ایک دن کی مقدار پچاس ہزار سال بتائی ہے، جبکہ سورۂ السجدہ کی آیت۔5 میں ایک ہزار سال آئے ہیں۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے ''تدبیر کرتے ہیں امر الٰہی کی آسمان سے زمین تک۔ پھر چڑھتے ہیں اس کی طرف ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ایک ہزار سال ہے عام شمار کے اعتبار سے۔'' بظاہر ان دونوں آیتوں کے مضمون میں تضاد ہے۔ اس کا جواب گزشتہ روایات حدیث سے ہو گیا کہ اس دن کا طول مختلف گروہوں کے اعتبار سے مختلف ہوگا۔ کفار کے لیے پچاس ہزار سال کا اور مومنین صالحین کے لیے ایک نماز کا وقت۔ ان کے درمیان مختلف گروہ ہیں۔ ممکن ہے بعض کے لیے ایک ہزار سال کے برابر ہو۔ اور وقت کا دراز و مختصر ہونا۔ شدت و بے چینی اور عیش و آرام میں مختلف ہونا، مشہور و معروف ہے۔

سورۂ السجدہ کی جس آیت میں ایک ہزار سال کا دن بیان کیا گیا ہے، اس کی ایک توجیہہ تفسیر مظہری میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اس آیت میں جس دن کا ذکر ہے وہ دنیا ہی کے دنوں کا ایک دن ہے، اس میں جبریلؑ اور فرشتوں کا آسمان سے زمین پر آنا پھر زمین سے آسمان پر واپس جانا اتنی بڑی مسافت کو طے کرتا ہے کہ انسان اگر طے کرتا تو اس کو ایک ہزار سال لگتے کیونکہ احادیث میں آیا ہے کہ آسمان سے زمین تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اس طرح پانچ سو سال اوپر سے نیچے آنے کے اور پانچ سو واپس جانے کے، یہ کل ایک ہزار سال انسانی چال کے اعتبار سے ہیں۔ بالفرض اگر انسان اس مسافت کو طے کرتا تو آنے اور جانے میں ایک ہزار سال لگ جاتے۔ اگرچہ فرشتے اس مسافت کو بہت ہی مختصر وقت میں طے کر لیتے ہیں۔ تو سورۂ سجدہ میں دنیا ہی کے دنوں میں سے ایک دن کا بیان ہوا اور سورۂ معارف میں قیامت کے دن کا بیان ہے جو ایام دنیا سے بہت بڑا ہوگا اور اس کی درازی اور کوتاہی مختلف لوگوں پر اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے مختلف محسوس ہوگی۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (19 تا 35)

ھ	ل	ع

(س) هُلْعًا گھبرانا۔ مشکل میں صبر نہ کرنا۔ بے صبرا ہونا۔

هُلُوْعٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بہت گھبرانے والا۔ ذرا بھی صبر نہ کرنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔19۔

ترکیب

(آیات۔19 تا 21) هَلُوْعًا۔ جَزُوْعًا۔ مَنُوْعًا، یہ تینوں فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغے ہیں اور حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں۔ (آیت۔22) اصول یہ ہے کہ جمع میں سے واحد کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن واحد میں سے جمع کو مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اس آیت میں اَلْمُصَلِّيْنَ جمع ہے جس کو اَلْاِنْسَانَ میں سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اَلْاِنْسَانَ پر لام تعریف نہیں بلکہ لامِ جنس ہے۔ (آیت۔28) اٰمِنَ، یَاْمَنُ کے معروف معنی ہیں ''امن میں ہونا''۔ اس معنی میں یہ فعل لازم ہے جس کا مفعول مَاْمُوْنٌ نہیں آتا۔ لیکن نوٹ کریں کہ آیت۔2/ البقرۃ:3) کی لغت میں ہم بتا چکے ہیں کہ اس کے دوسرے معنی ''بھروسہ کرنا۔ اعتبار کرنا'' بھی ہیں۔ اس معنی میں یہ متعدی ہے اور مَاْمُوْنٌ کا لفظ اسی معنیٰ میں آتا ہے۔ (آیت۔35) جَنّٰتٍ حالت جر میں ہے۔ مُكْرَمُوْنَ اگر جَنّٰتٍ کی صفت ہوتا تو صیغہ مؤنث کا ہوتا اور حالتِ جرّ میں ہوتا لیکن یہ حالت رفع میں آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اُولٰٓئِكَ کی خبر ہے۔

ترجمہ

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ	هَلُوْعًا ﴿19﴾	اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ	جَزُوْعًا ﴿20﴾
بیشک تمام انسان پیدا کیے گئے	بڑے بے صبرے	جب کبھی چھوتی ہے کسی کو برائی	تو واویلا کرنے والا ہے

وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ	مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾	اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾
اور جب کبھی چھوتی ہے کسی کو بھلائی	تو بہت کنجوسی کرنے والا ہے	سوائے ان نماز پڑھنے والوں کے

الَّذِيْنَ	هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ	دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾	وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ	حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾
جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی نماز پر	ہمیشہ (متوجہ) رہنے والے ہیں	اور وہ لوگ جن کے مالوں میں	ایک معلوم (مقرر کردہ) حق ہے

لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾	وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ	بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۲۶﴾
مانگنے والے اور محروم کے لیے	اور وہ لوگ جو تصدیق کرتے ہیں	بدلے کے دن کی

وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ	مُّشْفِقُوْنَ ﴿۲۷﴾	اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ
اور وہ جو ہیں کہ وہ اپنے رب کے عذاب سے	ڈرنے والے ہیں	بیشک ان کے رب کا عذاب

غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾	وَالَّذِيْنَ	هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ	حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾	اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ
بھروسہ کیا ہوا (کے قابل) نہیں ہے	اور وہ جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی	حفاظت کرنے والے ہیں	سوائے اپنی بیویوں کے

اَوْ مَا مَلَكَتْ	اَيْمَانُهُمْ	فَاِنَّهُمْ	غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۳۰﴾	فَمَنِ ابْتَغٰى
یا جن کے مالک ہوئے	ان کے داہنے ہاتھ	تو بیشک وہ لوگ	ملامت کیے ہوئے نہیں ہیں	پھر جس نے جستجو کی

وَرَآءَ ذٰلِكَ	فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾	وَالَّذِيْنَ	هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ
اس کے علاوہ کی	تو وہ لوگ ہی حد سے بڑھنے والے ہیں	اور وہ جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی امانتوں کی

وَعَهْدِهِمْ	رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾	وَالَّذِيْنَ	هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ	قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾
اور اپنے قول و قرار کی	نگرانی کرنے والے ہیں	اور وہ جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی گواہیوں پر	ڈٹے رہنے والے ہیں

وَالَّذِيْنَ	هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ	يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾	اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ	مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾
اور وہ جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی نماز پر	مسلسل پہرہ دیتے ہیں	وہ لوگ باغوں میں	عزت دیئے ہوئے ہوں گے

نوٹ: 1

جس بات کو ہم اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں کہ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے کہ انسان ایسا پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں بکثرت مواقع پر نوع انسان کی عام اخلاقی کمزوریوں کا ذکر کرنے کے بعد ایمان لانے والے اور راہ راست اختیار کرنے والے لوگوں کو ان سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی مضمون آگے کی آیات میں بھی آرہا ہے۔ اس سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ پیدائشی کمزوریاں ایسی نہیں ہیں کہ ان کو تبدیل نہ کیا جا سکے۔ بلکہ انسان اگر خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کو قبول کر کے اپنے نفس کی اصلاح کی کوشش کرے تو وہ ان کو دور کر سکتا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو متضاد داعیات کی کشمکش میں پیدا کر کے اس سے یہ چاہا ہے کہ وہ خدا کے احکام کے مطابق جن کی تعلیم اس کو نبیوں کی ذریعہ سے دی گئی ہے، ان کے اندر توازن اور ہم آہنگی پیدا کرے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے قوانین کا تابع بنائے۔ اس

امتحان میں کامیابی پر ہی انسان کی تمام اُخری سعادت کا انحصار ہے۔ اختیار کا شرف بھی اس کو اس امتحان کے لیے عطا ہوا ہے۔ 1892 یہ امتحان مقصود نہ ہوتا تو انسان کو اختیار کے شرف سے مشرف کرنے کے کوئی معنی نہ ہوتے اور اس کو دوسری مخلوقات پر برتری حاصل کرنے کی بھی کوئی وجہ نہ ہوتی۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

زیر مطالعہ آیات ہمہ جہت (Multi Dimentional) ہیں۔ ان کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے آپ کو تفاسیر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہماری زیادہ تر توجہ آیات کے اس پہلو پر مرتکز رہے گی جس کا تعلق بے صبری کے علاج سے یا جدید اصطلاح میں جذباتی بلوغت کے حصول سے ہے۔ کسی شخص کو اپنے جذبات پر جتنا کنٹرول حاصل ہے، اتنی ہی جذباتی بلوغت اس نے حاصل کر لی ہے اور کوئی شخص جس حد تک اپنے جذبات کے قابو میں ہے، اتنا ہی وہ جذباتی لحاظ سے نابالغ ہے۔ اب نوٹ کریں کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ جسمانی، ذہنی اور جذباتی، تینوں لحاظ سے نابالغ ہوتا ہے۔ پھر جسمانی اور ذہنی بلوغت حاصل کرنے میں جسم کے قدرتی نظام اور انسانی کوشش، دونوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ لیکن جب انسان سوچنے سمجھنے اور نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے تو اس کے بعد جذباتی بلوغت حاصل کرنے کا انحصار انسانی کوشش پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسمانی بلوغت تقریباً ہر شخص کو پندرہ سال کے لگ بھگ حاصل ہو جاتی ہے۔ ذہنی بلوغت کوئی شخص جتنی حاصل کر سکتا ہے، وہ تقریباً چالیس سال کی عمر تک حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن جذباتی بلوغت کے لیے نہ تو عمر کی کوئی قید ہے اور نہ ہی یہ ہر شخص کو نصیب ہوتی ہے۔ کچھ لوگ کم عمری میں ہی جذباتی لحاظ سے بالغ ہو جاتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ اس کے بغیر ہی زندگی گزار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جذباتی بلوغت کا تقریباً کل کا کل انحصار انسان کی اپنی کوشش اور مشق پر ہے۔

اس ضمن میں پہلے یہ سمجھ لیں کہ ''آخروی سعادت'' کے ساتھ ساتھ ہماری اس دنیا کی زندگی میں جذباتی بلوغت کی کیا اہمیت ہے۔ ماہرین نفسیات اب اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ ذہانت کے ٹیسٹ (I.Q. Test) میں کسی کا زیادہ نمبر حاصل کر لینا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ ایسا شخص عملی زندگی میں بھی کامیاب رہے گا۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ زندگی کی کامیابی میں ذہانت کا حصہ صرف بیس فیصد ہے، جبکہ اسی فیصد انحصار دیگر عوامل پر ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم عامل کو جذباتی ذہانت (Emotional) کہا گیا ہے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ، مئی ۱۹۹۶ء)۔ اس اہمیت کے پیش نظر ہم جذبات پر کنٹرول حاصل کرنے کے طریقے آیات زیر مطالعہ سے سیکھنے کی کوشش کریں گے۔

جذباتی بلوغت حاصل کرنے کے لیے ان آیات میں جن صفات کا ذکر ہے، ان کی ابتداء بھی نماز کے ذکر سے ہوتی ہے اور ان کا اختتام بھی نماز کے ذکر پر ہوا ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ''نماز ہی سے تمام نیکیاں نشوونما بھی پاتی ہیں اور وہی اپنے حصار میں ان کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ اگر نماز وجود میں نہ آئے تو دوسری نیکیاں بھی وجود میں نہیں آتیں۔'' (تدبر قرآن، ج ۵، ص ۳۰۰)۔ اس کورس، جینے کا سلیقہ حصہ اول میں نماز میں عمل خود تجویزی (Self Suggestion) کے نظام اور انسانی عمل پر اس کے اثرات کے متعلق جو کچھ آپ نے پڑھا ہے، اسے ذہن میں تازہ کر لیں تو پر آپ اس حقیقت کو قبول کر لیں گے کہ نماز تمام اچھی صلاحیتوں کی نرسری ہے۔ اب غور کریں کہ اس آیت میں پہلی صفت کے طور پر جو نماز کا ذکر آیا ہے، اس میں الفاظ کی بندش بہت معنی خیز ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جذباتی

بلوغت حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھنی چاہیے۔ نہ ہی یہ فرمایا کہ جو لوگ نماز پڑھتے ہیں وہ اس نقص سے مستثنیٰ ہو جاتے ہیں بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اس سے ایسے نمازی مستثنیٰ ہیں جو اپنی نماز پر ''دائم'' ہوتے ہیں۔ ''حضرت عتبہ بن عامرؓ سے نماز میں دائم رہنے کا مطلب پوچھا گیا کہ کیا اس کی مراد یہ ہے کہ جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ نہیں یہ مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ جو اول سے آخر تک اپنی نماز کی طرف متوجہ رہے''۔ (معارف القرآن)۔

اب دیکھیں ایک نمازی دن میں پانچ مرتبہ اور نماز کی ہر رکعت میں جب یہ کوشش کرتا ہے کہ غیر متعلق خیالات کو ذہن سے نکال کر وہ اپنی توجہ کو نماز پر مرکوز رکھے تو اس مسلسل مشق کی وجہ سے اس کی دو صلاحیتیں اُجاگر ہو کر پختہ ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ذہن میں غیر متعلق یا ناپسندیدہ خیالات کی موجودگی کا احساس ہو جانا۔ دوسرے یہ استعداد حاصل ہو جانا کہ انسان جس خیال کو چاہے ذہن سے جھٹک دے اور جس خیال کو چاہے ذہن میں رہنے دے۔ نماز میں یہ صلاحیتیں حاصل کر لینے کے بعد زندگی کے معاملات میں انہیں استعمال کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ اب یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ جذبات پر کنٹرول حاصل کرنے کی یہ شاہ کلید (Master Key) ہے، کیونکہ جیسے خیالات انسان کے ذہن میں ہوتے ہیں ویسے ہی جذبات اس کے اندر پروان چڑھتے ہیں۔

اس ضمن میں دوسری صفت یہ بیان ہوئی کہ سائل اور محروم کا حق ادا کرتے ہیں۔ اب نوٹ کریں کہ رزق کی مختلف اقسام میں سب سے قوی محبت مال کی محبت ہے۔ انفاق سے اس جذبہ کو کنٹرول کرنے کی مشق ہوتی ہے۔ اس پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد زندگی کے معاملات میں دیگر محبتوں اور رغبتوں پر کنٹرول حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

خیالات اور جذبات پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے جو طریقۂ کار اب تک سامنے آیا ہے اس پر عمل کرتے ہوئے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن خیالات کو غلط سمجھ کر ذہن سے نکالا جائے اور کن کو پروان چڑھایا جائے۔ اس سلسلہ میں درست فیصلہ کرنے میں، اصولی طور پر تو انسان کو کوئی مشکل پیش نہیں آنی چاہیے کیونکہ نیکی اور بدی کا شعور انسان کی فطرت میں ودیعت کر کے اسے دنیا کی امتحان گاہ میں بھیجا جاتا ہے۔ (سورۃ الشّمس۔8) لیکن یہاں آ کر اس کی فطرت پر خواہشات اور مفادات کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ انسان بدلے کے دن یعنی آخرت کے حساب کتاب کے یقین اور اللہ کے عذاب کے خوف کے ساتھ غور و فکر کرے تو پھر یہ پردے ہٹ جائیں گے اور اس کی فطرت اس کی رہنمائی کرے گی۔ پھر اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہو گا کہ کون سے خیالات اور جذبات پسندیدہ ہیں اور کون سے ناپسندیدہ ہیں۔

اس کے بعد بتایا گیا کہ بے صبری کی کمزوری سے مستثنیٰ لوگوں کی ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ جنس کے معاملہ میں وہ آیا نظم وضبط (Sex Discipline) کے پابند ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام انسانی جذبوں میں جنس کا جذبہ سب سے زیادہ پرکشش ہے۔ اس لیے جو شخص اس کو کنٹرول کر لے اس کے لیے باقی جذبوں کو کنٹرول کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ چنانچہ اس ضمن میں سب سے زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ جب بھی ذہن میں کوئی ایسا خیال آئے جو ایسے جنسی جذبے کو بیدار کرے جس کی اجازت نہیں ہے، تو اسے لازماً ذہن سے جھٹک کر ذہن کو دوسرے خیالات میں مصروف کرنے کی کوشش کرے۔ اس کوشش میں کامیابی کی استعداد حاصل کیے بغیر جنسی نظم وضبط کی پابندی کرنا بہت مشکل ہے۔

اس کے بعد اگلی صفت یہ بیان ہوئی کہ بے صبری سے مستثنیٰ لوگ اپنی امانتوں اور عہد کا پاس کرتے ہیں۔ اس میں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ واحد لفظ امانت کے بجائے اس کی جمع امانات استعمال کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امانت کی مختلف اقسام ہیں اور یہ لوگ ہر قسم کی امانت کا پاس کرتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ہمیں حواسِ خمسہ، عقل اور تفقہ کی جو صلاحیتیں دی ہیں، وہ سب امانت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب واپس مانگتا ہے تو دینا پڑتا ہے۔ اس لیے واپس نہ کرنے والی خیانت کی تو ہمیں قدرت ہی نہیں ہے۔ البتہ انہیں استعمال کرنے کی اجازت کچھ حدود و قیود کے ساتھ ملی ہے۔ جس نے ان کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں استعمال کیا اس نے امانت کا حق ادا کر دیا۔ جس نے ان کا لحاظ نہیں رکھا اس نے خیانت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں وارننگ دے دی ہے کہ ان سب صلاحیتوں (کے استعمال) کے متعلق ہم سے پوچھا جائے گا۔

(سورۂ بنی اسرائیل۔:36)۔ اس کے علاوہ ہمارے تمام مال و اسباب بھی اس پہلو سے امانت ہیں کہ انہیں حاصل کرنے کی بھی اور انہیں استعمال کرنے کی اجازت بھی حدود و قیود کے ساتھ ملی ہے۔ ان کے متعلق بھی قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔ (سورۂ تکاثر۔8) اب یہ بات بہت واضح ہے کہ جذبات پر کنٹرل حاصل کیے بغیر ان امانتوں کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔

اسی طرح عہد و پیمان میں وہ سارے معاہدے شامل ہیں جو انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان، انسان اور انسان کے درمیان یا قوم اور قوم کی درمیان استوار کیے گئے ہوں۔ معاہدے تحریری بھی ہوتے ہیں اور زبانی بھی، لیکن بہت سے معاہدے صرف Implied ہوتے ہیں جیسے والدین اور اولاد، استاد اور شاگرد وغیرہ کے حقوق و فرائض۔ اسی طرح اگلی آیت میں شہادت (گواہی) کے بجائے جمع کا صیغہ شہادات استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ شہادت کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہر قسم کی شہادت کو قائم رکھنا واجب ہے۔ اس میں توحید و رسالت کی گواہی (کلمۂ شہادت) بھی شامل ہے، حدودِ شرعیہ کی شہادت بھی اور لوگوں کے باہمی معاملات جو کسی کے سامنے ہوئے ہوں، ان کی شہادت بھی۔ ان شہادتوں کو چھپانا اور ان میں کمی بیشی کرنا حرام ہے۔ ان کو صحیح صحیح قائم رکھنا اس آیت کی رو سے فرض ہے۔ (معارف القران)۔

رسول اللہ ﷺ نے مختلف پیرائے میں ہم کو جذباتی بلوغت حاصل کرنے کی تلقین کی ہے' ہم صرف دو ارشادات نقل کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کے طرزِ عمل کا تابع بنا کر مت رکھو۔ یہ کہنا غلط ہے۔ اگر لوگ بھلائی کریں گے تو ہم بھلائی کریں گے اور لوگ ظلم کریں گے تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ تم لوگ اپنے نفس کو ایک قاعدے کا پابند بناؤ۔ اگر لوگ نیکی کریں تو تم لوگ نیکی کرو اور اگر لوگ بدسلوکی کریں تو تم لوگ ظلم نہ کرو۔ (تفہیم القرآن۔ ج2،ص456) اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو React کرنے سے منع کیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے۔ ان میں سے چار باتیں آپ ﷺ نے یہ فرمائیں کہ میں خواہ کسی سے خوش ہوں یا ناراض، ہر حالت میں انصاف کی بات کہوں۔ جو میرا حق مارے میں اس کا حق ادا کروں۔ جو مجھے محروم کرے میں اسے عطا کروں۔ اور جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو تجھ سے خیانت کرے، تو اس سے خیانت نہ کر۔ (تفہیم القرآن۔ ج2،ص456)۔ ایک طرف یہ اسی ہدایت کی تشریح ہے کہ تم لوگ اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کے طرزِ عمل کا تابع مت بناؤ۔ دوسری طرف یہ ایک بالغ شخصیت کا کردار ہے جس کا کامل نمونہ نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس ہے۔

بات ختم کرنے سے پہلے ذہن میں یہ حقیقت واضح کر لیں کہ جسمانی اور ذہنی بلوغت سے شخصیت (Personality) بالغ نہیں ہوتی۔ بالغ شخصیت (Matured Personality) کے لیے جذباتی بلوغت ضروری ہے۔ (جینے کا سلیقہ حصہ چہارم صفحات 25 تا 37 سے ماخوذ)۔

آیت نمبر (36 تا 44)

1892

ع ز و

(ن) عَزْوًا منسوب ہونا۔ اپنے آپ کو دوسرے کی طرف منسوب کرنا۔ خواہ یہ سچ ہو یا جھوٹ۔
عِزَةٌ (یہ دراصل عِزَوٌ تھا۔ اس کی واؤ گری ہوئی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ لام کلمہ کا حرف علت کسی وجہ سے گراتے ہیں تو اس کی جگہ گول تا لگا دیتے ہیں۔ اس طرح یہ عِزَةٌ استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع عِزُوْن۔ عِزِیْنَ، آتی ہے)۔ اس کے معنی ہیں گروہ یا جماعت۔ لیکن یہ ایسی جماعت کے لیے آتا ہے جس کے افراد بلحاظ نسبت یا بلحاظ مدد و تعاون ایک دوسرے کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ زیر مطالعہ آیت۔ 37

و ف ض

X X ثلاثی مجرد سے فعل نہیں آتا۔

(افعال) اِیْفَاضًا تیز چلنا، دوڑنا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 44۔

ترکیب

(آیت۔ 36) فَمَالِ میں جو لام ہے یہ حروف جارّہ والا لام ہے اور اس کا تعلق فَمَا سے نہیں ہے بلکہ اَلَّذِیْنَ سے ہے۔ اصل عبارت یوں ہے۔ فَمَا لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔ چونکہ حرفِ جار لِ الگ لکھا گیا ہے اس لیے اَلَّذِیْنَ کا حمزہ الوصل واپس آ گیا ہے۔ اس آیت میں اس کو اس طرح لکھنا قرآن مجید کا مخصوص املا ہے۔ مُهْطِعِیْنَ اسم الفاعل ہے اور حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ (آیت۔ 42)۔ فَذَرْهُمْ میں ذَرْ فعل امر ہے۔ اس کا جواب امر ہونے کی وجہ سے یَخُوْضُوْا اور یَلْعَبُوْا مضارع مجزوم ہیں، جبکہ حَتّٰی کی وجہ سے یُلٰقُوْا مضارع منصوب ہے۔ (آیت۔ 44) خَاشِعَةً اسم الفاعل ہے اور حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔

ترجمہ

فَمَا	لِالَّذِیْنَ كَفَرُوْا	قِبَلَكَ	مُهْطِعِیْنَ ﴿۳۶﴾	عَنِ الْیَمِیْنِ
تو کیا ہے	ان کے لیے جنہوں نے انکار کیا	(آتے ہیں) آپؐ کی طرف	لپکنے (چڑھائی کرنے) والے ہوتے ہوئے	دائیں سے

وَعَنِ الشِّمَالِ	عِزِیْنَ ﴿۳۷﴾	اَیَطْمَعُ	كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ	اَنْ یُّدْخَلَ
اور بائیں سے	گروہ در گروہ ہوتے ہوئے	کیا امید رکھتا ہے	ہر ایک شخص ان میں سے	کہ وہ داخل کیا جائے گا

جَنَّةَ نَعِیْمٍ ﴿۳۸﴾	كَلَّا ؕ	اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ	مِّمَّا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾	فَلَاۤ
سدا بہاری کے باغ میں	ہرگز نہیں	بیشک ہم نے پیدا کیا ان کو	اس سے جسے یہ لوگ جانتے ہیں	پس نہیں!

اُقْسِمُ	بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ	اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾	عَلٰۤی اَنْ نُّبَدِّلَ
میں قسم کھاتا ہوں	مشرقوں اور مغربوں کے رب کی	بیشک ہم یقیناً قدرت رکھنے والے ہیں	اس پر کہ ہم تبدیل کر دیں (ان کو)

خَیْرًا مِّنْهُمْ ۙ	وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ﴿۴۱﴾	فَذَرْهُمْ	یَخُوْضُوْا وَیَلْعَبُوْا
ان سے بہتر سے	اور ہم عاجز کیے ہوئے نہیں ہیں	تو آپ چھوڑ دیں ان کو	وہ بے پر کی اڑائیں اور کھیلیں کود یں

حَتّٰى يُلٰقُوْا	يَوْمَهُمُ الَّذِىْ	يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾
یہاں تک کہ وہ ملاقات کریں	اپنے اس دن سے جس کا	ان سے وعدہ کیا جاتا ہے

يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ	مِنَ الْاَجْدَاثِ	سِرَاعًا	كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ
جس دن وہ لوگ نکلیں گے	قبروں سے	ایک دوسرے پر جلدی کرتے ہوئے	جیسے کہ وہ لوگ کسی استھان کی طرف

يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾	خَاشِعَةً	اَبْصَارُهُمْ	تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ
بھاگتے ہوں گے	جھکنے والی ہوں گی	ان کی آنکھیں	چھا جائے گی ان پر ذلت

ذٰلِكَ الْيَوْمُ	الَّذِىْ	كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾
یہ دن	وہ ہے جس کا	ان سے وعدہ کیا جاتا تھا

نوٹ: 1

سابقہ آیات۔ 19 تا 35۔ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس قسم کے لوگوں کو جنت میں جگہ ملے گی۔ قرآن کا یہ فیصلہ سن کر قریش کے مغروروں کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ وہ یہ کس طرح سن سکتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے مفلوک الحال ساتھی تو جنت میں براجمان ہوں گے اور تمام عزتوں اور عظمتوں کے وارث، سادات قریش دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ اس غصہ میں وہ ٹولیاں بنا بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تردید توہین کے لیے دائیں بائیں سے آپؐ پل پڑتے۔ زیر مطالعہ آیات میں اسی صورتِ حال کی تصویر اور ان مغروروں کی خود باختگی پر اظہار تعجب ہے۔ (تدبر قرآن)۔

آیت۔ 38۔ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی جنت تو ان لوگوں کے لیے ہے جن کی صفات ابھی ابھی بیان کی جا چکی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ جو حق بات سننا تک گوارہ نہیں کرتے اور حق کی آواز کو دبانے کے لیے دوڑے چلے آ رہے ہیں، جنت کے امیدوار ہو سکتے ہیں؟ کیا خدا نے اپنی جنت ایسے ہی لوگوں کے لیے بنائی ہے؟ اس مقام پر سورۃ القلم کی آیات۔ 34 تا 41 پیش نظر رکھنی چاہئیں جن میں کفار مکہ کو اُن کی اِس بات کا جواب دیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

آیت۔ 39۔ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ مضمونِ سابق کے ساتھ اس کا تعلق مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس مادے سے یہ لوگ بنے ہیں اس کے لحاظ سے تو سب انسان یکساں ہیں۔ اگر وہ مادہ ہی انسان کے جنت میں جانے کا سبب ہو تو نیک و بد، ظالم و عادل، مجرم اور بے گناہ، سب ہی کو جنت میں جانا چاہیے۔ لیکن معمولی عقل ہی یہ فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ جنت کا استحقاق انسان کے مادۂ تخلیق کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے اوصاف کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔ اور اگر اس فقرے کو بعد کے مضمون کی تمہید سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہمارے عذاب سے محفوظ سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ ہم ان کو دنیا میں بھی جب چاہیں عذاب دے سکتے ہیں اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے بھی جب چاہیں اٹھا سکتے ہیں۔ یہ خود جانتے ہیں کہ نطفہ کی ایک حقیر سی بوند سے ان کی تخلیق کی ابتداء کر کے ہم نے ان کو چلتا پھرتا انسان بنایا ہے۔ اگر اپنی اس تخلیق پر یہ غور کرتے تو انہیں کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہوتی کہ ہم انہیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔40۔ میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی قسم کھائی ہے۔ مشرقوں اور مغربوں کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ سال کے دوران میں سورج ہر روز ایک نئے زاویہ پر غروب ہوتا ہے۔ نیز زمین کے مختلف حصوں پر سورج الگ الگ اوقات میں پے در پے طلوع اور غروب ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان اعتبارات سے مشرق اور مغرب ایک نہیں ہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ ایک دوسرے اعتبار سے شمال اور جنوب کے مقابلے میں ایک جنوب مشرق ہے اور دوسری جہت مغرب ہے۔ اس بنا پر سورۃ شعراء کی آیت۔28 اور سورہ مزمل کی آیت۔19 میں رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک اور لحاظ سے زمین کے دو مشرق اور دو مغرب ہیں کیونکہ جب زمین کے ایک نصف کرے پر سورج غروب ہوتا ہے تو دوسرے پر طلوع ہوتا ہے۔ اس بنا پر سورۂ رحمن کی آیت۔17 رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿١٧﴾ کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ (تفہیم القرآن)۔

6892

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ 6940

سورۃ نوح (71)

آیت نمبر (1 تا 14)

ترکیب

(آیت۔3۔4) اُعۡبُدُوۡا، اِتَّقُوۡا، اَطِیۡعُوۡا، فعل امر ہیں۔ ان کا جواب امر ہونے کی وجہ سے یَغۡفِرۡ اور یُؤَخِّرۡ مجزوم ہوئے ہیں۔ (آیت۔5) لَیۡلًا اور نَہَارًا ظرف ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔ (آیت۔6) لَمۡ یَزِدۡ کا فاعل دُعَآءِیۡ ہے اور اس کا مفعول ھُمۡ کی ضمیر ہے۔ جبکہ فِرَارًا کی نصب تمیز ہونے کی وجہ سے ہے۔ (آیت۔7) کُلَّمَا شرط ہے اس لیے اس کے آگے آنے والے افعال ماضی کا ترجمہ حال میں ہوگا۔ اِسۡتِکۡبَارًا کی نصب مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے ہے۔ (آیت۔8) جِہَارًا حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ (آیت۔9) اِسۡرَارًا مفعول مطلق ہے۔ (آیت۔10) کَانَ کی خبر ہونے کی وجہ سے غَفَّارًا حالتِ نصب میں ہے۔ کَانَ کا ترجمہ حال میں ہوگا کیونکہ یہ آفاقی صداقت کا بیان ہے (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:49، نوٹ۔2) (آیت۔11) یُرۡسِلِ میں لام کی کسرہ بتا رہی ہے کہ یہ مضارع مجزوم ہے اور سابقہ آیت میں فعل امر اِسۡتَغۡفِرُوۡا کا جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہوا ہے۔ اس کا مفعول اَلسَّمَآءَ ہے اور مِدۡرَارًا حال ہے۔ (آیت۔12) یُمۡدِدۡ اور یَجۡعَلۡ بھی سابقہ فعل امر اِسۡتَغۡفِرُوۡا کا جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ جبکہ جَنّٰتٍ اور اَنۡہٰرًا مفعول ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔ (آیت۔13) تَرۡجُوۡنَ کا مفعول وَقَارًا ہے۔ (آیت۔14) اَطۡوَارًا حال ہے۔

ترجمہ

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا	نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ	اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ	مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ
بیشک ہم نے بھیجا	نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف	کہ آپؑ خبردار کریں اپنی قوم کو	اس سے پہلے کہ پہنچے ان کے پاس

عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱﴾	قَالَ یٰقَوۡمِ	اِنِّیۡ لَکُمۡ	نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۲﴾ۙ	اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ
ایک دردناک عذاب	انہوںؑ نے کہا اے میری قوم	بیشک میں تمہارے لیے	ایک واضح خبردار کرنے والا ہوں	کہ تم لوگ بندگی کرو اللہ کی

وَاتَّقُوۡہُ	وَاَطِیۡعُوۡنِ ﴿۳﴾ۙ	یَغۡفِرۡ لَکُمۡ
اور تقویٰ اختیار کرو اس کا	اور اطاعت کرو میری	تو وہ بخش دے گا تمہارے لیے

مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ	وَیُؤَخِّرۡکُمۡ	اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ
تمہارے گناہوں میں سے	اور وہ پیچھے کرے گا (مہلت دے گا) تم کو	ایک مقررہ مدت تک

اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ	اِذَا جَآءَ	لَا یُؤَخَّرُ ۘ	لَوۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴﴾	قَالَ رَبِّ
بیشک اللہ کا (مقرر کردہ) وقت	جب آ جائے	تو وہ مؤخر نہیں کیا جاتا	کاش تم لوگ جانتے	انہوںؑ نے کہا اے میرے رب

اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ	لَیۡلًا وَّ نَہَارًا ﴿۵﴾ۙ	فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ	دُعَآءِیۡۤ	اِلَّا فِرَارًا ﴿۶﴾
بیشک میں نے بلایا اپنی قوم کو	رات میں اور دن میں	تو زیادہ نہیں کیا ان کو	میرے بلانے نے	سوائے بھاگنے کے

وَاِنِّیۡ کُلَّمَا	دَعَوۡتُہُمۡ	لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ	جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ
اور بیشک میں نے جب بھی	بلایا ان کو	تاکہ تو بخش دے ان کے لیے (ان کے گناہ)	تو وہ رکھ لیتے ہیں اپنی انگلیاں

فِيْٓ اٰذَانِهِمْ	وَاسْتَغْشَوْا	ثِيَابَهُمْ	وَاَصَرُّوْا
اپنے کانوں میں	اور خود کو ڈھانپتے ہیں	اپنے کپڑوں سے	اور اڑ جاتے ہیں

وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ﴿۷﴾	ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ	جِهَارًا ۙ﴿۸﴾
اور بڑائی چاہتے ہیں جیسے بڑائی کا حق ہے	پھر بیشک میں نے بلایا ان کو	آواز بلند کرتے ہوئے

ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ	وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ	اِسْرَارًا ۙ﴿۹﴾	فَقُلْتُ
پھر بیشک میں نے اعلان کیا ان کے لیے	اور میں نے چپکے سے کہا ان سے	جیسے چپکے سے کہتے ہیں	تو میں نے کہا

اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ	اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ﴿۱۰﴾	يُّرْسِلِ
تم لوگ مغفرت مانگو اپنے رب سے	بیشک وہ بہت بخشنے والا ہے	(مغفرت مانگو گے) تو وہ بھیجے گا

السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ	مِّدْرَارًا ۙ﴿۱۱﴾	وَّيُمْدِدْكُمْ	بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ
آسمان کو تم لوگوں پر	لگاتار برسنے والا ہوتے ہوئے	اور وہ اعانت کرے گا تمہاری	اموال (معیشت) سے اور بیٹوں (افرادی قوت) سے

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ	وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ؕ﴿۱۲﴾	مَا لَكُمْ
اور وہ بنائے گا تمہارے لیے کچھ باغات	اور بنائے گا تمہارے لیے کچھ نہریں	تم لوگوں کو کیا ہوا ہے

لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ	وَقَارًا ۚ﴿۱۳﴾	وَقَدْ خَلَقَكُمْ	اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾
(کہ) تم لوگ امید نہیں رکھتے اللہ سے	کسی عظمت کی	حالانکہ اس نے پیدا کیا ہے تم لوگوں کو	مختلف حالتوں پر ہوتے ہوئے

نوٹ:1

سابقہ سورہ۔ المعارج۔ میں عآب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب اور پیغمبر ﷺ کو صبر و انتظار کی تلقین ہے۔ اس سورہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے مراحل، ان کے طویل صبر و انتظار اور بالآخر ان کی قوم کے مبتلائے عذاب ہونے کی سرگزشت اختصار کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور اس سے مقصود آنحضرت ﷺ اور آپؐ کی قوم کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھ دینا ہے جس میں آپؐ بھی دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو اپنی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے صبر و انتظار کے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ساتھ ہی آپؐ کی قوم بھی دیکھ لے کہ اللہ تعالیٰ جلد بازوں کو ان کی جلد بازی اور طنز و طعن کے باوجود ڈھیل دیتا ہے لیکن بالآخر پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو کوئی چھڑانے والا نہیں ہوتا۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔4۔ میں حضرت نوحؑ کی دعوت کے تین بنیادی ارکان بیان ہوتے ہیں، توحید، شریعت الٰہی کی پابندی اور رسول کی اطاعت۔ انہی تین ارکان پر تمام رسولوں کی دعوت مبنی رہی ہے۔ اس حوالہ سے آگے آیت۔4۔ میں فرمایا کہ اگر تم نے میری یہ تینوں باتیں مان لیں تو اللہ تعالیٰ تمہارے ان جرائم کو معاف کر دے گا جن کے سبب سے تم عذاب کے مستحق قرار پائے ہو اور ایک معین مدت تک کے لیے تم کو اس دنیا میں رہنے بسنے کی مہلت مل جائے گی۔ یہاں لفظ مِنْ اپنے معروف معنی یعنی تبعیض ہی کے لیے آیا ہے پوری بات گویا یوں ہے کہ اگر تم میری باتیں مان لوگے تو اللہ تمہارے وہ سارے گناہ معاف کر دے گا جو اب تک تم سے صادر ہوئے ہیں، یہ بات معلوم بھی ہے اور معقول بھی کہ کفر کے بعد ایمان کی زندگی اختیار کرنے سے آدمی کے وہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں جو کفر کی زندگی میں اس سے صادر ہوئے ہوتے ہیں۔ رہے وہ گناہ جن کا ارتکاب آدمی ایمان کی زندگی اختیار کرنے کے بعد کرتا ہے، تو ان کے معاف ہونے کے لیے ایک ضابطہ ہے جو سورۂ نساء کی آیت۔17۔ میں بیان ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے ''کچھ نہیں سوائے اس کے کہ توبہ (قبول کرنا) اللہ پر ان لوگوں کے لیے ہے جو برا کام

کرتے ہیں نادانی میں پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔تو یہ لوگ ہیں اللہ جن کی توبہ قبول کرتا ہے۔اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔'' اس آیت میں لفظ مِنْ اسی حقیقت کے اظہار کے لیے آیا ہے۔اگر یہ مِنْ یہاں نہ ہوتا تو آیت کے یہ معنی بھی نکل سکتے تھے کہ تمہارے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔کیونکہ کفر کے بعد ایمان صرف پچھلے گناہوں کو گرانے والا بنتا ہے، آگے کے گناہوں کا گرانے والا نہیں بنتا۔(تدبر قرآن)۔

حرف مِنْ اکثر تبعیض کے لیے آتا ہے۔اگر یہ معنی لیے جائیں تو مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے سے تمہارے وہ گناہ معاف ہو جائیں گے جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔کیونکہ حقوق العباد کی معافی کے لیے ایمان لانے کے بعد بھی یہ شرط ہے کہ جو حقوق ادائیگی کے قابل ہیں ان کو ادا کرے، جیسے مالی واجبات وغیرہ اور جو قابل ادائیگی نہیں، جیسے زبان یا ہاتھ سے کسی کو ایذا پہنچانا، تو ان کو معاف کرائے۔حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ ایمان لانے سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اس میں بھی حقوق العباد کی ادائیگی یا معافی شرط ہے۔(معارف القرآن)۔

نوٹ:3

وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى کا مطلب یہ ہے کہ تم ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس مدت تک دنیا میں مہلت دے گا جو تمہارے لیے مقرر ہے۔اس کا حاصل یہ ہوا کہ اگر ایمان نہ لائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ مدت مقررہ سے پہلے ہی تم پر عذاب لا کر ہلاک کر دے۔ معلوم ہوا کہ عمر کی مدت مقررہ میں بعض اوقات کوئی شرط ہوتی ہے کہ اس نے فلاں کام کر لیا تو اس کی عمر اتنی ہو گی اور نہ کیا تو اتنی کم کر دی جائے گی۔اللہ کی ناشکری سے عمر گھٹ جانا اور شکر گزاری سے عمر بڑھ جانا، اسی طرح بعض اعمال مثلاً والدین کی اطاعت و خدمت سے عمر میں ترقی ہونا جو احادیث سے ثابت ہے، اس کا یہی مطلب ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قضائے الٰہی کو کوئی چیز بجز دعا کے نہیں روک سکتی اور کسی کی عمر میں زیادتی بجز بر والدین کے نہیں ہو سکتی۔بر کے معنی ان کے ساتھ اچھا سلوک ہے اور اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ تقدیر معلق میں ان اعمال کی وجہ سے تبدیلی ہو سکتی ہے۔

اس کی تشریح تفسیر مظہری میں یہ ہے کہ تقدیر اور قضائے الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک مُبرم یعنی قطعی اور دوسری معلق یعنی جو کسی شرط پر معلق ہو۔قرآن کریم میں ان دونوں قسم کی قضا و تقدیر کا ذکر سورۃ الرعد کی آیت۔39۔میں ہے کہ اللہ تعالیٰ لوحِ محفوظ میں ترمیم و تبدیل کرتا رہتا ہے اور اللہ کے پاس اصل کتاب ہے۔اس سے مراد وہ کتاب ہے جس میں تقدیر مبرم لکھی ہوئی ہے۔(معارف القرآن)

نوٹ:4

آیت۔10 تا 12۔میں جو بات کہی گئی ہے کہ اللہ سے مغفرت کے طلبگار بنو تو اللہ تعالیٰ تمہیں معیشت اور افرادی قوت کی فراوانی عطا فرمائے گا، یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔مثلاً المائدہ۔66، الاعراف۔96، ھود۔3۔52، طٰہٰ۔124۔ان کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا سے بغاوت کی روش صرف آخرت میں ہی نہیں، دنیا میں بھی انسان کی زندگی تنگ کر دیتی ہے۔اس کے برعکس اگر کوئی قوم ایمان و تقویٰ اور احکام الٰہی کی اطاعت کا طریقہ اختیار کر لے تو یہ آخرت ہی میں نافع نہیں بلکہ دنیا میں بھی اس پر نعمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔قرآن مجید کی اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک مرتبہ قحط کے موقع پر حضرت عمرؓ بارش کی دعا کرنے کے لیے نکلے اور صرف استغفار پر اکتفا فرمایا۔لوگوں نے کہا کہ آپ نے بارش کے لیے تو دعا کی ہی نہیں۔آپؓ نے فرمایا کہ میں نے آسمان کے ان دروازوں کو کھٹکھٹا دیا ہے جہاں سے بارش نازل ہوتی ہے اور پھر سورۂ نوحؑ کی یہ آیات پڑھ کر لوگوں کو سنا دیں۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:5

آیت۔13۔14 کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی بڑائی سے امید رکھنا چاہیے کہ اس کی فرمانبرداری کرو گے تو تم کو عزت و وقار عنایت فرمائے گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی بڑائی کا اعتقاد کیوں نہیں رکھتے اور اس کی عظمت و جلال سے ڈرتے کیوں نہیں۔ (حالانکہ تمہارا اپنا وجود اس کی عظمت کی علامت کے طور پر کافی ہے)۔ ماں کے پیٹ میں تم نے طرح طرح کے رنگ بدلے۔ اور اصلی مادے سے لے کر موت تک آدمی کتنی پلٹیاں کھاتا ہے، کتنے اطوار و ادوار اور اتار چڑھاؤ سے گزرتا ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

آیت نمبر (15 تا 28)

ترکیب

(آیت۔16) فَعَلَ کے دو مفعول آتے ہیں۔ اس لحاظ سے نُوْرًا اور سِرَاجًا کو اس کا مفعول ثانی بھی مانا جا سکتا ہے اور علی الترتیب اَلْقَمَرَ اور الشَّمْسَ کا حال بھی مانا جا سکتا ہے۔ دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔ ہم انہیں حال ماننے کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔17) اَنْبَتَ باب افعال ہے۔ اس کا مصدر اِنْبَاتًا ہے، لیکن یہاں مفعول مطلق کے طور پر اِنْبَاتًا کے بجائے ثلاثی مجرد کا مصدر نَبَاتًا آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابواب مزید فیہ کے افعال کا مفعول مطلق اُسی باب کے مصدر سے بھی آ سکتا ہے اور ثلاثی مجرد کے مصدر سے بھی۔ (آیت۔19) یہاں بھی ہم بِسَاطًا کو جَعَلَ کا مفعول ثانی ماننے کے بجائے اسے اَلْاَرْضَ کا حال ماننے کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔21) لَمْ يَزِدْهُ کی ضمیر ہٗ دراصل مَنْ کی ضمیر عائد ہے۔ مَالُهٗ اور وَلَدُهٗ لَمْ يَزِدْ کے فاعل ہیں جبکہ خَسَارًا تمیز ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے، یہ بات ہم پڑھ چکے ہیں کہ مَنْ کا لفظ اصلاً واحد ہے لیکن یہ واحد، تثنیہ، جمع، مذکر مؤنث سب کے لیے آتا ہے۔ اس آیت میں مَنْ جمع کے معنی میں ہے، البتہ لفظی رعایت کے تحت مَالُهٗ اور وَلَدُهٗ کے ساتھ واحد ضمیریں آئی ہیں، جبکہ معنوی رعایت کے تحت آگے کی آیات میں مَكَرُوْا۔ قَالُوْا۔ قَدْ اَضَلُّوْا، سب جمع کے صیغے آئے ہیں۔ ان میں شامل هُمْ کی فاعلی ضمیریں اسی مَنْ کے لیے ہیں۔ کیونکہ نوحؑ کی قوم نے انؑ کی نافرمانی کرنے میں کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ قوم کے سرداروں کی پیروی کی تھی۔ (آیت۔26) دَيَّارٌ کا لفظ فَعَّالٌ کے وزن پر نہیں ہے۔ کیونکہ اس وزن پر لفظ دَوَّارٌ بنے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دراصل فَيْعَالٌ کے وزن پر ہے۔ اس وزن پر اصلی شکل دَيْوَارٌ بنتی ہے۔ پھر واؤ، یا میں تبدیل ہو کر سابقہ یا میں مدغم ہوتی ہے تو دَيَّارٌ استعمال ہوتا ہے۔

ترجمہ

اَلَمْ تَرَوْا	كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ	سَبْعَ سَمٰوٰتٍ	طِبَاقًا ﴿۱۵﴾	وَّجَعَلَ الْقَمَرَ
کیا تم لوگوں نے غور ہی نہیں کیا	کیسے پیدا کیا اللہ نے	سات آسمانوں کو	تہہ در تہہ ہوتے ہوئے	اور اس نے بنایا چاند کو

فِيْهِنَّ نُوْرًا	وَّجَعَلَ الشَّمْسَ	سِرَاجًا ﴿۱۶﴾
ان (آسمانوں) میں ایک نور ہوتے ہوئے	اور اس نے بنایا سورج کو	ایک چراغ ہوتے ہوئے

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ	مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾	ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ	فِيْهَا
اور اللہ نے اگایا تم لوگوں کو	زمین سے جیسے اگانے کا حق ہے	پھر وہ واپس لے جائے گا تم لوگوں کو	اس (زمین) میں

وَيُخْرِجُكُمْ	اِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾	وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ
اور وہ نکالے گا تم کو	جیسے نکالنے کا حق ہے	اور اللہ نے بنایا تمہارے لیے زمین کو

بِسَاطًا ﴿١٩﴾	لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا	سُبُلًا فِجَاجًا ﴿٢٠﴾ ع	قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ
ایک بچھونا ہوتے ہوئے	تاکہ تم لوگ چلو اس (زمین) میں سے	کشادہ راستوں پر	کہا نوحؑ نے اے میرے رب

اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ	وَاتَّبَعُوْا مَنْ	لَّمْ يَزِدْهُ	مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ
بیشک ان لوگوں نے نافرمانی کی میری	اور پیروی کی اُن (سرداروں) کی	زیادہ نہیں کیا جن کو	ان کے مال اور ان کی اولاد نے

اِلَّا خَسَارًا ﴿٢١﴾ ج	وَمَكَرُوْا	مَكْرًا كُبَّارًا ﴿٢٢﴾ ج
مگر بلحاظ خسارے کے	اور ان لوگوں (سرداروں) نے چال چلی	جیسے کوئی زبردست چال چلنے کا حق ہے

وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ	وَلَا تَذَرُنَّ	وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ
اور انہوں نے کہا تم لوگ ہرگز مت چھوڑنا اپنے خداؤں کو	اور تم لوگ ہرگز مت چھوڑنا	ودّ کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث کو

وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿٢٣﴾ ج	وَقَدْ اَضَلُّوْا	كَثِيْرًا ۚ
اور (نہ ہی) یعوق اور نسر کو	اور انہوں (سرداروں) نے گمراہ کیا ہے	بہتوں کو

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ	اِلَّا ضَلٰلًا ﴿٢٤﴾	مِمَّا
اور تو زیادہ مت کر ظلم کرنے والوں کو	مگر بلحاظ گمراہی کے	اس (سبب) سے جو

خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ	اُغْرِقُوْا	فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ	فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ
ان کی خطائیں تھیں	ان کو غرق کیا گیا	پھر ان کو داخل کیا گیا ایک آگ میں	پھر انہوں نے نہیں پایا اپنے لیے

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اَنْصَارًا ﴿٢٥﴾	وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ	لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ
اللہ کے علاوہ	کچھ (دوسرے) مدد کرنے والے	اور کہا نوحؑ نے اے میرے رب	تو مت چھوڑ زمین پر

مِنَ الْكٰفِرِيْنَ	دَيَّارًا ﴿٢٦﴾	اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ	يُضِلُّوْا عِبَادَكَ
کافروں میں سے (کسی کو)	رہتا بستا ہوا	بیشک اگر تو نے چھوڑا ان کو	تو وہ گمراہ کریں گے تیرے بندوں کو

وَلَا يَلِدُوْٓا	اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾	رَبِّ اغْفِرْ لِيْ	وَلِوَالِدَيَّ
اور نہیں جنیں گے	مگر نافرمانی کرنے والا بڑا ہی ناشکرا	اے میرے رب تو بخش دے میرے لیے	اور میرے والدین کے لیے

وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ	مُؤْمِنًا	وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ ۚ
اور اس کے لیے جو داخل ہوا میرے گھر میں	ایمان لانے والا ہوتے ہوئے	اور ایمان لانے والوں

وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ	وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ	اِلَّا تَبَارًا ﴿٢٨﴾ ع
اور ایمان لانے والیوں کے لیے (گناہوں کو)	اور تو زیادہ مت کر ظالموں کو	مگر بلحاظ بربادی کے

نوٹ: 1 آیات۔15۔16 میں آسمان اور اس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد آیات۔17۔18۔ میں زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔سب سے پہلے زمین کی سب سے اشرف مخلوق یعنی انسان کو لیا ہے۔فرمایا کہ اللہ نے تمہیں زمین سے اگایا اور اگانے کے بعد پھر اسی میں

تمہیں مرنے کے بعد لوٹا دیتا ہے۔ اور پھر اسی سے تمہیں ایک دن نکالے گا۔ یہ قرآن کی بلاغت کا اعجاز ہے کہ اس آیت میں جو دعویٰ ہے وہی اس دعوے کی نہایت واضح دلیل بھی ہے۔ اس کے مفہوم کو کھول دیجئے، تو بات یوں ہوگی کہ جس طرح زمین سے سبزہ اگتا ہے، اسی طرح اللہ نے تمہیں بھی اسی زمین سے اگایا ہے۔ اور جس طرح زمین سے اگنے والی چیزیں فنا ہو کر زمین میں مل جاتی ہیں، اسی طرح تم بھی مر کر زمین میں مٹی بن جاتے ہو۔ پھر جس طرح تم دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے فنا شدہ سبزوں کو از سر نو زندہ کر دیتا ہے اسی طرح جب چاہے گا تمہیں بھی بغیر کسی زحمت کے اٹھا کھڑا کرے گا۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔23۔ میں جن پانچ بتوں کا ذکر ہے ان کے متعلق امام بغوی نے نقل کیا ہے کہ یہ پانچوں دراصل اللہ کے نیک وصالح بندے تھے جو حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیانی زمانے میں گزرے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے معتقد اور پیروکار تھے اور عرصہ دراز تک لوگوں نے انہیں کے نقش قدم پر عبادت اور اللہ کے احکام کی اطاعت جاری رکھی۔ پھر شیطان نے ان کو سمجھایا کہ تم اپنے جن بزرگوں کی پیروی کرتے ہوئے عبادت کرتے ہو، اگر عبادت کے وقت ان کی تصویریں سامنے رکھ لیا کرو تو تمہاری عبادت بڑی مکمل ہو جائے گی اور تم کو خشوع و خضوع حاصل ہوگا۔ لوگ اس کے فریب میں آ گئے اور بزرگوں کے مجسمے بنا کر عبادت گاہ میں رکھنے لگے۔ مجسموں کو دیکھ کر بزرگوں کی یاد تازہ ہو جانے سے ایک خاص کیفیت محسوس کرنے لگے، یہاں تک کہ اسی حال میں یہ لوگ یکے بعد دیگرے مر گئے۔ جب نئی نسل نے ان کی جگہ لی تو شیطان نے ان کو یہ پڑھایا کہ تمہارے بزرگوں کے خدا اور معبود یہی بت تھے اور وہ انہی کی عبادت کرتے تھے۔ یہاں سے بت پرستی شروع ہوگئی۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔25۔ کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی خطاؤں، کفر و شرک کی وجہ سے پانی میں غرق کیے گئے تو آگ میں داخل ہو گئے۔ یہ متضاد عذاب کہ ڈوبے پانی میں اور نکلے آگ میں، حق تعالیٰ کی قدرت سے کیا بعید ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں جہنم کی آگ تو مراد نہیں ہے کیونکہ اس میں داخلہ تو قیامت کے حساب کتاب کے بعد ہوگا۔ یہ برزخی آگ ہے جس میں داخل ہونے کی قرآن کریم نے خبر دی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عالم برزخ میں رہنے کے زمانے میں بھی مردوں پر عذاب ہوگا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جب قبر میں بدعمل کو عذاب ہوگا تو نیک عمل والوں کو ثواب اور نعمت بھی ملے گی۔ احادیث متواترہ میں قبر کے اندر عذاب وثواب ہونے کا بیان اس کثرت اور وضاحت سے آیا ہے کہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس پر امت کا اجماع ہے۔ (معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الجن (72)

آیت نمبر (1 تا 9)

ج ر س

حَرۡسًا حفاظت کرنا۔ پہرہ دینا۔

حَارِسٌ ج حَرَسٌ۔ فَاعِلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ حفاظت کرنے والا۔ چوکیدار۔ پہرے دار۔

حَرَسِیٌّ ج حَرَسٌ۔ اسم الجمع ہے۔ محافظوں کا دستہ۔ باڈی گارڈوں کا دستہ۔ زیر مطالعہ آیت۔8۔

ترکیب

آیات۔1۔3۔4۔6۔ میں اَنَّهٗ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان ضمیروں کا کوئی مرجع نہیں ہے، اس لیے یہ سب ضمیر الشان ہیں۔ دیکھیں آیت۔2/85، نوٹ۔1) یہاں پر لفظ قُرۡاٰنًا، کلام اللہ کے اسم علم کے طور پر نہیں بلکہ اپنے لغوی معنی میں آیا ہے، دیکھیں

آیت۔2/البقرۃ:185۔مادہ ''ق رء''۔(آیت۔5) یہاں تَقُوْلَ واحد مؤنث کا صیغہ ہے۔قاعدہ یہ ہے کہ فاعل اگر اسم ظاہر ہو تو فعل ہمیشہ واحد آتا ہے، البتہ جنس میں اس کا صیغہ اسم ظاہر کی جنس کے مطابق ہوتا ہے۔لیکن اگر اسم ظاہر عاقل کی جمع مکسر ہو یا اسم الجمع ہو یا مؤنث غیر حقیقی ہو، تو پھر فعل واحد مذکر اور واحد مؤنث، دونوں طرح سے لانا جائز ہے۔یہاں اَلْاِنْسُ وَالْجِنُّ اسم الجمع ہیں اس لیے واحد مؤنث کا صیغہ بھی جائز ہے۔(آیت۔6) فَزَادُوْهُمْ میں زَادُوْا کی ضمیر فاعلی رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ کے لیے بھی ہوسکتی ہے اور رِجَالٌ مِّنَ الْجِنِّ کے لیے بھی۔اسی طرح هُمْ کی ضمیر مفعولی کو بھی دونوں میں سے کسی کے لیے بھی ماننے کی گنجائش موجود ہے۔دونوں مؤنث کی ضمیر سے آتی ہے۔یہاں هُمْ کی ضمری اَنَّ کا اسم ہے اور ظَنُّوْا جملہ فعلیہ بن کر اَنَّ کی خبر ہے اور هُمْ کی ضمیر انسانوں کے لیے ہے بَعَثَ کا اصل مفہوم ہے کسی کو اٹھا کر کسی طرف بھیجنا۔اس لیے یہ لفظ اٹھانا اور بھیجنا، دونوں معانی میں آتا ہے۔یہاں لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کسی کو قبر سے نہیں اٹھائے گا اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ اب کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔دونوں ترجمے درست ہوں گے۔

ترجمہ

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ	اَنَّهُ	اسْتَمَعَ نَفَرٌ	مِّنَ الْجِنِّ
آپ کہیے وحی کیا گیا میری طرف	کہ حقیقت یہ ہے کہ	دھیان سے سنا ایک ایسی ٹولی نے جو	جنوں میں سے تھی

فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا	قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿۱﴾	يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ
پھر انہوں نے کہا بیشک ہم نے سنا	ایک عجیب پڑھی جانے والی چیز	جو ہدایت دیتی ہے نیک راہ کی طرف

فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ	وَلَنْ نُّشْرِكَ	بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۙ﴿۲﴾	وَّ اَنَّهٗ
تو ہم ایمان لائے اس پر	اور ہم ہرگز شریک نہیں کریں گے	اپنے رب کے ساتھ کسی ایک کو (بھی)	اور یہ کہ حقیقت یہ ہے کہ

تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا	مَا اتَّخَذَ	صَاحِبَةً	وَّلَا وَلَدًا ۙ﴿۳﴾
بلند ہوئی ہمارے رب کی عظمت	اس نے نہیں بنایا	کوئی ساتھی (بیوی)	اور نہ کوئی اولاد

وَّ اَنَّهٗ	كَانَ يَقُوْلُ	سَفِيْهُنَا	عَلَى اللّٰهِ	شَطَطًا ۙ﴿۴﴾	وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ
اور یہ کہ سچ یہ ہے کہ	کہا کرتا تھا	ہم میں کا بیوقوف (سردار)	اللہ پر (باتیں)	حد سے گزرتے ہوئے	اور یہ کہ ہم نے گمان کیا

اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ	الْاِنْسُ وَالْجِنُّ	عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۙ﴿۵﴾	وَّ اَنَّهٗ	كَانَ رِجَالٌ	مِّنَ الْاِنْسِ
کہ ہرگز نہیں کہیں گے	انسان اور جن	اللہ پر کوئی جھوٹ	اور یہ کہ حقیقت یہ ہے کہ	تھے کچھ ایسے مرد	انسانوں میں سے

يَعُوْذُوْنَ	بِرِجَالٍ	مِّنَ الْجِنِّ	فَزَادُوْهُمْ
جو پناہ پکڑتے تھے	کچھ ایسے مردوں کی جو	جنوں میں سے تھے	تو انہوں (انسانوں) نے زیادہ کیا ان (جنوں) کو

رَهَقًا ۙ﴿۶﴾	وَّ اَنَّهُمْ ظَنُّوْا	كَمَا ظَنَنْتُمْ	اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ
بلحاظ چڑھنے کے	اور یہ کہ ان (انسانوں) نے گمان کیا	جیسے تم (جن) لوگوں نے گمان کیا	ہرگز نہیں اُٹھائے گا اللہ

اَحَدًا ﴿۲۶﴾	وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ	فَوَجَدْنٰهَا	مُلِئَتْ 6940
کسی ایک کو (بھی قبر سے)	اور یہ کہ ہم نے بیشک چھوا (ٹٹولا) آسمان کو	تو ہم نے پایا اس کو	(کہ) اس کو بھر دیا گیا

حَرَسًا شَدِيْدًا	وَّ شُهُبًا ﴿۸﴾	وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ	مِنْهَا مَقَاعِدَ
بڑے سخت محافظوں کے دستوں سے	اور انگاروں سے	اور یہ کہ ہم بیٹھا کرتے تھے	اس (آسمان) میں بیٹھنے کی جگہوں (مورچوں) پر

لِلسَّمْعِ ؕ	فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ	يَجِدْ لَهٗ	شِهَابًا رَّصَدًا ﴿۹﴾
سننے کے لیے	پس جو (کوئی) سنتا ہے اب	تو وہ پاتا ہے اپنے لیے	ایک گھات میں بیٹھنے والا انگارہ

نوٹ: 1

یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ جنوں کی حقیقت کیا ہے تا کہ ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جن کسی حقیقی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بھی پرانے زمانے کے اوہام میں سے ایک بے بنیاد خیال ہے۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ اس طرز فکر سے متاثر ہیں، مگر قرآن کا انکار بھی نہیں کر سکتے، انہوں نے جن، ابلیس اور شیطان کے متعلق قرآن کے صاف صاف بیانات کو طرح طرح کی تاویلات کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد کوئی ایسی پوشیدہ مخلوق نہیں ہے جو اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہو، بلکہ کہیں تو اس سے مراد انسان کی اپنی بہیمی قوتیں ہیں جنہیں شیطان کہا گیا ہے اور کہیں اس سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں اور کہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چھپ چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے لیکن قرآن مجید کے ارشادات اس معاملہ میں اس قدر صاف اور صریح ہیں کہ ان تاویلات کے لیے ان کے اندر کوئی گنجائش نہیں ہے۔

قرآن میں بکثرت مقامات پر جن اور انسان کا ذکر اس حیثیت سے کیا گیا ہے کہ یہ دو الگ قسم کی مخلوقات ہیں۔ سورۂ رحمن تو پوری کی پوری اس پر ایسی صریح شہادت دیتی ہے کہ جنوں کو انسانوں کی کوئی قسم سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتی۔ اعراف۔12، فجر۔26۔27، رحمٰن۔14۔15 میں صاف صاف بتایا گیا کہ انسان کا مادۂ تخلیق مٹی ہے اور جنوں کا مادۂ تخلیق آگ ہے۔ سورۃ حجر۔27۔ میں صراحت کی گئی کہ جن انسان سے پہلے پیدا کیے گئے اسی بات پر قصہ آدم و ابلیس شہادت دیتا ہے جو قرآن میں سات مقامات پر بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق کے وقت ابلیس موجود تھا۔ پھر سورۂ کہف۔ 50۔ میں بتایا گیا کہ ابلیس جنوں میں سے ہے۔ سورۂ اعراف۔ 27۔ میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ جن انسانوں کو دیکھتے ہیں مگر انسان ان کو نہیں دیکھتے۔ سورۃ حجر۔16 تا 18، سورۂ صافات۔6 تا 10، اور سورۂ ملک۔5 میں بتایا گیا ہے کہ جن عالم بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں مگر ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اس سے اوپر جانے کی کوشش کریں تو انہیں روک دیا جاتا ہے۔ اس سے مشرکین کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں۔ اسی خیال کی تردید سورۂ سبا۔14۔ میں بھی کی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ۔30 تا 34۔ اور سورۂ کہف۔50۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی خلافت اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے اور انسان جنوں سے افضل مخلوق ہے اگرچہ بعض غیر معمولی طاقتیں جنوں کو بھی بخشی گئی ہیں، جن کی ایک مثال سورۂ نمل۔7۔ میں ملتی ہے۔ لیکن اس طرح بعض طاقتیں حیوانات کو بھی انسان سے زیادہ ملی ہیں اور وہ اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ جانوروں کو انسان پر فضیلت حاصل ہے۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جن انسان کی طرح ایک بااختیار مخلوق ہے اور اس کو کفر و ایمان کا ویسا ہی اختیار دیا گیا ہے جیسا انسان کو دیا گیا ہے۔ قرآن میں یہ حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ ابلیس کی تخلیقِ آدم کے وقت ہی یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ نوع انسانی کو گمراہ کرے گا اور اسی وقت سے شیاطین جن انسان کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں مگر وہ زبردستی کوئی کام

6940 کرانے کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ وہ اس کے دل میں وسوسے ڈالتے ہیں اور بدی و گمراہی کو خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں۔

ان تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جن انسان سے الگ ایک دوسری ہی نوع کی پوشیدہ مخلوق ہیں۔ ان کی پراسرار صفات کی وجہ سے جاہل لوگوں نے ان کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز تصورات قائم کر رکھے ہیں حتیٰ کہ ان کی پرستش تک کر ڈالی ہے۔ مگر قرآن نے ان کی اصل حقیقت پوری طرح کھول کر بیان کر دی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶، ص ۱۰۹ تا ۱۱۱)

نوٹ:2

آیات۔4۔5 سے مراد یہ ہے کہ ایمان لانے والے جنات نے اب تک شرک و کفر میں مبتلا رہنے کا عذر یہ بیان کیا کہ ہماری قوم کے بے وقوف لوگ اللہ تعالیٰ کی شان میں بے سروپا باتیں کیا کرتے اور ہمیں یہ گمان نہ تھا کہ کوئی انسان یا جن اللہ کی طرف جھوٹی بات کی نسبت کر سکتا ہے اس لیے ان بے وقوفوں کی باتوں میں آ کر آج تک ہم کفر و شرک میں مبتلا تھے۔ اب قرآن سنا تو حقیقت کھلی۔ (معارف القرآن)۔

ان آیات سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ جنات عوام کے طبقہ سے تھے ان کے سردار جس ڈگر پر ان کو چلاتے رہے، اس پر وہ چلتے رہے۔ لیکن جب حقیقت ان پر واضح ہو گئی تو انہوں نے ان کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردنوں سے نکال پھینکا اور اللہ کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پر چل پڑے۔ آنحضرت ﷺ کے واسطہ سے قریش کے عوام کو یہ باتیں اس لیے سنائی گئیں کہ ان کے اندر بھی اپنے احمق لیڈروں کے پھندے سے نکلنے اور اپنی عقل و بصیرت پر اعتماد کرنے کا حوصلہ پیدا ہو (تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

عربی لغت میں لفظ سَمَاءٌ جس طرح آسمان کے لیے بولا جاتا ہے اسی طرح بادل پر بھی لفظ سَمَاءٌ کا اطلاق عام اور معروف ہے۔ آیت۔8۔ میں بظاہر سَمَاءٌ سے مراد یہی بادل ہے۔ اور جنات لوگوں کا آسمانی خبریں سننے کے لیے آسمان تک جانے کا مطلب یہی ہے کہ وہ بادلوں تک جاتے تھے اور وہاں سے آسمانی خبریں سنتے تھے۔ اس کی دلیل حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے۔ آپؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ فرشتے عنان سماء میں اترتے ہیں جس کے معنی بادل کے ہیں۔ وہاں وہ ان فیصلوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آسمان میں جاری فرمائے ہیں۔ یہاں سے شیاطین یہ خبریں چراتے ہیں اور سن کر کاہنوں کے پاس لاتے ہیں اور اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر ان کو بتاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے شیاطین کا آسمانی خبریں سن کر کاہنوں تک پہنچانے کا سلسلہ بغیر کسی رکاوٹ کے جاری تھا مگر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت آسمانی وحی کی حفاظت کے لیے اس سلسلہ کو اس طرح بند کر دیا گیا کہ جب کوئی شیطان خبریں سننے کے لیے اوپر آتا تو اس کی طرف شہاب ثاقب کا انگارہ پھینک کر اس کو دفع کر دیا جاتا ہے۔ یہی وہ نیا حادثہ تھا جس کی تحقیق حال کے لیے دنیا کی مشرق و مغرب میں جنوں نے وفود بھیجے پھر مقام نخلہ میں رسول اللہ ﷺ سے قرآن سن کر جنوں کے ایک وفد کا ایمان لانا اس سورۂ میں ذکر فرمایا گیا۔ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شہاب ثاقب جس کو عرفِ عام میں ستارہ ٹوٹنا کہتے ہیں، یہ تو دنیا میں قدیم زمانے سے ہوتا آیا ہے، جب کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد نبوی کی خصوصیت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شہابِ ثاقب کا وجود تو ابتداء عالم سے ہے مگر اس آتشیں مادہ سے شیاطین کو دفع کرنے کا کام رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے شروع ہوا اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جتنے شہاب ثاقب نظر آتے ہیں، سب سے ہی یہ کام لیا جاتا ہو۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (10 تا 19)

6940

ھ ر ب

(ن) هَرْبًا تیز چلنا۔ بھاگنا۔ زیر مطالعہ آیت۔12۔

ح ر ی

(ض) حَرْيًا کسی چیز کا گھٹنا۔ کم ہونا۔

(تفعل) تَحَرِّي دو چیزوں میں سے بہتر کو کوشش کر کے حاصل کرنا۔ زیر مطالعہ آیت۔14۔

ح ط ب

(ض) حَطْبًا (۱) لکڑی چننا۔ (آگ جلانے کے لیے) (۲) چغلی کھانا، افتراء باندھنا۔ (لڑائی کی آگ جلانے کے لیے)۔

حَطَبٌ اسم ذات ہے۔ (۱) ایندھن۔ زیر مطالعہ آیت۔ 15۔ (۲) چغلی۔ ﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ (111/اللھب:4) ''(چغلی کو اٹھانے یعنی لیے پھرنے والی)۔

غ د ق

(س) غَدَقًا بارش کا خوب برسنا۔ کسی چیز کا وافر ہونا۔ زیر مطالعہ آیت۔16۔

ل ب د

(ن) لُبُوْدًا گھیرنا۔ چمٹنا۔ گٹھ جانا۔

لِبَدَةٌ ج۔ لِبَدٌ۔ تہہ بہ تہہ جمی ہوئی اون۔ لوگوں کا جوق در جوق جمع ہونے والا گروہ۔ زیر مطالعہ آیت۔19۔

لُبَدَةٌ ج لُبَدٌ۔ شیر کی گردن کے بال جو بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر کسی چیز کی بہتات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔﴿يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا﴾ (90/البلد:6) ''وہ کہتا ہے میں نے ہلاک کیا یعنی خرچ کیا ڈھیروں مال۔''

ترکیب (آیت۔10) لَا نَدْرِیْ کے آگے اَشَرٌّ سے لے کر رَشَدًا تک پورا جملہ نَدْرِیْ کا مفعول ہے۔ اُرِیْدَ ماضی مجہول ہے اور اس کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے شَرٌّ حالت رفع میں ہے (آیت۔16) اَلطَّرِیْقَةِ پر لامِ تعریف ہے اس کا معہودِ ذہنی صحیح راستہ کو بھی مانا جا سکتا ہے اور غلط راستہ کو بھی، کیونکہ قرآن مجید میں دونوں طرح کی آزمائش کا ذکر ہے۔ سورۃ الانعام کی آیات۔43۔44) میں نافرمانوں پر آخری عذاب نازل کرنے سے پہلے نعمتوں کے تمام دروازے کھولنے کا ذکر ہے اور سورۃ الانبیاء کی آیت۔35۔ میں اس اصول کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک و بد تمام انسانوں کو دے کر بھی آزماتا ہے اور لے کر بھی آزماتا ہے۔ اس لیے یہاں اَلطَّرِیْقَةِ سے صحیح اور غلط دونوں راستے مراد لینا ممکن ہے۔ البتہ اس سے پہلے اَسْتَقَامُوْا آیا ہے اور استقامت کا لفظ عموماً صحیح راستہ کے لیے آتا ہے۔ اس لیے ہماری ترجیح یہ ہے کہ یہاں صحیح راستہ مراد لیا جائے۔ (حافظ احمد یار صاحب)

پیچھے پہلی آیت میں فَقَالُوْا سے جنوں کا قول شروع ہوا تھا اور اس کے لیے مسلسل اَنَّا (کہ ہم) سے بات شروع ہوتی رہی ہے اب یہاں اَنَّا (کہ ہم) کے بجائے اَنْ (کہ) آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گزشتہ آیت پر جنوں کا قول ختم ہو گیا اور اس اَنْ کا تعلق پہلی آیت کے

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ سے ہے۔(آیت۔19)۔عَبْدُ اللّٰہِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔یَدْعُوْہُ حال ہے۔یَکُوْنُوْنَ کی ضمیر فاعلی ھُمْ کو مشرکوں کے لیے بھی مانا گیا ہے لیکن سارا ذکر جنوں کا چلا آرہا ہے اس لیے ہماری ترجیح ہے کہ اس کو جنوں کے لیے مانا جائے۔6940

ترجمہ

وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْٓ	اَشَرٌّ اُرِیْدَ	بِمَنْ فِی الْاَرْضِ	اَمْ اَرَادَ بِھِمْ
اور یہ کہ ہم نہیں جانتے	آیا کسی برائی (عذاب) کا ارادہ کیا گیا	ان کے بارے میں جو زمین میں ہیں	یا ارادہ کیا ان کے بارے میں

رَبُّھُمْ رَشَدًا ﴿۱۰﴾	وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ	وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ	كُنَّا طَرَآىِٕقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾
ان کے رب نے کسی بھلی راہ کا	اور یہ کہ ہم میں نیک لوگ (بھی) ہیں	اور ہم میں اس کے علاوہ (بھی) ہیں	ہم تھے مختلف الرَّائے طریقوں پر

وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ	اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ	اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ	وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ
اور یہ کہ ہم نے گمان کیا (سمجھ لیا)	کہ ہم ہرگز عاجز نہ کرسکیں گے	اللہ کو زمین میں	اور ہم ہرگز عاجز نہ کرسکیں گے اس کو

ھَرَبًا ﴿۱۲﴾	وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا	الْھُدٰٓی	اٰمَنَّا بِهٖ ؕ	فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ
بلحاظ بھاگنے کے	اور یہ کہ جب ہم نے سنا	اِس ہدایت (قرآن) کو	تو ہم ایمان لائے اُس پر	پھر جو ایمان لاتا ہے اپنے رب پر

فَلَا یَخَافُ بَخْسًا	وَّلَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾	وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ
تو وہ خوف نہیں کرتا کسی حق تلفی کا	اور نہ کسی زیادتی کا	اور یہ کہ ہم میں فرمانبرداری کرنے والے (بھی) ہیں

وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ	فَمَنْ اَسْلَمَ	فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا	رَشَدًا ﴿۱۴﴾
اور ہم میں بے انصافی کرنے والے (بھی) ہیں	تو جس نے فرمانبرداری کی	تو ان لوگوں نے پالیا	بھلی راہ کو

وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ	فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾	وَّ اَنْ
اور وہ جو ناانصافی کرنے والے ہیں	تو وہ لوگ جہنم کے ایندھن ہیں	اور (وحی کیا گیا میری طرف) کہ

لَّوِ اسْتَقَامُوْا	عَلَى الطَّرِیْقَةِ	لَاَسْقَیْنٰهُمْ	مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾
اگر وہ لوگ استقامت اختیار کرتے	اس (سیدھے) راستے پر	تو ہم ضرور پینے کے لیے دیتے ان کو	وافر پانی

لِّنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ ؕ	وَمَنْ یُّعْرِضْ	عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ	یَسْلُكْهُ
تاکہ ہم آزمائیں ان کو اس (پانی کے استعمال میں)	اور جو اعراض کرے گا	اپنے رب کی یاد سے	تو وہ (رب) ڈال دے گا اس کو

عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾	وَّ اَنَّ	الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ	فَلَا تَدْعُوْا
ایک چڑھائی والے (مسائل والے) عذاب میں	اور (وحی کیا گیا) کہ	تمام سجدہ گاہیں اللہ کے لیے ہیں	پس تم لوگ مت پکارو

مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾	وَّ اَنَّهٗ	لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ
اللہ کے ساتھ کسی ایک کو	اور حقیقت یہ ہے کہ	جب کھڑا ہوا اللہ کا بندہ

یَدْعُوْهُ	كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ	عَلَیْهِ	لِبَدًا ﴿۱۹﴾
اس کو پکارتے ہوئے	لگتے تھے کہ وہ (جن) ہو جائیں گے	اس (بندے) پر	گھیرا ڈالنے والے گروہ در گروہ

نوٹ:1

اس (آیت۔10) سے معلوم ہوا کہ عالمِ بالا میں اس قسم کے غیر معمولی انتظامات (جس کا ذکر گزشتہ آیت میں کیا گیا ہے) دو ہی حالتوں میں کیے جاتے تھے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہل زمین پر کوئی عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا ہو اور منشائے الٰہی یہ ہو کہ اس کے نزول سے پہلے جن اس کی بھنک پا کر اپنے دوست انسانوں کو خبردار نہ کر دیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے زمین میں کسی رسول کو مبعوث فرمایا ہو اور تحفظ کے ان انتظامات سے مقصود یہ ہو کہ رسول کی طرف جو پیغامات بھیجے جا رہے ہیں، ان میں نہ تو شیاطین کسی قسم کی خلل اندازی کر سکیں اور نہ قبل از وقت یہ معلوم کر سکیں کہ پیغمبر کو کیا ہدایات دی جا رہی ہیں۔ پس جنوں کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے آسمان میں یہ چوکی پہرے دیکھے تو ہمیں یہ معلوم کرنے کی فکر ہوئی کہ ان دونوں صورتوں میں سے کون سی صورت درپیش ہے۔ اسی تلاش میں ہم نکلے تھے کہ ہم نے وہ حیرت انگیز کلام سنا اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ اللہ نے خلق خدا کو راہِ راست دکھانے کے لیے ایک رسول مبعوث فرمایا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔ 11۔ کا مطلب یہ ہے کہ اب تک تو نیکی اور بدی کے درمیان ہماری نگاہوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ برے اور بھلے دونوں ہماری نظروں میں یکساں تھے لیکن اس قرآن نے ہمارا یہ مغالطہ دور کر دیا ہے اور یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہمارے طریقے اور راہیں الگ الگ ہیں اور ضروری ہے کہ ہم اس فرق کو ملحوظ رکھ کر لوگوں کے ساتھ معاملہ کریں۔ ہمارے درمیان وصل و فصل کی بنیاد ایمان و کفر کو ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو ہمارے قبیلہ کا ہے وہ ہمارا ہے، چاہے کافر ہو یا مومن، نیک ہو یا بد۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

مفتی محمد شفیعؒ کے ایک کتابچے ''ذکر اللہ'' کے مطابق ذکر۔ ورد۔ تسبیح وغیرہ ذکر اللہ نہیں ہیں بلکہ ذریعہ ذکر ہیں یعنی یہ بندے کو ذکر اللہ کی منزل تک پہنچانے کے ذرائع ہیں۔ ذکر۔ ورد۔ تسبیح وغیرہ میں اللہ کو یاد کرنے والے کلمات کی تکرار کرتے ہوئے جب بندہ اُس مقام پر پہنچ جائے کہ زندگی کی گہما گہمی کے بیچ منجدھار میں معاملات کرتے وقت اسے اللہ کے احکام یاد آنے لگیں اور وہ ان کے مطابق معاملات کرے، تو یہ ذکر اللہ ہے۔ اس بات کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی نماز، روزہ (نفلی) وغیرہ کم ہوں اور جس نے احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ اس کی نماز، روزہ (نفلی) تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔ (آیت۔20/طٰہٰ:152، نوٹ۔1)

اس حوالہ سے اب اس بات کو سمجھ لیں کہ زیر مطالعہ آیت۔ 17۔ میں ذِكْرِ رَبِّهٖ سے مراد یہی ذکر اللہ ہے، تسبیحات وغیرہ نہیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص فرض نماز، روزوں وغیرہ کا اہتمام تو کرتا ہے لیکن ذکر، ورد، تسبیح وغیرہ کا اہتمام نہیں کرتا تو وہ اس کے اضافی ثواب سے محروم رہے گا، لیکن اس بنیاد پر وہ عذاب کا مستحق نہیں ہوگا۔ عذاب کا مستحق تو وہ ہوگا جس نے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کی، اگرچہ اس کی نماز، روزے، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

اللہ کی یاد سے یعنی اس کی قائم کردہ حدود و قیود سے اعراض کرتے ہوئے یعنی کَنّی کتراتے ہوئے زندگی بسر کرنے والے کی نقد سزا یہ ہے کہ اسے اسی دنیا میں عَذَابًا صَعَدًا میں جھونک دیا جاتا ہے۔ صَعِدَ۔ یَصْعَدُ کے معنی ہیں سیڑھی پر چڑھنا۔ چڑھائی چڑھنا۔ اس میں آدمی بلند سے بلند تر سطح پر پہنچتا رہتا ہے، اس لیے اس میں ترقی پذیری کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور چڑھائی چڑھنا مشقت طلب کام بھی ہے اس لیے اس میں مشکل کا مفہوم بھی ہے۔ لیکن یہاں عَذَابًا صَعَدًا کا واضح مفہوم یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس کی زندگی الجھنوں، پریشانیوں اور مسائل کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک پریشانی آتی رہتی ہے اور اسے زندگی میں اطمینان و سکون نصیب نہیں ہوتا اور اس کی زندگی ہانپتے کانپتے ہی بسر ہوتی ہے۔ پھر جب اس دنیا میں آنکھ بند ہوتی ہے اور اُس دنیا میں کھل جاتی ہے تو اس عذاب کی چوٹی سامنے آجاتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی اور حساب و کتاب کے وقت حسرت اور کیفیات۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر قسم کے عذاب سے اپنی پناہ میں رکھے۔

آیت نمبر (20تا28)

6940

ترکیب

(آیت۔22) مُلْتَحَدًا باب افتعال سے اسم المفعول ہے جو یہاں اسم الظرف کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ (آیت۔23) بَلٰغًا اور رِسٰلٰتِهٖ، یہ دونوں لَنْ اَجِدَ مُلْتَحَدًا سے مستثنیٰ ہیں اور یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ اس لیے یہ دونوں حالتِ نصب میں ہیں۔ (دیکھیں آیت۔ 2/البقرۃ:34،نوٹ۔1) (آیت۔25۔26) رَبِّیْ پر یائے متکلم ہے اس لیے اس کی رفع ،نصب ختم ہوگئی ہے۔ اس آیت میں یہ یَجْعَلُ کا فاعل ہونے کی وجہ سے حالت رفع میں ہے۔ عٰلِمُ الْغَیْبِ اس کا بدل ہے اس لیے عٰلِمُ حالت رفع میں آیا ہے۔

ترجمہ

قُلْ اِنَّمَآ	اَدْعُوْا رَبِّیْ	وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾
آپ کہہ دیں کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	میں پکارتا ہوں اپنے رب کو	اور میں شریک نہیں کرتا اس کے ساتھ کسی ایک کو

قُلْ اِنِّیْ	لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ	ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾
آپ کہہ دیں کہ میں	اختیار نہیں رکھتا تم لوگوں کے لیے	کسی تکلیف کا اور نہ کسی بھلی راہ کا

قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ	مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ	وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ
آپ کہیے کہ ہرگز نہیں بچائے گا مجھ کو	اللہ سے کوئی ایک بھی	اور میں ہرگز نہیں پاؤں گا اس کے علاوہ

مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾	اِلَّا بَلٰغًا	مِّنَ اللّٰهِ	وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ
کوئی پناہ گاہ	سوائے اس کے کہ پہنچانا (حق کو)	اللہ (کی طرف) سے	اور اس کے پیغامات کو

وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ	خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ	اَبَدًا ﴿۲۳﴾
اور جو نافرمانی کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی	تو یقیناً اس کے لیے ہی جہنم کی آگ ہے	ایک حالت میں رہنے والے اس میں	ہمیشہ ہمیش

حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا	مَا یُوْعَدُوْنَ	فَسَیَعْلَمُوْنَ	مَنْ اَضْعَفُ	نَاصِرًا
یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے	اس کو جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے	تو وہ لوگ جان لیں گے	کہ کون زیادہ ضعیف ہے	بلحاظ مددگار کے

وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾	قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ	اَقَرِیْبٌ	مَّا تُوْعَدُوْنَ	اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ
اور زیادہ قلیل ہے بلحاظ گنتی کے	آپ کہیے میں نہیں جانتا	آیا قریب ہے	وہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے	یا مقرر کرے گا اس کے لیے میرا رب

اَمَدًا ﴿۲۵﴾	عٰلِمُ الْغَیْبِ	فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖٓ	اَحَدًا ﴿۲۶﴾
کوئی مدت	جو تمام غیب کا جاننے والا ہے	تو وہ مطلع نہیں کرتا اپنے غیب پر	کسی ایک کو

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى	مِنْ رَّسُوْلٍ	فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ	مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ	وَمِنْ خَلْفِهٖ
سوائے اس کے جس کو اس نے پسند کیا	کسی رسول میں سے	پھر بیشک وہ چلاتا ہے	اس (رسول) کے آگے	اور اس کے پیچھے

رَصَدًا ﴿۲۷﴾	لِّیَعْلَمَ اَنْ	قَدْ اَبْلَغُوْا	رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ
پہرہ دینے والے	تاکہ وہ جان لے کہ	ان لوگوں (فرشتوں اور رسولوں) نے پہنچا دیے ہیں	اپنے رب کے پیغامات

وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ	وَاَحْصٰى	كُلَّ شَيْءٍ	عَدَدًا ﴿۲۸﴾ ع
اوراس نے احاطہ کیااس کا جوان کے پاس ہے	اوراس نے شمار پورا کیا	ہر چیز کا	بلحاظ گنتی کے

نوٹ:1

آیت۔23۔ میں اِلاَّ بَلٰغًا کا تعلق آیت۔21۔ میں لَا اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا سے بھی مانا گیا ہے، ایسی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میں نہ تمہارے مطالبہ پر تمہیں عذاب دکھا سکتا ہوں اور نہ تمہارے دلوں میں ہدایت اتار سکتا۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ اللہ نے جو پیغام دے کر مجھے بھیجا ہے وہ بے کم وکاست میں تمہیں پہنچادوں اور اس کے حکموں سے تمہیں آگاہ کردوں۔ (تدبر قرآن)۔

دوسری طرف اِلاَّ بَلٰغًا کا تعلق آیت۔22۔ میں لَنْ اَجِدَ مُلْتَحَدًا سے مانا گیا ہے۔ ایسی صورت میں مطلب یہ ہے کہ تمہارے بُرے بھلے کا اختیار رکھنا تو درکنار، مجھے خود اپنے بُرے بھلے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو مجھے اس سے بچانے والا کوئی نہیں ہے اور اس کی پکڑ سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی پناہ گاہ ہے تو بس یہ ہے کہ میں اپنی ابلاغ کی ذمہ داری کو کماحقہٗ ادا کردوں۔ پھر میں اس کی گرفت سے بچ جاؤں گا اور وہ لوگ پکڑے جائیں گے جو اس کی نافرمانی کریں گے۔ (حافظ احمد یار صاحب مرحوم کا کیسٹ ترجمہ قرآن)۔

اس آیت میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر گناہ اور نافرمانی کی سزا ابدی جہنم ہے بلکہ جس سلسلۂ کلام میں یہ بات کہی گئی ہے اس کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے توحید کی جو دعوت دی گئی ہے اس کو جو شخص نہ مانے اور شرک سے باز نہ آئے تو اس کے لیے ابدی جہنم کی سزا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔25۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ جو لوگ آپ کو قیامت کا معین وقت بتلانے پر مجبور کرتے ہیں ان سے کہہ دیں کہ قیامت کا آنا تو یقینی ہے لیکن اس کے واقع ہونے کی صحیح تاریخ اللہ نے کسی کو نہیں بتلائی، اس لیے میں نہیں جانتا کہ وہ روزِ قیامت قریب آچکا ہے یا ابھی کچھ مدت باقی ہے۔ پھر اگلی آیت۔26۔ میں اس کی وجہ بتائی کہ قیامت کی تاریخ سے میری بے خبری اس لیے ہے کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں بلکہ عالم الغیب ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ یہاں الغیب کا الف لام، استغراقِ جنس کے لیے ہے۔ مقصود اس کلام سے علم غیب کلی، جس سے جہان کا کوئی ذرہ مخفی نہ ہو، کی غیر اللہ کے لیے نفی اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اثبات ہے۔ اُس غیب کلی پر وہ کسی کو غالب وقادر نہیں کرتا کہ کوئی جس غیب کو جب چاہے معلوم کرلے، البتہ منصب رسالت کے لیے جس قدر غیب کا علم کسی رسول کو دینا ضروری ہے وہ ان کو من جانب اللہ بذریعہ وحی دے دیا جاتا ہے اور وہ ایسے محفوظ طریقے سے دیا جاتا ہے کہ جب ان پر اللہ کی طرف سے کوئی وحی نازل ہوتی ہے تو اس کے ہر طرف فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے تاکہ شیاطین اس میں کوئی مداخلت نہ کرسکیں۔ اس میں اوّل تو لفظ ''رسول'' سے اس غیب کی نوعیت متعین کردی گئی جس کا علم رسول ونبی کو دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو علم غیب رسول ونبی کو دیا جاتا ہے اس کی نوعیت متعین کردی کہ وہ فرشتوں کے ذریعے بھیجا جاتا ہے اور وحی لانے والے فرشتوں کے گرد دوسرے فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس علمِ غیب کا نبی ورسول کے لیے اثبات ہے وہ بعض اور مخصوص علم غیب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ استثناء اصطلاحی لفظوں میں استثناء منقطع ہے۔ (معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

1940

سورۃ المزمل (73)

آیت نمبر (1 تا 19)

ز م ل

(ن) زَمۡلًا کسی کو سواری پر پیچھے بٹھانا۔
(تفعل) تَزَمَّلًا اور اِزَّمَّلًا۔ کپڑے کو اپنے اوپر لپیٹ لینا۔
مُزَّمِّلٌ اسم الفاعل ہے۔ لپیٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔1

ب ت ل

(ن۔ض) بَتۡلًا کسی سے کوئی چیز کاٹ کر الگ کرنا۔
(تفعیل) تَبۡتِیۡلًا کسی سے کوئی چیز کاٹ کر مسلسل الگ رکھنا۔ زیر مطالعہ آیت۔8۔
(تفعل) تَبَتَّلًا کسی سے کٹ کر الگ ہونا۔ سب ٹوٹ کر اللہ سے لَو لگانا۔ زیر مطالعہ آیت۔8۔

غ ص ص

(س) غَصَصًا کھانے یا پانی سے گلے میں پھندا لگنا۔ گلے میں اٹکنا۔
غُصَّۃٌ جس سے پھندا لگے۔ اٹکنے والی چیز۔ زیر مطالعہ آیت۔13۔

ك ث ب

کَثۡبًا جمع کرنا۔ اکٹھا کرنا۔ (متعدی) جمع ہونا۔ اکٹھا ہونا۔ (لازمی)
کَثِیۡبٌ فَعِیۡلٌ کا وزن ہے۔ دائمی طور پر اکٹھا ہونے والا۔ ریت کا ٹیلا۔ زیر مطالعہ آیت۔14۔

ھ ی ل

(ض) ھَیۡلًا مٹی ڈالنا۔ مٹی بکھیرنا۔
مَہِیۡلٌ مَفۡعُوۡلٌ (اجوف یائی میں مَفِیۡلٌ) کے وزن پر صفت ہے۔ بکھیری ہوئی۔ بھربھری مٹی۔ زیر مطالعہ آیت۔14

ترکیب

(آیت۔2)۔ قُمِ ثلاثی مجرد سے فعل امر ہے، جو کہ لازم ہے، اس کا مفعول نہیں آتا۔ اس لیے اَلَّیۡلَ ظرف ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ (آیت۔3۔4) قَلِیۡلًا کا بدل ہونے کی وجہ سے نِصۡفَہٗ حالت نصب میں ہے اور اس میں ہٗ کی ضمیر اَلَّیۡلَ کے لیے ہے۔ اُنۡقُصۡ مِنۡہُ اور زِدۡ عَلَیۡہِ کی ضمیریں نِصۡفَہٗ کے لیے ہیں۔ (آیت۔8) تَبَتَّلۡ باب تفعیل کا فعل امر ہے۔ اس کے مفعول مطلق کے طور پر باب تفعیل کا مصدر تَبۡتِیۡلًا آیا ہے لیکن یہ معروف نہیں بلکہ مجہول کے معنی میں ہے۔ (آیت۔14) کَانَتۡ کا اسم اَلۡجِبَالُ ہے جو کہ جمع ہے لیکن اس کے خبر کَثِیۡبًا مَّہِیۡلًا واحد لائی گئی ہے۔ یہ اسلوب اس حقیقت کی تاکید کے لیے اختیار کیا گیا ہے کہ بلا استثناء ہر ایک پہاڑ کَثِیۡبًا مَّہِیۡلًا ہوگا۔ مَہِیۡلٌ مادہ ''م ھ ل'' سے فَعِیۡلٌ کا وزن نہیں ہے بلکہ یہ مادہ ''ھ ی ل'' کا اسم المفعول ہے۔ یہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ اجوف

یائی کا اسم المفعول، مَفْعُوْلٌ کے وزن پر بھی آتا ہے اور مَفِیْلٌ کے وزن پر بھی جیسے مَبِیْعٌ (دیکھیں آسان عربی گرامر۔ حصہ سوم۔ پیراگراف۔۵:۷۲)۔ یہ مَفِیْلٌ کے وزن پر ہے۔ (آیت۔۱۸) اَلسَّمَآءُ مبتدا ہے۔ اس کی خبر مُنْفَطِرَةٌ مؤنث کے بجائے مذکر مُنْفَطِرٌ آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں اَلسَّمَآءُ عام طور پر مؤنث استعمال ہوتا ہے لیکن چند قبیلے اس کو مذکر استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے عربی میں اس کا مؤنث اور مذکر، دونوں استعمال درست مانا جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے لکھنؤ والے دہی کو کھٹی کہتے ہیں اور دہلی والے کھٹا کہتے ہیں۔ دونوں اہل زبان ہیں۔ اس لیے اردو میں دہی کا مذکر اور مؤنث دونوں استعمال درست مانا جاتا ہے۔

ترجمہ

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ①	قُمِ الَّيْلَ	اِلَّا قَلِيْلًا ۙ②	نِّصْفَهٗٓ
اے کپڑا لپیٹنے والے	آپؐ کھڑے رہیں رات کے وقت	سوائے تھوڑے (وقت) کے	جو اس (رات) کا آدھا ہے

اَوِ انْقُصْ	مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ③	اَوْ زِدْ عَلَيْهِ
یا آپؐ (چاہیں تو) گھٹائیں	اس (نصف) میں سے تھوڑا سا	یا آپؐ (چاہیں تو) زیادہ کریں اس (نصف) پر

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ	تَرْتِيْلًا ۭ④	اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ	قَوْلًا ثَقِيْلًا ⑤
اور آپؐ ترتیل سے پڑھیں قرآن کو	جیسا ترتیل کا حق ہے	بیشک ہم ڈالیں گے آپؐ پر	ایک وزنی قول

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ	هِيَ اَشَدُّ	وَطْاً	وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ⑥	اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ
بیشک رات کا سو کر اٹھنا	یہ زیادہ سخت ہے	بلحاظ پامال کرنے کے	اور زیادہ سیدھی ہے بلحاظ بات کے	بیشک آپؐ کے لیے دن میں

سَبْحًا طَوِيْلًا ۭ⑦	وَاذْكُرِ	اسْمَ رَبِّكَ	وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ	تَبْتِيْلًا ۭ⑧
طویل مصروفیت ہے	اور آپؐ ذکر کریں	اپنے رب کے نام کا	اور سب سے الگ ہو کر آپؐ لو لگائیں	جیسا مسلسل الگ کیے جانے کا حق ہے

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ	لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ	فَاتَّخِذْهُ	وَكِيْلًا ⑨
وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے	کوئی الٰہ نہیں سوائے اس کے	تو آپ! بنائیں اس کو	کام (بگڑی) بنانے والا

وَاصْبِرْ عَلٰي مَا	يَقُوْلُوْنَ	وَاهْجُرْهُمْ	هَجْرًا جَمِيْلًا ⑩	وَذَرْنِيْ
اور آپؐ صبر کریں اس پر جو	یہ لوگ کہتے ہیں	اور آپؐ چھوڑ دیں ان کو	جیسا خوبصورتی سے چھوڑنے کا حق ہے	اور آپؐ چھوڑیں مجھ کو

وَالْمُكَذِّبِيْنَ	اُولِي النَّعْمَةِ	وَمَهِّلْهُمْ	قَلِيْلًا ⑪	اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا
اور ان جھٹلانے والوں کو	جو خوشحالی والے ہیں	اور آپؐ ڈھیل دیں ان کو	تھوڑی سی	بیشک ہمارے پاس بیڑیاں ہیں

وَّجَحِيْمًا ۙ⑫	وَّطَعَامًا	ذَا غُصَّةٍ	وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۙ⑬	يَوْمَ تَرْجُفُ
اور دہکتی آگ ہے	اور ایک ایسا کھانا ہے جو	گلے میں اٹکنے والا ہے	اور ایک دردناک عذاب ہے	جس دن کانپے گی

الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ	وَكَانَتِ الْجِبَالُ	كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ⑭	اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ
یہ زمین اور سارے پہاڑ	اور ہو جائیں گے پہاڑ	بھربھری ریت کا ٹیلہ	بیشک ہم نے بھیجا تم لوگوں کی طرف

رَسُوْلًا شٰهِدًا عَلَيْكُمْ	كَمَآ اَرْسَلْنَآ	اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾	فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ
ایک ایسا رسول جو گواہی دینے والا ہے تم لوگوں پر	جیسے کہ ہم نے بھیجا	فرعون کی طرف ایک رسول	پھر نافرمانی کی فرعون نے اُن رسولؑ کی

فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾	فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ	اِنْ كَفَرْتُمْ	يَوْمًا
تو ہم نے پکڑا اس کو ایک سخت پکڑ میں	پھر تم لوگ کیسے بچو گے	اگر تم نے انکار کیا	ایک ایسے دن سے جو

يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ	شِيْبَا ﴿۱۷﴾	السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ	كَانَ وَعْدُهٗ
بنا دے گا بچوں کو	بوڑھا	آسمان پھٹنے والا ہے اس (دن) میں	اس کا وعدہ ہے

مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾	اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ	فَمَنْ شَآءَ	اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ	سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾
کیا ہوا	بیشک یہ ایک یاددہانی ہے	پھر جو چاہے	وہ بنائے اپنے رب کی طرف	ایک راستہ

نوٹ: 1

ترتیل کا مطلب یہ ہے کہ تیز تیز رواں دواں مت پڑھو بلکہ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرو اور ایک ایک آیت پر ٹھہرو تا کہ ذہن پوری طرح کلام الٰہی کے مفہوم و مدعا کو سمجھے اور اس کے مضامین سے متاثر ہو۔ کہیں اللہ کی ذات وصفات کا ذکر ہے تو اس کی عظمت دل پر طاری ہو۔ کہیں اس کی رحمت کا ذکر ہے تو دل جذباتِ تشکر سے لبریز ہو جائے۔ کہیں عذاب کا ذکر ہے تو دل پر اس کا خوف طاری ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کا طریقہ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ آپؐ الفاظ کو کھینچ کر پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک آیت کو الگ الگ پڑھتے اور ہر آیت پر ٹھہرتے جاتے تھے۔ مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱﴾ پڑھ کر رک جاتے، پھر الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿۲﴾ پر ٹھہرتے اور اس کے بعد رک کر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ﴿۳﴾ کہتے۔ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات کی نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑا ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کا یہ انداز دیکھا کہ جہاں تسبیح کا موقع آتا وہاں تسبیح فرماتے، جہاں دعا کا موقع آتا وہاں دعا مانگتے۔ (تفہیم القرآن)۔

ترتیل میں تحسین صوت یعنی بقدر اختیار خوش آوازی سے پڑھنا بھی شامل ہے۔ (معارف القرآن)۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن لحن اور لَے سے پڑھتے تھے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 2

آیت۔5۔ میں اس عظیم مقصد کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے قیام لیل کی یہ ہدایت دی گئی ہے۔ ارشاد ہوا کہ ہم تم پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس بھاری بات کے تحمل کے لیے ایک پیشگی ریاضت اور تیاری کے طور پر یہ حکم ہوا، اس بھاری بات سے کیا مراد ہے، اس کے جواب میں مختلف اقوال منقول ہیں۔ زیادہ قرین قیاس رائے یہ ہے کہ اس سے مراد اندازِ عام ہے جس کا حکم اگلی سورہ میں قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ﴿۲﴾ اور اس کے بعد جہادِ عظیم کی تیاری کے لیے دیا گیا جس سے آپؐ کو صحابۂ کرامؓ کو اقامت دین کی راہ میں سابقہ پیش آنے والا تھا۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کی یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اس کو دوسری تمام تحریکات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کے لیے دوسرے وسائل و ذرائع کے فراہم ہونے سے پہلے معرفتِ رب، مستحکم ایمان، غیر متزلزل ایمان اور اپنے رب پر کامل اعتماد و توکل ضروری ہے۔ ان اوصاف کے حصول کا واحد ذریعہ نماز، اور بالخصوص شب کی نماز ہے۔ اسی چٹان پر اقامتِ دین کی جدوجہد کی بنیاد ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 3

چھوڑنا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک چھوڑنا تو وہ ہے جو لعن طعن کے بعد فساد و انتقام کے جذبے کے ساتھ ہو اس طرح کا چھوڑنا عام دنیاداروں کا شیوہ ہے۔ انبیاء و صالحین یہ شیوہ اختیار نہیں کرتے۔ وہ خلق کی اصلاح کی کوشش اپنی کسی ذاتی منفعت کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی ہدایت اور اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔ لوگ ان کی دل آزاری اور ناقدری کرتے ہیں تو انہیں غصہ یا نفرت کے بجائے ان کی محرومی اور بدانجامی پر صدقہ ہوتا ہے۔ وہ ان کے رویہ سے مجبور ہو کر ان کو چھوڑتے تو ہیں لیکن یہ چھوڑنا اسی طرح کا ہوتا ہے جس طرح ایک شریف باپ اپنے نالائق بیٹے کے رویہ پر خاموشی اور علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح کے چھوڑنے کو یہاں هَجْرًا جَمِيْلًا سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اس طرح کی علیحدگی بعض اوقات مفید نتائج پیدا کرتی ہے۔ جن کے اندر خیر کی کوئی رمق ہوتی ہے وہ اس شریفانہ طرز عمل سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنے رویہ کا جائزہ لینے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ (تدبر قرآن)۔

آیت نمبر (20)

ترکیب

ثُلُثَيِ دراصل ثُلُثَانِ تھا۔ اس پر مِنْ داخل ہوا تو یہ حالت جر میں ثُلُثَيْنِ ہو گیا۔ پھر یہ اَلَّيْل کا مضاف بنا تو نون اعرابی گر گیا اور یہ ثُلُثَيِ استعمال ہوا۔ نِصْفَهٗ اور ثُلُثَهٗ ظرف ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں اور ان کی ہٗ کی ضمیریں اَلَّيْلِ کے لیے ہیں۔ تُحْصُوْهُ میں ہٗ کی ضمیر قِيَامُ الَّيْل کے لیے ہے۔ اَنْ مضارع کو نصب دیتا ہے لیکن اگر مضارع پر سین آ جائے تو پھر اَنْ کا عمل ساقط ہو جاتا ہے۔ اس لیے اَنْ سَيَكُوْنُ آیا ہے۔ مَا تُقَدِّمُوْا کا مَا شرطیہ ہے۔ اس لیے تُقَدِّمُوْا مجزوم ہوا ہے۔ جبکہ تَجِدُوْا جواب شرط ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ خَيْرًا اور اَعْظَمَ کی نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے۔

ترجمہ

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ	اَنَّكَ تَقُوْمُ	اَدْنٰى	مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ
بیشک آپ کا رب جانتا ہے	کہ آپ کھڑے ہوتے ہیں	زیادہ قریب (تقریباً)	رات کے دو تہائی میں سے

وَنِصْفَهٗ	وَثُلُثَهٗ	وَطَآئِفَةٌ	مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ
اور (بھی) اس کے آدھے وقت	اور (کبھی) اس کے ایک تہائی وقت	اور ایک گروہ (بھی)	ان لوگوں میں سے جو آپؐ کے ساتھ ہیں

وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ	الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ	عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ
اور اللہ اندازہ مقرر کرتا ہے	رات کا اور دن کا	اس نے جانا کہ تم لوگ ہرگز نہ نباہ سکو گے اس (قیام الیل) کو

فَتَابَ عَلَيْكُمْ	فَاقْرَءُوْا	مَا تَيَسَّرَ	مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ
تو اس نے شفقت کی تم پر	پس تم لوگ قرأت کرو	اتنی جتنی آسان ہو	قرآن میں سے

عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ	مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ	وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ	يَبْتَغُوْنَ
اس نے جانا کہ ہوں گے	تم میں سے کچھ مریض	اور کچھ دوسرے سفر کریں گے زمین میں	تلاش کرتے ہوئے

مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ	وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ	فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ	فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ
اللہ کے فضل میں سے (روزی)	اور کچھ دوسرے قتال کریں گے	اللہ کی راہ میں	تو قرأت کرو اتنی جتنی آسان ہو اس میں سے

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ	وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ	وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ	قَرْضًا حَسَنًا ؕ	وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ
اور قائم کرو نماز کو	اور پہنچاؤ زکوٰۃ کو	اور قرض دو اللہ کو	ایک خوبصورت قرضہ	اور جو تم لوگ آگے بھیجو گے اپنے آپ کے لیے

مِّنۡ خَيۡرٍ	تَجِدُوۡهُ	عِنۡدَ اللّٰهِ	هُوَ خَيۡرًا	وَّاَعۡظَمَ اَجۡرًا ؕ
کوئی بھی نیکی	تو تم لوگ پاؤ گے اس کو	اللہ کے پاس	وہ بہترین ہوتے ہوئے	اور عظیم ہوتے ہوئے بلحاظ اجر کے

وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ ؕ	اِنَّ اللّٰهَ	غَفُوۡرٌ	رَّحِيۡمٌ ﴿۲۰﴾
اور مغفرت مانگو اللہ سے	بیشک اللہ	بے انتہا بخشنے والا	ہمیشہ رحم کرنے والا ہے

نوٹ: 1

یہ آیت جس کے ذریعہ نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی، شروع سورت کی آیات سے ایک سال یا آٹھ ماہ بعد نازل ہوئی ہے۔ مسند احمد، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ اس سورت کے شروع میں قیام اللیل کو فرض کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرامؓ اس کی پابندی کرتے رہے۔ سورت کا آخری حصہ اللہ تعالیٰ نے آسمان میں روک رکھا۔ سال بھر کے بعد آخری حصہ نازل ہوا جس میں قیام اللیل کی فرضیت منسوخ ہو کر تخفیف ہوگئی اور اس کے بعد قیام اللیل صرف نفل و مستحب رہ گیا۔ (معارف القرآن)۔

تفہیم القرآن میں اس رائے سے اختلاف کیا گیا ہے کہ یہ آخری آیت سورت کے نزول کے ایک سال بعد مکہ میں نازل ہوئی۔ صاحبِ تفہیم کی رائے ہے کہ یہ آخری آیت سورت کے نزول کے دس سال بعد مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس کی سند میں ایک تابعی حضرت سعید بن جبیرؒ کا قول نقل کیا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ ''پہلے رکوع کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ وہ مکہ معظّمہ میں نازل ہوا ہے۔ اور وہاں بھی اس کا نزول ابتدائی دور میں ہوا ہے جبکہ حضور ﷺ کی نبوت کا آغاز ہونے پر زیادہ سے زیادہ چار سال گزرے ہوں گے۔ بخلاف اس کے یہ دوسرا رکوع اپنے مضامین کی صریح شہادت کے مطابق مدینہ کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے، جب کفار سے جنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم بھی آچکا تھا۔''

لیکن میرا ذہن اس دلیل کو قبول کرنے سے معذور ہے۔ اس آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے میرا ذہن اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ بی بی عائشہ صدیقہؓ اور حضرت عباسؓ کے اقوال میں اور اس آیت کے مضامین میں کوئی بُعد یا تضاد نہیں ہے۔ میں اپنی رائے نقل کر رہا ہوں تاکہ امانت ادا ہو جائے۔

سورۃ المزمل کے پہلے رکوع کے نزول کے لگ بھگ ایک سال بعد جب یہ آیت نازل ہوئی ہے، اس وقت صورتحال یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ آدھی آدھی رات، ایک ایک تہائی رات اور کبھی دو تہائی رات عبادت میں گزار کر قیام اللیل کے حکم کو نباہ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بات کا آغاز ہی اسی صورتحال کی تحسین سے کیا ہے۔ اور پھر اس حکم میں تخفیف کی وجہ بیان کی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس تخفیف کی بنیاد نہ کسی ایسی صورتحال پر تھی جو اس وقت موجود تھی اور نہ کسی ایسے واقعہ پر تھی جو وقوع پذیر ہو چکا تھا بلکہ اس کی بنیاد ایسے حالات و واقعات پر تھی جو مستقبل میں پیش آنے والے تھے اور اللہ کو ان کا علم تھا۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر جب ہم آیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو کسی ابہام کے بغیر بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تم لوگ قیام اللیل کے فرض کو ابھی تو نباہ رہے ہو لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آگے چل کر تم لوگ اسے ہرگز نہ نباہ سکو گے۔ اس لیے اس حکم کی فرضیت ختم ہے۔ اس کا نعم البدل یہ ہے کہ تلاوتِ قرآن کا اہتمام کرو۔ جو لوگ رات میں عبادت کے لیے جاگیں ان کے لیے اب نصف شب کے لگ بھگ عبادت کرنا ضروری نہیں ہے۔ جو جتنی دیر آسانی سے عبادت کر سکے اور تلاوت کر سکے وہ کر لے۔ اور جو لوگ رات میں جاگ نہیں سکتے وہ دن میں تلاوت کا خصوصی اہتمام کریں۔

اس کے بعد اُن چند وجوہات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے یہ تخفیف کا حکم دیا گیا تھا۔ اس میں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ بات کا آغاز اَنْ یَّکُوْنَ سے نہیں کیا گیا، کیونکہ اس میں حال اور مستقبل دونوں کے معنی ہیں۔ اس کے بجائے بات کا آغاز اَنْ سَیَکُوْنُ سے کیا گیا تا کہ حال کے معنی ختم ہو جائیں۔ اس لیے آیت کے متعلقہ جز کے معنی اب یہ نہیں رہے کہ تم میں کچھ مریض ہو جاتے ہیں کچھ تجارتی سفر کرتے ہیں اور کچھ قتال کرتے ہیں، بلکہ اب معنی صرف یہ رہ گئے کہ تم میں کچھ مریض ہو جائیں گے، کچھ تجارتی سفر کریں گے اور کچھ قتال کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آگے چل کر پیش آنے والے ایسے حالات کے پیش نظر یہ حکم اتارا گیا تھا۔ واضح رہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت بھی لوگ بیمار پڑتے تھے لیکن اس وقت لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ جیسے جیسے انسان مہذب ہوتا جائے گا، اُس کے جسمانی نظام کی قوت مدافعت کمزور ہوتی جائے گی اور نت نئے امراض کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ البتہ اللہ جانتا تھا۔ اس وقت بھی صحابہ کرامؓ معاشی اور تجارتی کام کرتے تھے لیکن قریش کے تجارتی قافلوں میں ان کی عدم شمولیت کی وجہ سے ان کے تجارتی سفر نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ اور ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ صورتحال کبھی تبدیل ہوگی۔ لیکن اللہ جانتا تھا کہ نہ صرف ان کے تجارتی اسفار میں اضافہ ہونے والا ہے بلکہ ایک وقت وہ بھی آنے والا ہے جب اہل ایمان اندلس سے انڈونیشیا تک، یعنی اس وقت کی معلوم دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک تجارتی سفر کریں گے۔ اس وقت صحابہ کرامؓ کو قتال کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن اللہ جانتا تھا کہ نہ صرف قتال کی اجازت دی جائے گی بلکہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب قتال فرض قرار دیا جائے گا۔ اس طرح مستقبل کی صورت حال کی طرف اشارے کر کے صحابہ کرامؓ کو تسلی بھی دی گئی اور ان کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ مستقبل کے یہ حالات ایسے یقینی ہیں کہ ان کی وجہ سے تخفیف کا حکم بھی نازل کیا جا رہا ہے۔

اس آیت کے زمانۂ نزول کے متعلق بی بی عائشہ صدیقہؓ اور ابن عباسؓ کے اقوال پر شک کرنے کی دوسری وجہ آیت کا اگلا حصہ ہے جس میں مستقبل کی طرف اشارے کرنے کے بعد پھر قیام اللیل کے نعم البدل یعنی تلاوت قرآن کے ذکر کے ساتھ ہدایت دی گئی کہ نماز قائم رکھو، زکوٰۃ پہنچاتے رہو اور اللہ کو قرضِ حسنہ دیتے رہو۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نماز معراج میں اور زکوٰۃ ہجرت کے بعد فرض ہوئی ہے اس لیے یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن یہ دلیل بھی قابل قبول نہیں ہے۔ معراج میں پانچ وقت کی نمازیں اپنے اوقات کے تعین کے ساتھ فرض ہوئی ہیں لیکن نماز کی ہدایت اس سے پہلے سے موجود تھی۔ مکی صورتوں میں جگہ جگہ واضح الفاظ میں یہ ہدایت موجود ہے۔ بات کو سمجھنے کے لیے اِن شاء اللہ ایک ہی آیت کا حوالہ کافی ہوگا۔ سورہ ھود کی آیت۔ 114۔ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اور آپؐ قائم رکھیں نماز کو دن کے دونوں کناروں پر اور کچھ حصّوں میں رات میں سے۔'' آیت کے اس جز کی تشریح تفہیم القرآن میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ دن کے دونوں سروں پر سے مراد صبح اور مغرب اور کچھ رات گزرنے پر سے مراد عشاء کا وقت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ارشاد اس زمانے کا ہے جب نماز کے لیے ابھی پانچ وقت مقرر نہیں کیے گئے تھے۔ معراج کا واقعہ اس کے بعد پیش آیا جس میں پنج وقتہ نماز فرض ہوئی۔'' اب کوئی ابہام نہیں رہتا کہ آیت زیر مطالعہ میں اس وقت کی ہدایت کے مطابق نماز قائم کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔

اسی طرح سے زکوٰۃ کے قواعد وضوابط کو آخری شکل یقیناً مدینہ میں دی گئی ہے لیکن زکوٰۃ کا حکم پہلے سے موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد مکی سورتوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً سورۃ المؤمنون کی پہلی گیارہ آیات میں مومنوں کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے آیت نمبر۔4۔ میں ہے کہ وہ لوگ زکوٰۃ پر عمل پیرا ہیں۔ اس کی تشریح میں ''ابن کثیر اور دیگر مفسرین کا کہنا ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت مکہ ہی میں ہو چکی تھی۔ مگر سرکاری طور پر اس کے وصول کرنے کا انتظام اور نصابات وغیرہ کی تفصیلات مدینہ جانے کے بعد جاری ہوئیں۔'' (معارف القرآن)

ان وجوہات کی بنا پر میرا ذہن اس پر آمادہ نہیں ہوتا کہ جلیل القدر صحابۂ کرام کے اقوال کو چھوڑ کر ایک تابعیؒ کے قول کو ترجیح دی جائے، اور وہ بھی آیات کے زمانۂ نزول کے بارے میں۔ 6940

نوٹ:2 مَا قَدَّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیج دیا وہ تمہارے لیے اس سے زیادہ نفع بخش ہے جو تم نے دنیا میں روک رکھا اور کسی بھلائی کے کام میں اللہ کی رضا کی خاطر خرچ نہ کیا۔ ایک مرتبہ رسول اللہؐ نے پوچھا تم میں سے کون ہے جس کو اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہے۔ لوگوں نے عرض کیا ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو۔ فرمایا سوچ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارا حال واقعی یہی ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ تمہارا اپنا مال تو وہ ہے جو تم نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیج دیا اور جو کچھ تم نے روک کر رکھا وہ تو وارث کا مال ہے۔ (تفہیم القرآن)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ (74)

آیت نمبر (1 تا 7)

د	ث	ر

(ن) دُثُوْرًا کپڑے کا میلا ہونا۔ بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونا۔

(تفعل) تَدَثُّرًا اِدَّثَّرَا۔ کپڑا اوڑھنا۔ کپڑے میں لپٹنا۔

مُدَّثِّرٌ اسم الفاعل ہے۔ کپڑے میں لپٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔1۔

ترجمہ

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾	قُمْ فَاَنْذِرْ ۖ﴿۲﴾
اے کپڑے میں لپٹنے والے	آپؐ کھڑے ہوں پھر آپ خبردار کریں (لوگوں کو)
وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۖ﴿۳﴾	وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۖ﴿۴﴾
اور اپنے رب کی پھر آپؐ بڑائی بیان کریں	اور اپنے کپڑوں کو پھر آپؐ پاک رکھیں
وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۖ﴿۵﴾	وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۖ﴿۶﴾
اور گندگی کو پس آپؐ چھوڑ دیں	اور آپؐ احسان کریں کثرت (بہت معاوضہ) چاہتے ہوئے
وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۗ﴿۷﴾	
اور اپنے رب کے لیے پھر آپؐ ثابت قدم رہیں	

نوٹ:1 آیت۔3۔ میں حکم دیا گیا کہ صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کیجئے، قول سے بھی اور عمل سے بھی۔ اس جگہ لفظ رب اس لیے اختیار کیا گیا کہ یہ اس

حکم کی علت ہے کیونکہ جو سارے جہان کا پالنے والا ہے صرف وہی ہر بڑائی اور کبریائی کا مستحق ہے (معارف القرآن) انبیاء علیہم السلام کی 6940
دعوت میں توحید کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے یعنی صرف اللہ ہی کی کبریائی و یکتائی کا اعلان کہ اللہ کے سوا جو بھی کبریائی کے مدعی ہیں یا جن کی کبریائی کا دعوٰی کیا جاتا ہے، وہ سب باطل ہیں۔ ایک جاہلی معاشرہ میں یہ اعلان ساری خدائی سے لڑائی مول لینے کے ہم معنی تھا لیکن دین کی بنیاد چونکہ اسی کلمہ پر ہے اس لیے ہر نبی کو بے رنگ یہ اعلان کرنا پڑا۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:2

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۔ یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو، کیونکہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہؐ جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت و نظافت کے بھی ابتدائی تصورات تک سے خالی تھا اور حضورؐ کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا۔ اس لیے ہدایت فرمائی گئی کہ آپؐ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضورؐ نے نوع انسانی کو طہارتِ جسم و لباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانۂ جاہلیت کے اہل عرب تو درکنار، آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے، حتیٰ کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو لفظ ''طہارت'' کا ہم معنی ہو۔ بخلاف اس کے اسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے۔

ان الفاظ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنا لباس صاف ستھرا رکھو۔ راہبانہ تصورات نے دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کچیلا ہو، اتنا ہی زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اُجلے کپڑے پہن لیتا تو سمجھا جاتا کہ وہ دنیادار انسان ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اس کی ظاہری حالت بھی پاکیزہ اور نفیس ہو۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو یعنی لباس صاف ستھرا تو ضرور ہو لیکن اس میں فخر و غرور، شان و شوکت اور نمائش کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔

چوتھا مفہوم یہ ہی کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اردو زبان کی طرح عربی زبان میں بھی پاک دامنی کے ہم معنی الفاظ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ متعدد اکابر مفسرین نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

رُجْزٌ ۔ رِجْزٌ ۔ اور رِجْسٌ تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس کا استعمال اُس گندگی کے لیے ہوتا ہے جس کو دیکھ کر طبیعت میں ارتعاش اور گھن پیدا ہو۔ یوں تو اس سے ہر قسم کی گندگی مراد ہو سکتی ہے لیکن یہاں یہ خاص طور پر شرک کی گندگی کے لیے آیا ہے کہ اپنے دامن کو شرک کے چھینٹوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شرک کی ناپاکی سے دور رہو۔ اس ہدایت کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ العیاذ باللہ آپؐ کے کسی شرک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ تھا۔ مقصود صرف کفار و مشرکین کو آگاہ کرنا تھا کہ وہ جان لیں کہ جو خبردار کرنے والا ان کے پاس آیا ہے اس کا موقف ان کے دینِ شرک کے بارے میں کیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے اس باب میں کن ہدایات کے ساتھ مبعوث ہوا ہے (تدبر قرآن)

آیت نمبر (8تا25)

6940

ع ب س

(ض) عَبَسَا ترش روئی کرنا۔تیوری چڑھائی۔زیر مطالعہ آیت۔22۔

(ض) عَبُوْسٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔صفت کے طور پر آتا ہے۔انتہائی ترش بدمزاج۔﴿اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝۱۰﴾ (76/الدھر:10)''بیشک ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے ایک ایسے دن سے جو انتہائی ترش، بہت شدید ہے۔''

ب س ر

(ن) بُسُوْرًا (۱) منہ بگاڑنا۔منہ بسورنا۔(مایوسی سے)۔(۲) چہرے کا اداس ہونا۔چہرے کا مرجھانا۔زیر مطالعہ آیت۔22۔

بَاسِرَةٌ اسم الفاعل بَاسِرٌ کا مؤنث ہے۔اداس ہونے والا۔مرجھانے والا۔﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌ ۝۲۴﴾ (75/القیامۃ:24)''کچھ چہرے اس دن مرجھانے والے ہیں۔''

ترکیب

(آیت۔9۔10) فَذٰلِكَ کا اشارہ گزشتہ آیت میں اِذَا نُقِرَ کی طرف ہے۔يَوْمَئِذٍ نکرہ مخصوصہ ہے۔يَوْمٌ عَسِيْرٌ (مرکب توصیفی) اور غَيْرُ يَسِيْرٍ (مرکب اضافی) دونوں اس کی خصوصیت ہیں۔(آیت۔11) ذَرْ فعل امر کا مفعول بِہٖ کی ضمیر ہے اور مَنْ خَلَقْتُ کا مفعول مقدم ہے۔جبکہ وَحِيْدًا حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔اس کو خَلَقْتُ کی ضمیر فاعلی کا حال بھی مانا جاسکتا ہے۔ایسی صورت میں مطلب ہوگا کہ میں نے تنہا اس کو پیدا کیا۔اس کام میں کوئی بھی میرا شریک نہیں اور اس کو مَنْ کا حال مانا جاسکتا ہے۔ایسی صورت میں اس کے دو مطلب ہوں گے۔ایک یہ کہ ہر انسان (مَنْ واحد۔جمع۔مذکر۔مؤنث سب کے لیے آتا ہے) ماں کے پیٹ سے اکیلا آتا ہے۔مال و اولاد اور دیگر ساز و سامان ساتھ نہیں لاتا۔دوسرا یہ کہ اس کو اپنے ماں باپ کا اکلوتا پیدا کیا، (آیت۔12۔13) جَعَلْتُ کا مفعول مَالًا اور بَنِيْنَ ہے۔شُهُوْدًا کو جَعَلْتُ کا تیسرا مفعول بھی مانا جاسکتا ہے ایسی صورت میں مطلب ہوگا موقع پر حاضر رہنے والے یعنی نوکر چاکر، اور اس کو بَنِيْنَ کا حال بھی مانا جاسکتا ہے۔(حافظ احمد یار صاحب)۔ہماری رائے ہے کہ چونکہ بَنِيْنَ اور شُهُوْدًا کے درمیان واؤ عاطفہ نہیں ہے اس لیے بہتر ہے کہ شُهُوْدًا کو بَنِيْنَ کا حال مانا جائے۔

ترجمہ

فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۝۸	فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ	يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝۹
پھر جب پھونکا جائے گا بگل میں	تو وہ (واقعہ) ایسے دن ہوگا جو	ایک دشوار دن ہے

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝۱۰	ذَرْنِيْ	وَمَنْ	خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝۱۱
کافروں پر کسی نرمی کے بغیر ہے	آپ چھوڑ دیں مجھ کو	اور اس کو جس کو	میں نے پیدا کیا تنہا ہوتے ہوئے

وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝۱۲	وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝۱۳	وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ	تَمْهِيْدًا ۝۱۴
اور میں نے بنایا اس کے لیے بڑھایا ہوا مال	اور بیٹے حاضر رہنے والے	اور میں نے ہموار کیا اس کے لیے (راہوں کو)	جیسے ہموار کرتے ہیں

ثُمَّ يَطْمَعُ	اَنْ اَزِيْدَ ﴿۱۵﴾	كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ	لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ﴿۱۶﴾
پھر وہ للچاتا ہے	کہ میں زیادہ کروں	ہرگز نہیں! بیشک وہ تھا	ہماری آیتوں کی مخالفت کرنے والا

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾	اِنَّهٗ فَكَّرَ	وَقَدَّرَ ﴿۱۸﴾
میں مبتلا کروں گا اس کو ایک دشوار چڑھائی میں	بیشک اس نے غور و فکر کیا	اور قدر و قیمت طے کی

فَقُتِلَ	كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾	ثُمَّ
تو مارا جائے (ستیاناس ہو جائے)	کیسی اس نے قیمت طے کی	پھر (I Repeat)

قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾	ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾	ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾
مارا جائے کیسی اس نے قیمت طے کی	پھر اس نے نظر دوڑائی	پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بسورا

ثُمَّ اَدْبَرَ	وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾	فَقَالَ اِنْ هٰذَآ
پھر اس نے پیٹھ پھیری	اور بڑا بنا	تب اس نے کہا نہیں ہے یہ

اِلَّا سِحْرٌ	يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾	اِنْ هٰذَآ اِلَّا	قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾
مگر ایک ایسا جادو جو	نقل کیا جاتا ہے	نہیں ہے یہ مگر	اس بشر کا قول

نوٹ: 1

اس سورۃ میں پہلی سات آیات مکہ معظّمہ کے بالکل ابتدائی دور کی نازل شدہ ہیں۔ سورۃ کا باقی ماندہ حصّہ آیت۔8 سے آخر تک اس وقت نازل ہوا جب اسلام کی علانیہ تبلیغ شروع ہو جانے کے بعد مکہ میں پہلی مرتبہ حج کا موقع آیا۔ اور مکہ کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے، اگر محمدؐ نے ان قافلوں کی قیام گاہوں پر حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور اجتماعات میں قرآن جیسا موثر کلام سنایا تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون اس سے متاثر ہو جائے۔ اس لے قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی جس میں طے کیا گیا کہ حاجیوں کے آتے ہی ان کے اندر رسول اللہؐ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اس پر اتفاق رائے ہو گیا تو ولید بن مغیرہ نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو ہم سب کا اعتبار جاتا رہے گا۔ اس لیے کوئی ایک بات طے کر لو جسے سب بالا اتفاق کہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہم کاہن کہیں گے۔ ولید نے کہا قرآن کو کاہنوں سے دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ کچھ نے کہا انہیں مجنون کہا جائے۔ ولید نے کہا کون باور کرے گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کلام پیش کرتے ہیں وہ دیوانگی کی بڑ ہے یا جنون کے دورے میں آدمی یہ باتیں کر سکتا ہے۔ لوگوں نے کہا اچھا تو پھر ہم شاعر کہیں گے۔ ولید نے کہا کہ ہم شعر کی ساری اقسام سے واقف ہیں۔ اس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ لوگ بولے تو ان کو ساحر کہا جائے۔ ولید نے کہا جادوگر اپنے جادو کے لیے جو طریقے اختیار کرتے ہیں، ان سے بھی ہم واقف ہیں۔ یہ بات بھی ان پر چسپاں نہیں ہوتی۔ پھر ولید نے کہا ان باتوں میں سے جو بات بھی تم کرو گے، لوگ اسے ناروا الزام سمجھیں گے۔ خدا کی قسم اس کلام میں بڑی حلاوت ہے۔ اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمر دار ہیں۔ اس پر ابوجہل ولید کے سر ہو گیا اور اس نے کہا تمہاری قوم تم سے راضی نہ ہو گی جب تک تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں

کوئی بات نہ کہو۔ اس نے کہا اچھا مجھے سوچ لینے دو۔ پھر سوچ سوچ کر بولا قریب ترین بات جو کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو یہ شخص جادوگر ہے۔ یہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو آدمی کو باپ۔ بھائی۔ بیوی۔ بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اس بات کو سب نے قبول کر لیا۔ پھر ایک منصوبہ کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وجود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انہوں نے لوگوں کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اٹھ کھڑا ہوا ہے جو بڑا جادوگر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفریق ڈال دیتا ہے، اس سے ہوشیار رہنا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے رسول اللہؐ کا نام خود ہی سارے عرب میں مشہور کر دیا۔ یہی واقعہ ہے جس پر اس سورہ کے دوسرے حصّے یعنی آیت۔8۔ سے آخر تک، میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن۔ ج6۔ ص138 تا140 سے ماخوذ)

آیت نمبر (26 تا37)

ترکیب

(آیت۔27) سَقَرُ غیر منصرف ہے اور مؤنث سماعی بھی ہے۔ اس لیے آگے مُبْقِیْ۔ تَذَرُ۔ لَوَّاحَةٌ اس کے لیے مؤنث کے صیغے آئے ہیں اور آگے اس کے لیے ضمیریں بھی مؤنث کی آئی ہیں۔ (آیت۔29) لَوَّاحَةٌ خبر ہے۔ اس کا مبتدا ھِیَ محذوف ہے۔ لِلْبَشَرِ متعلق خبر ہے اور اس پر لام جنس ہے اس لیے اس کا ترجمہ جمع میں ہوگا۔ (آیت۔30) عَلَيْهَا کی ضمیر سَقَرُ کے لیے ہے۔ (آیت۔31) لِيَسْتَيْقِنَ کے لام کَیْ پر عطف ہونے کی وجہ سے يَزْدَادَ اور يَرْتَابَ، دونوں مضارع حالت نصب میں آئے ہیں کیونکہ لام کَیْ کے بعد اَنْ مقدر ہوتا ہے۔ وَمَا هِيَ ذِكْرٰى میں ھِیَ بھی سَقَرُ کے لیے ہے اور آیت۔ 26۔ سے اس کی جو بات چلی آ رہی ہے اسے ذِكْرٰى کہا ہے۔ (آیت۔35۔36) اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ میں اِنَّهَا کی ضمیر بھی سَقَرُ کے لیے ہے اور اَلْكُبَرِ۔ كُبْرٰى کی جمع ہے۔ نَذِيْرًا۔ اِنَّهَا کا حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ فَعِيْلٌ کے وزن پر آنے والے اسماء الصفہ میں کبھی مذکر مؤنث میں فرق کرنے کے لیے تائے ثانیث لگاتے ہیں اور کبھی نہیں بھی لگاتے۔ اس لیے یہاں نَذِيْرَةً کے بجائے نَذِيْرًا بھی درست ہے۔

ترجمہ

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾	لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾
میں ڈالوں گا اس کو جھلسانے والی (دوزخ) میں	اور آپ کیا جانیں کیا ہے جھلسانے والی	وہ باقی نہیں رہنے دیتی اور نہ چھوڑتی ہے

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾	عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾	وَمَا جَعَلْنَآ	اَصْحٰبَ النَّارِ
جھلسانے والی ہے انسانوں کو	اس پر انیس (فرشتے) ہیں	اور ہم نے نہیں بنایا (کسی کو)	آگ والے (داروغہ)

اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ	وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ	اِلَّا فِتْنَةً	لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ
مگر کچھ فرشتوں کو	اور ہم نے نہیں بنایا ان کی گنتی کو	مگر ایک آزمائش	ان کے لیے جنہوں نے کفر کیا

لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ	اُوْتُوا الْكِتٰبَ	وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا	اِيْمَانًا
تا کہ یقین حاصل کریں وہ لوگ جن کو	دی گئی کتاب	اور زیادہ ہوں وہ لوگ جو ایمان لائے	بلحاظ ایمان کے

وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ	اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ	وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ
اور تا کہ شبہہ میں نہ پڑیں وہ لوگ جن کو	دی گئی کتاب اور مومن لوگ	اور تا کہ کہیں وہ لوگ

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ	وَّالْكٰفِرُوْنَ	مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ	بِهٰذَا مَثَلًا ؕ
جن کے دلوں میں ایک روگ ہے	اور کافر لوگ	کیا ارادہ کیا اللہ نے	اس (گنتی) سے بطور مثال کے

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ	مَنْ يَّشَآءُ	وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ	وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ
اس طرح پھسلا دیتا ہے اللہ	اس کو جس کو وہ چاہتا ہے	اور وہ ہدایت دیتا ہے اس کو جس کو وہ چاہتا ہے	اور نہیں جانتا آپؐ کے رب کے لشکروں کو (کوئی بھی)

اِلَّا هُوَ ؕ	وَمَا هِيَ	اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾	كَلَّا وَالْقَمَرِ ۙ﴿۳۲﴾
مگر وہی	اور نہیں ہے یہ (سقر کی بات)	مگر ایک یاددہانی انسانوں کے لیے	ہرگز نہیں! قسم ہے چاند کی

وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۙ﴿۳۳﴾	وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۙ﴿۳۴﴾	اِنَّهَا	لَاِحْدَى الْكُبَرِ ۙ﴿۳۵﴾
قسم ہے رات کی جب اس نے پیٹھ پھیری	قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہوتی ہے	بیشک یہ (بات)	یقیناً بہت بڑی باتوں کی ایک ہے

نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ۙ﴿۳۶﴾	لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ	اَنْ يَّتَقَدَّمَ	اَوْ يَتَاَخَّرَ ؕ﴿۳۷﴾
خبردار کرنے والی ہوتے ہوئے انسانوں کے لیے	اس کے لیے جو چاہے تم میں سے	کہ وہ آگے بڑھے	یا (چاہے تو) پیچھے رہے

نوٹ: 1

آیت۔30۔ میں ہے کہ دوزخ پر انیس فرشتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے دوزخ کے انتظام پر جو فرشتوں کا لشکر ہوگا اس کے افسر انیس فرشتے ہوں گے۔ جن میں سب سے بڑے ذمہ دار کا نام مالک ہے۔ (دیکھیں آیت۔ 43۔ 77، نوٹ۔ 1) حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے نہایت تفصیل سے انیس کے عدد کی حکمتیں بیان کی ہیں جو قابل دید ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جہنم میں مجرموں کو عذاب دینے کے لیے انیس قسم کے فرائض ہیں۔ جن میں سے ہر فرض کی انجام دہی ایک ایک فرشتے کی سرکردگی میں ہوگی۔ کوئی شبہ نہیں کہ فرشتہ کی طاقت بہت بڑی ہے اور ایک فرشتہ وہ کام کرسکتا ہی جو لاکھوں آدمی مل کے نہیں کر سکتے۔ لیکن یاد رہے کہ ہر فرشتے کی یہ قوت اسی دائرے میں محدود ہے جس کام کے کرنے کے لیے وہ مامور ہوا ہے۔ مثلاً ملک الموت لاکھوں آدمیوں کی جان ایک آن میں نکال سکتا ہے۔ مگر عورت کے پیٹ میں ایک بچے کے اندر جان نہیں ڈال سکتا۔ حضرت جبریلؑ چشم زدن میں وحی لا سکتے ہیں لیکن پانی برسانا ان کا کام نہیں ہے۔ جس طرح کان دیکھ نہیں سکتا، آنکھ سن نہیں سکتی۔ اسی طرح اگر ایک فرشتہ عذاب کے واسطے دوزخیوں پر مقرر ہوتا تو اس سے ایک ہی قسم کا عذاب دوزخیوں پر ہوسکتا ہے۔ دوسری قسم کا عذاب جو اس کے دائرہ استعداد سے باہر ہے ممکن نہ تھا۔ اس لیے انیس قسم کے عذابوں کے لیے، جن کی تفصیل تفسیر عزیزی میں ہے، انیس ذمہ دار فرشتے مقرر ہوئے علماء نے اس عدد کی حکمتوں پر بہت کچھ کہا ہے مگر احقر کے نزدیک حضرت شاہ صاحبؒ کا کلام بہت عمیق ولطیف ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ: 2

اگلی آیت۔ 31۔ میں دوزخ کے کارکنوں کی تعداد بیان کرنے کی وجہ بیان کرنے کی وجہ بیان کی گئی کہ یہ تعداد اس لئے بیان کی گئی کہ یہ ہر اس شخص کے لیے فتنہ بن جائے جو اپنے اندر کوئی کفر چھپائے بیٹھا ہو۔ اگر وہ خدا کی عظیم قدرتوں کے بارے میں یا وحی و رسالت کے بارے میں شک کا کوئی شائبہ بھی اپنے دل میں رکھتا ہے، تو یہ سنتے ہی کہ خدا کی اتنی بڑی جیل میں بے حد وحساب مجرموں کو صرف 19 سپاہی قابو میں رکھیں گے اور فرداً فرداً ایک ایک شخص کو عذاب بھی دیں گے، تو اس کا کفر فوراً کھل کر باہر آجائے گا۔

دوسری وجہ یہ بتائی گئی کہ اہل کتاب اس سے یقین حاصل کریں گے۔ بعض مفسرین نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ اہل کتاب کے ہاں چونکہ ان کی کتابوں میں جو دوزخ کے فرشتوں کی یہی تعداد بیان کی گئی ہے اس لیے یہ بات سن کر ان کو یقین آجائے گا کہ یہ

بات فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی کی فرمائی ہوئی ہے۔لیکن دو وجوہ سے یہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔اوّل یہ کہ یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں یہ بات کہیں نہیں ملتی کہ دوزخ کے فرشتوں کی تعداد 19 ہے۔دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جو اہل کتاب کی مذہبی کتابوں میں بھی بیان کی گئی ہیں۔لیکن وہ لوگ اس کی یہ توجیہ کر دیتے ہیں کہ محمدؐ نے یہ باتیں ان کی کتابوں سے نقل کر لی ہیں۔ان وجوہ سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ محمدؐ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میری زبان سے دوزخ کے انیس فرشتوں کا ذکر سنکر میرا خوب مذاق اڑایا جائے گا۔اس کے باوجود بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی وحی میں بیان ہوئی تھی اسے انہوں نے کسی جھجک کے بغیر لوگوں کے سامنے پیش کر دیا اور کسی مذاق استھزاء کی پرواہ نہ کی۔جہلائے عرب تو انبیاء کی اس شان سے ناواقف تھے،مگر اہل کتاب خوب جانتے تھے کہ انبیاء کا ہر زمانے میں یہی طریقہ رہا ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے آتا تھا اسے وہ جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دیتے تھے۔اس بنا پر اہل کتاب سے یہ بات زیادہ متوقع تھی کہ رسول اللہؐ کے اس طرز عمل کو دیکھ کر انہیں یقین آ جائے گا کہ ایسے سخت مخالف ماحول میں ایسی بظاہر انتہائی عجیب بات کو کسی جھجک کے بغیر پیش کر دینا ایک نبی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔(تفہیم القرآن)

آیت نمبر (38 تا 56)

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ	رَهِيْنَةٌ ۙ﴿۳۸﴾	اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ؕ﴿۳۹﴾
ہر جان،اس میں جو اس نے کمائی کی	گروی رکھی ہوئی ہے	سوائے داہنی طرف والوں کے

فِيْ جَنّٰتٍ ؕ يَتَسَآءَلُوْنَ ۙ﴿۴۰﴾	عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۙ﴿۴۱﴾	مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾
(وہ لوگ) باغات میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے	مجرموں کے بارے میں	(پھر مجرموں سے پوچھیں گے) کس چیز نے ڈالا تم کو دوزخ میں

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۙ﴿۴۳﴾	وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ	الْمِسْكِيْنَ ۙ﴿۴۴﴾	وَكُنَّا نَخُوْضُ
وہ لوگ کہیں گے ہم نہیں تھے نمازیوں میں سے	اور ہم نہیں کھلایا کرتے تھے	مسکینوں کو	اور ہم لاحاصل بحث کیا کرتے تھے

مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۙ﴿۴۵﴾	وَكُنَّا نُكَذِّبُ	بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۙ﴿۴۶﴾	حَتّٰٓى اَتٰىنَا
بحث کرنے والوں کے ساتھ	اور ہم جھٹلایا کرتے تھے	بدلے کے دن کو	یہاں تک کہ آن پہنچا ہمارے پاس

الْيَقِيْنُ ؕ﴿۴۷﴾	فَمَا تَنْفَعُهُمْ	شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾	فَمَا لَهُمْ
وہ یقین (موت)	تو نفع نہیں دے گی ان کو	شفاعت کرنے والوں کی شفاعت	تو انہیں کیا (ہو گیا) ہے

عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ۙ﴿۴۹﴾	كَاَنَّهُمْ	حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۙ﴿۵۰﴾
(کہ) اس یاددہانی سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں	(ایسے) جیسے کہ وہ لوگ	بدکنے والے ایسے گدھے ہیں جو

فَرَّتْ	مِنْ قَسْوَرَةٍ ؕ﴿۵۱﴾	بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ	اَنْ يُّؤْتٰى
بھاگے	کسی شیر (شیرانِ خدا کی دہشت) سے	بلکہ چاہتا ہے ہر مرد ان میں سے	کہ اس کو دیئے جائیں

صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۙ﴿۵۲﴾	كَلَّا ؕ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ؕ﴿۵۳﴾	كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۚ﴿۵۴﴾
کھولے ہوئے اوراق	ہرگز نہیں بلکہ یہ لوگ خوف نہیں محسوس کرتے آخرت کا	ہرگز نہیں بیشک یہ (قرآن) ایک یاددہانی ہے

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهُ ﴿۵۵﴾	وَمَا يَذْكُرُوْنَ	اِلَّآ اَنْ 6940
تو جو چاہے وہ یاد کرے اس کو	اور وہ لوگ یاد نہیں کریں گے	سوائے اس کے کہ

يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ	هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى	وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾ ع
چاہے اللہ	وہی تقویٰ کیے جانے کا اہل ہے	بخش دینے کا اہل ہے

نوٹ: 1

زیر مطالعہ آیات۔40 تا48۔ میں جن مجرمین کا ذکر ہے ان کے متعلق یہ بات ذہن میں واضح کرلیں کہ یہ ملحدوں یا کافروں کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایسے مسلمانوں کا ذکر ہے جو ایمانیات کو مانتے ہیں اور دل سے مانتے ہیں۔ آخرت کا اقرار کرتے ہیں لیکن دنیاوی معاملات میں الجھتے وقت آخرت میں جوابدہی اور حساب کتاب کا خوف محسوس نہیں کرتے۔ اس طرح آخرت کی تکذیب عملی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے عمل میں کمزور ہیں۔ ٹی۔ وی دیکھ رہے ہیں یا کسی مجلس میں شخصیات پر گرما گرم بحث میں مبتلا ہیں، کسی کی غیبت ہے، کسی پر بہتان ہے یا روزہ رکھا ہوا ہے اور روزہ بہلانے کے لیے کلب میں بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں، ایسے میں اذان کی آواز آجاتی ہے تو جلدی سے اپنا کام روک دیتے ہیں۔ اذان کا جواب دیتے ہیں اذان ختم ہونے کی دعا پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیر کے پھر شروع ہو جاتے ہیں اور نماز پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ البتہ اگر کبھی غیرتِ اسلامی کے مظاہرے کا موقع آجائے تو جلسہ جلوس، مار کٹائی، ڈکیتی اور قتل و غارتگری میں اسلام کی سربلندی کے لیے اس طرح شریک ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حدود اور رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی ہدایات کو پیروں تلے روند کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ اسلام کی خاطر ان کی سرفروشی کو دیکھ کر ہمارے جیسے کچے پکے مسلمان ان کو خود سے بہتر مسلمان سمجھتے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے اگر معافی دے کر اپنی رحمت سے ہمیں جنت میں بھیج دیا یا رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے طفیل ہمیں دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دیا گیا، تو وہاں ہم ایسے سرفروشوں کو تلاش کریں گے اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ وہ جیالے کدھر ہیں، نظر نہیں آتے۔ پھر جب جنت کو چھوڑ کر دوزخ کا جائزہ لیں گے تو وہاں وہ نظر آجائیں گے اور ہم حیران ہو کر پوچھیں گے کہ حضرت آپ یہاں کیسے۔ اس وقت جو مکالمہ ہوگا، آیت۔47۔ تک میں اس کا بیان ہے اور آیت۔48۔ میں ایسے مجرموں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حتمی فیصلے کا بیان ہے۔ (مرتب)

وہ جو کہیں گے کہ ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہ تھے جنہوں نے خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتب کو مان کر خدا کا وہ اوّلین حق ادا کیا ہو جو ایک خدا پرست انسان پر عائد ہوتا ہے یعنی نماز۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نماز کوئی شخص اس وقت تک پڑھ ہی نہیں سکتا جب تک وہ ایمان نہ لایا ہو۔ اس لیے نمازیوں میں سے ہونا آپ سے آپ ایمان لانے والوں میں سے ہونے کو مستلزم ہے۔ لیکن نمازیوں میں سے نہ ہونے کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دے کر یہ بات واضح کر دی گئی کہ ایمان لا کر بھی آدمی دوزخ سے نہیں بچ سکتا اگر وہ تارکِ نماز ہو۔ (تفہیم القرآن)۔

مجرموں کے جواب کا آخری جملہ بہت اہم ہے جس میں انہوں نے کہا ''یہاں تک کہ آن پہنچا ہمارے پاس وہ یقین'' یعنی موت۔ ایک طرف اس میں حسرت ہے کہ قبل اس کے کہ ہم توبہ کرتے اور اپنی اصلاح کرتے، ہمارا وقت پورا ہو گیا اور ہمیں توبہ کا موقع نہیں ملا۔ دوسری طرف اس میں اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو اس عارضی دنیا میں اہل ایمان کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے یعنی توبہ کا دروازہ۔ اور ہمارے لیے یہ ہے کہ کوئی پتہ نہیں توبہ کا دروازہ کب بند ہو جائے اس لیے ہر صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً جائزہ لیتا رہے، اپنے اعمال کی اصلاح کرتا رہے اور محض اپنے ایمان کی پونجی کے بھروسے پر مت بیٹھا رہے۔ اس آیت میں موت کو

الیقین اس لیے کہا گیا ہے کہ اس دنیا میں جب انسان کی آنکھ بند ہوتی ہے تو اُس دنیا میں کھل جاتی ہے اور وہاں کی جن جن باتوں کی خبر انسان کو یہاں دی گئی ہے، وہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ اُس وقت اہل ایمان کا علم الیقین، عین الیقین میں ڈھل جاتا ہے اور اُس وقت کٹر سے کٹر ملحد اور کافر بھی یقین لانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس یقین کی وادی کا دروازہ موت ہے۔ (مرتب)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ آخرت میں اللہ کے فرشتے، انبیاء، شہداء اور صالحین گنہگاروں کی شفاعت کریں گے اور وہ ان کی شفاعت سے جہنم سے نکال لیے جائیں گے سوائے ان چار قسم کے مجرمین کے جن کا ذکر یہاں آیا ہے۔ یعنی جو نماز اور زکوٰۃ کے تارک ہیں، جو اہل باطل کی اسلام کے خلاف باتوں میں ان کے شریک رہتے ہیں اور جو قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ (معارف القرآن)۔

ہمارے جاننے والے چند اصحاب کو یہ بات تسلیم کرنے میں تردد ہے کہ یہاں نکذب بیوم الدین سے مراد تکذیب عملی ہے جبکہ صورتحال یہ ہے کہ یہاں جتنے بھی جرائم کا ذکر ہے ان سب کا تعلق عمل سے ہے، کسی ایک کا بھی تعلق قول سے نہیں ہے۔ منکر صلوٰۃ اور منکرِ زکوٰۃ مجرم نہیں بلکہ کافر ہے۔ جب کہ تارکِ صلوٰۃ اور تارکِ زکوٰۃ کافر نہیں ہے مجرم ہے۔ جرم یہ ہے کہ وہ زبان سے ان کا اقرار کر رہا ہے اور اپنے عمل سے ان کی تکذیب کر رہا ہے۔ اسی طرح سے جو زبان سے آخرت کا اقرار کرے لیکن اس عقیدے کے عملی تقاضوں کو پورا نہ کرے وہ آخرت کے عقیدے کی عملی تکذیب کا مجرم ہے کافر نہیں ہے۔ ایک مسلمان جب خوض کرنے والوں کے ساتھ خوض کرتا ہے اور زندگی کے دیگر معاملات میں اللہ کی حکم عدولی کرتا ہے، اُس وقت اس کے دل سے آخرت کا خوف نکل چکا ہوا ہے، چاہے زبان سے وہ آخرت کا اقرار کرتا ہو لیکن اپنے عمل سے وہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔ یہاں ایسے ہی لوگوں کا اعترافِ جرم ہے۔ (مرتب)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ القیامۃ (75)

آیت نمبر (1 تا 15)

ترکیب

(آیت۔3) اَلَّنۡ میں ہمزہ استفہام نہیں ہے۔ اگر یہ ہمزۂ استفہام ہوتا تو اَلَنۡ آتا۔ لام پر تشدید بتا رہی ہے کہ یہ دراصل اَنۡ لَّنۡ ہے اور اَنۡ کا نون گرا ہوا ہے۔ قرآن مجید کے اس مقام پر اَنۡ کے نون کو گرا کر لکھنا قرآن کا مخصوص املا ہے، ورنہ عام عربی میں اس کو اَنۡ لَّنۡ ہی لکھتے ہیں البتہ پڑھتے اَلَّنۡ ہیں۔ (آیت۔4) قٰدِرُوۡنَ کے بجائے قٰدِرِیۡنَ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ اس لیے بَلٰی کے بعد لَنَجۡمَعَنَّ محذوف مانا جاتا ہے۔ اس طرح جملہ کا اصل مفہوم ہے کہ کیوں نہیں! ہم لازماً جمع کریں گے قادر ہوتے ہوئے اس پر کہ..... (آیت۔ 11) لَا وَزَرَ میں وَزَرَ ماضی کا صیغہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ اسم وَزَرٌ ہے۔ اس پر لائے نَفۡیِ جنس داخل ہونے کی وجہ سے یہ وَزَرَ ہوا ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/2)

ترجمہ

لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ﴿۱﴾	وَ لَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ﴿۲﴾
نہیں میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی	اور نہیں میں قسم کھاتا ہوں بار بار ملامت کرنے والے نفس کی

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ﴿۳﴾	بَلٰی	قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ
کیا گمان کرتا ہے انسان کہ ہم ہرگز جمع نہیں کریں گے اس کی ہڈیوں کو	کیوں نہیں (ہم ضرور جمع کریں گے)	قادر ہوتے ہوئے اس پر کہ

نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾	بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ	لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴿۵﴾
ہم درست کردیں اس کی پور پور کو	بلکہ چاہتا ہے انسان	کہ وہ اپنی مرضی چلائے اپنے آگے (آنے والے وقت میں بھی)

يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴿۶﴾	فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿۷﴾	وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿۸﴾	وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿۹﴾
وہ پوچھتا ہے کب ہوگا قیامت کا دن	تو جب چندھیا جائے گی آنکھ	اور گہنا جائے گا چاند	اور اکٹھا کیے جائیں گے سورج اور چاند

يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ	اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿۱۰﴾	كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿۱۱﴾
کہے گا انسان اس دن	کدھر ہے بھاگنے کی جگہ	ہرگز نہیں! کوئی بھی پناہ گاہ نہیں ہے

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمُسْتَقَرُّ ﴿۱۲﴾	يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ	بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴿۱۳﴾
تیرے رب کی طرف ہی اس دن ٹھہرنے کا ٹھکانہ ہے	جتلا دیا جائے گا انسان کو اس دن	وہ جو اس نے آگے بھیجا اور (جو) اس نے پیچھے چھوڑا

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾	وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿۱۵﴾
بلکہ انسان اپنے آپ کو خوب دیکھنے والا ہے	اور اگرچہ وہ ڈالے (پیش کرے) اپنے بہانے

نوٹ:1

یہاں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے نفس (ضمیر) کی قسم جس بات پر کھائی ہے اسے بیان نہیں کیا گیا کیونکہ بعد کا فقرہ خود اس بات پر دلالت کر رہا ہے۔ قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ ضرور پیدا کرے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بات پر ان دو چیزوں کی قسم کس مناسبت سے کھائی گئی ہے۔

جہاں تک روزِ قیامت کا تعلق ہے، اس کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ پوری کائنات کا نظام اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ جتنا جتنا اس دنیا کے متعلق انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی یہ امر یقینی ہوتا چلا جاتا ہے کہ اس نظام کی ایک ابتدا ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا اور لازماً اس کی ایک انتہا ہے جس کے بعد یہ نہ رہے گا۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر خود قیامت کی ہی قسم کھائی ہے لیکن روزِ قیامت کی قسم صرف اس امر کی دلیل ہے کہ ایک دن یہ نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اس کے بعد انسان دوبارہ اٹھایا جائے گا اور اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا، تو اس کے لیے دوسری قسم نفس لوامہ کی کھائی گئی ہے۔ کوئی انسان دنیا میں موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اس کا ضمیر اسے برائی کرنے اور بھلائی نہ کرنے پر ٹوکتا ضرور ہے۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان ایک اخلاقی وجود ہے اور وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور بُرے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ اب اگر انسان میں نفس لوامہ کی موجودگی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ یہی نفس لوامہ زندگی بعدِ موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ کیونکہ فطرت کا یہ تقاضہ کہ انسان کو اچھے اور برے اعمال کی جزا یا سزا ضرور ملنی چاہیے، زندگی بعد موت کے سوا کسی دوسری صورت میں پورا نہیں ہوسکتا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

نفس لوامہ سے مراد کوئی علیحدہ اور مستقل نفس نہیں ہے بلکہ یہ نفس انسانی ہی کا ایک پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی کا شعور ودیعت فرما دیا ہے۔ اور اس کے لیے ضابطہ ٹھہرایا ہے کہ جو اپنے نفس کو برائیوں سے پاک رکھے گا وہ فلاح پانے والا ہے اور جو اس کو برائیوں سے آلودہ رکھے گا وہ نامراد ہوگا۔ سورۃ الشمس میں اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ''اور گواہ ہے نفس اور اس کی تشکیل۔ پس اس کو الہام کردی اس کی بدی اور نیکی۔ جس نے اس کو پاک رکھا اس نے فلاح پائی اور جس نے اس کو آلودہ رکھا وہ نامراد ہوا'' (آیات۔ 7۔10)۔ اس تشکیل کی اس نوعیت کے سبب سے نفس بعض اوقات اپنی خواہشوں سے مغلوب ہو کر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور وہ انسان کو کسی برائی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ نفس کے اس رجحان کو قرآن میں نفس امارہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ (سورہ یوسف۔53) لیکن یہ نفس

نیکیوں کا شعور بھی رکھتا ہے۔اس وجہ سے جب تک اس کا توازن برقرار رہتا ہے اس وقت تک وہ اپنے آپ کو بھی برائی صادر ہونے پر ملامت کرتا ہے اور دوسروں کی برائیوں کو دیکھ کر بھی کڑھتا ہے اور بسا اوقات ملامت کرتا ہے۔نفس کے اسی پہلو کو یہاں نفس امارہ 6940 سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

نفس کے توزان کو درست رکھنے کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ آدمی برابر اپنے رب اور روزِ جزاء وسزا کو یاد رکھے۔یہ یادِ نفس کے توازن کو درست رکھتی ہے اور وہ کبھی اپنی خواہشوں سے اتنا مغلوب نہیں ہوتا کہ بالکل اس کے آگے سپر انداز ہو جائے۔اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو نفس لوامہ فوراً اس کو ٹوکتا ہے اور وہ متنبہ ہو کر توبہ وانابت سے اس داغ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔جس نفس کے اندر یہ توازن پیدا ہو جائے قرآن نے اس کو نفس مطمئنہ سے تعبیر فرمایا ہے۔سورۃ الفجر۔27۔(تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

آیات۔3۔4۔کا حاصل یہ ہے کہ تمہیں اس پر تعجب ہے کہ میّت کے ذرات منتشرہ اور بوسیدہ ہڈیوں کو جمع کیسے کیا جائے گا۔حالانکہ یہ بات ایک مرتبہ مشاہدہ میں آچکی ہے کہ ہر انسان کا وجود جو دنیا میں پلتا اور بڑھتا ہے وہ دنیا بھر کے مختلف ملکوں اور خطوں کے اجزاء اور ذرات کا مرکب ہوتا ہے۔تو جس ذاتِ قادر نے پہلی مرتبہ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے ذرات کو ایک انسان کے وجود میں جمع کر دیا تھا، اس کے لیے دوبارہ جمع کرنا کیوں مشکل ہوگا۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم صرف اسی پر قادر نہیں ہیں کہ مَیّت کے سارے اجزاء واعضاء کو دوبارہ اسی طرح بنا دیں بلکہ انسانی وجود کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی ہم ٹھیک اسی طرح کر دیں گے جس طرح وہ پہلے تھی۔اس میں بنان یعنی انگلیوں کے پوروں کا خاص ذکر فرمایا کہ وہ سب سے چھوٹے اجزاء ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو شاید انگلیوں کے پوروں کی تخصیص میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو حق تعالیٰ نے ایک انسان کو دوسرے انسان سے ممتاز کرنے کے لیے اس کے سارے ہی بدن میں ایسی خصوصیات رکھی ہیں جن سے وہ پہچانا جاتا ہے اور دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے۔خصوصاً انسانی چہرہ جو چند انچ مربع سے زائد نہیں، اس کے اندر قدرت حق نے ایسے امتیازات رکھے ہیں کہ اربوں انسانوں میں ایک کا چہرہ دوسرے کے ساتھ اتنا نہیں ملتا کہ امتیاز باقی نہ رہے۔انسان کی زبان اور حلقوم ایک ہی طرح ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے ایسی ممتاز ہے کہ بچے، بوڑھے، عورت، مرد کی آوازیں الگ پہچانی جاتی ہیں۔اور ہر انسان کی آواز الگ الگ پہچانی جاتی ہے۔اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز انسان کے انگوٹھے اور انگلیوں کے پور ہیں کہ ان کے اوپر جو نقش ونگار خطوط کے جال کی صورت میں قدرت نے بنائے ہیں وہ بھی ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ نہیں ملتے۔صرف آدھا انچ کی جگہ میں ایسے امتیازات کہ اربوں انسانوں میں یہ پور مشترک ہونے کے باوجود ایک کے خطوط دوسرے سے نہیں ملتے۔قدیم وجدید ہر زمانے میں انگوٹھے کے نشان کو ایک امتیازی چیز قرار دے کر اس پر عدالتی فیصلے ہوتے رہے ہیں، اور اب فنی تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ بات صرف انگوٹھے ہی میں نہیں بلکہ ہر انگلی کے پور کے خطوط بھی اسی طرح ممتاز ہوتے ہیں۔

یہ سمجھ لینے کے بعد بنان کے بیان کی تخصیص خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں تو اسی پر تعجب ہے کہ یہ انسان دوبارہ کیسے زندہ ہوگا۔ذرا اس سے آگے سوچو اور غور کرو کہ وہ صرف زندہ ہی نہیں ہوگا بلکہ اپنی سابقہ شکل وصورت اور اس کے ہر امتیازی وصف کے ساتھ زندہ ہوگا۔یہاں تک کہ انگوٹھے اور انگلیوں کے پوروں کے خطوط پہلی پیدائش میں جس طرح تھے، دوبارہ بھی بالکل وہی ہوں گے۔(معارف القرآن)

نوٹ: 4

آیات۔7۔9۔ میں قیامت کے پہلے مرحلے میں نظام عالم کے درہم برہم ہوجانے کی کیفیت کا ایک مختصر بیان ہے۔ چاند کے بے نور ہوجانے اور چاند سورج کے مل کر ایک ہوجانے کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صرف چاند ہی کی روشنی ختم نہ ہوگی جو سورج سے ماخوذ ہے، بلکہ خود سورج بھی تاریک ہوجائے گا اور بے نور ہوجانے میں دونوں یکساں ہوجائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ زمین یکا یک الٹی چل پڑے اور اس دن چاند اور سورج دونوں بیک وقت مغرب سے طلوع ہوں گے۔ تیسرا مطلب یہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ چاند زمین کی کشش سے چھوٹ کر نکل جائے اور سورج میں جا پڑے۔ ممکن ہے اس کا کوئی اور مفہوم بھی ہو جس کو آج ہم نہیں سمجھ سکتے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 5

آیت۔13۔ میں ہے بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ۔ یہ بڑا جامع فقرہ ہے جس کے کئی معنی ہوسکتے ہیں اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کو اس روز یہ بھی بتادیا جائے گا کہ اپنی دنیا کی زندگی میں مرنے سے پہلے کیا نیکی یا بدی کما کر اس نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیجی تھی۔ اور یہ حساب بھی اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا کہ اپنے اچھے یا برے اعمال کے کیا اثرات وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آیا تھا جو اس کے بعد مدت ہائے دراز تک آنے والی نسلوں میں چلتے رہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسے وہ سب کچھ بتادیا جائے گا جو اسے کرنا چاہیے تھا مگر اس نے نہیں کیا اور جو کچھ نہ کرنا چاہیے تھا مگر اس نے کر ڈالا۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ اس نے پہلے کیا اور جو کچھ بعد میں کیا اس کا پورا حساب تاریخ وار اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ چوتھے معنی یہ ہیں کہ جو نیکی یا بدی اس نے کی وہ بھی اسے بتادی جائے گی اور جس نیکی یا بدی کے کرنے سے وہ باز رہا اس سے بھی اسے آگاہ کیا جائے گا۔ (تفہیم القرآن)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جو نیک کام اپنی موت سے پہلے کرلیا وہ آگے بھیج دیا۔ اور جو نیک یا بد، مفید یا مضر کوئی طریقہ، کوئی رسم ایسی چھوڑی کہ اس کے بعد لوگ اس پر عمل کریں، وہ اس نے پیچھے چھوڑا۔ اور حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ مَا قَدَّمَ سے مراد وہ عمل صالح جو اپنی زندگی میں کرگزرا اور مَا اَخَّرَ سے مراد وہ عمل صالح ہے جس کو کرسکتا تھا مگر نہ کیا اور فرصت ضائع کردی۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (16 تا 30)

ح ر ك

(ك) حَرَكًا ہلنا۔ حرکت کرنا۔

(تفعیل) تَحْرِيْكًا ہلانا۔ حرکت دینا۔ زیر مطالعہ آیت۔16۔

ن ض ر

(ن۔س) نَضْرَةً تروتازہ ہونا۔ ملائم ہونا۔ خوبصورت ہونے والا۔

نَضْرَةٌ اسم ذات بھی ہے۔ تروتازگی۔ ملائمیت، خوبصورتی۔ ﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۚ﴾ (83/المطففین:32) ''تو پہچانے گا ان کے چہروں میں ہمیشگی کی تروتازگی کو۔''

نَاضِرَةٌ اسم الفاعل ہے۔ تروتازہ ہونے والی۔ زیر مطالعہ آیت۔32۔

ترجمہ 6940

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ	لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾
آپ حرکت نہ دیں اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو	تاکہ آپ جلدی یاد کریں اس کو

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ	وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾	فَاِذَا قَرَاْنٰهُ	فَاتَّبِعْ
بیشک ہم پر ہے اس کا جمع کرنا۔ (آپ کے سینے میں)	اور (آسان کرنا) اس کا پڑھنا	پھر جب بھی ہم (فرشتے کی زبان سے) پڑھیں اس کو	تو آپ پیچھے پیچھے چلیں

قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾	ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾	كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ	الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾
اس کو پڑھے جانے کے	پھر بیشک ہم پر ہے اس کا ظاہر کرنا	ہرگز نہیں بلکہ تم لوگ پسند کرتے ہو	جلدی حاصل ہونے والی (دنیا) کو

وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾	وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾	اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾
اور تم لوگ چھوڑتے ہو پیچھے ہونے والی (آخرت) کو	کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہونے والے ہیں	اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہیں

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾	تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ	بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾
اور کچھ چہرے اس دن مرجھانے والے ہیں	وہ گمان کریں گے کہ کیا جائے گا	ان کے ساتھ (کمر) توڑنے والا کام

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾	وَقِيْلَ مَنْ ۜ	رَاقٍ ﴿۲۷﴾
ہرگز نہیں جب کبھی پہنچتی ہے (جان) ہنسلیوں تک	اور کہا جاتا ہے کون (کوئی)	جھاڑ پھونک کرنے والا ہے

وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾	وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾	اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِۨالْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾
اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے	اور (جب) لپٹی ہے پنڈلی پنڈلی سے	(تو وہ سمجھتا ہے) تیرے رب کی طرف اُس دن ہانکا جانا ہے

نوٹ: 1

آیت۔16۔ سے لے کر۔19۔تک کی پوری عبارت ایک جملۂ معترضہ ہے جو سلسلہ کلام کو بیچ میں توڑ کر نبی ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائی گئی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت کے ابتدائی دور میں جبکہ آپؐ کو وحی اخذ کرنے کی عادت اور مشق پوری طرح نہیں ہوئی تھی، آپؐ پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہوتا تھا کہ آپ! کو وہ کلام ٹھیک ٹھیک یاد رہ سکے گا یا نہیں۔اس لیے آپؐ وحی سننے کے ساتھ ساتھ اسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔ایسی ہی صورت اس وقت پیش آئی جب حضرت جبریلؑ سورۂ قیامہ کی آیات آپؐ کو سنا رہے تھے۔ چنانچہ سلسلہ کلام کو توڑ کر آپ! کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپؐ وحی کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ غور سے سنتے رہیں۔اسے یاد کرا دینا اور بعد میں ٹھیک ٹھیک آپؐ سے پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔یہ فرمانے کے بعد اصل سلسلۂ کلام ''ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے'' سے پھر شروع ہو جاتا ہے جو لوگ اس پس منظر سے واقف نہیں ہیں وہ اس مقام پر ان فقروں کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلۂ کلام میں یہ بالکل بے جوڑ ہیں۔لیکن اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد کلام میں کوئی بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک استاد درس دیتے ہوئے یہ دیکھے کہ طالب علم کسی اور طرف متوجہ ہے اور وہ درس کا سلسلہ روک کر طالب علم سے کہے کہ توجہ سے میری بات سنو اور اس کے آگے پھر اپنا درس شروع کر دے۔

ان آیات کے درمیان یہ فقرے بطور جملۂ معترضہ آنے کی جو توجیہ ہم نے کی ہے وہ محض قیاس پر مبنی نہیں ہے بلکہ مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن جریر طبرانی، بیہقی وغیرہ میں معتبر روایات سے اس کی یہی وجہ بیان ہوئی۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔17۔میں لفظ جمع ایک جامع لفظ ہے۔اس سے مراد قرآن کو نبی ﷺ کے سینے میں محفوظ کرنا بھی ہے اور ان منتشر موتیوں کو ایک لڑی 6940 میں پرونا بھی ہے۔چنانچہ نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر رہنمائی حاصل ہوتی رہی کہ مختلف مواقع پر نازل ہونے والی آیات کو الگ الگ سورتوں میں کس ترتیب سے آپؐ جمع کرائیں۔چنانچہ اسی رہنمائی کی روشنی میں آپؐ نے الگ الگ سورتوں میں ان کے مواقع کے تعین کے ساتھ آیات جمع کرنے کی ہدایت فرمائی اور جمع کرنے والوں نے آپؐ کے حکم کی تعمیل کی۔اس کے علاوہ ایک مزید اہتمام اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہر رمضان میں نبی ﷺ حضرت جبریلؑ کے ساتھ اتنے قرآن کا مذاکرہ فرماتے جتنا نازل ہو چکا ہوتا تاکہ کسی سہو ونسیان کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ مبارک کے آخری رمضان میں آپؐ نے یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا۔(تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔19۔بڑی اہم آیت ہے جس سے چند ایسی اصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنہیں آدمی اگر اچھی طرح سمجھ لے تو وہ ان گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔اولاً اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپؐ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔اس لیے کہ قرآن کے الفاظ اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم حضورؐ کو سمجھایا جاتا تھا وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے، کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مل جاتا۔لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالب قرآن کی جو تفہیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی تھی وہ بہرحال الفاظ قرآن کے علاوہ تھی۔یہ وحی خفی (وحی غیر متلو) کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔(قرآن مجید سے اس کے مزید ثبوت ہم نے اپنی کتاب ''سنت کی آئینی حیثیت'' میں صفحات 94۔95۔اور صفحات 118 تا 125 میں پیش کر دیئے ہیں)۔

ثانیاً قرآن کے احکام کی تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو بتائی گئی تھی وہ اسی لیے بتائی گئی تھی کہ آپؐ اپنے قول اور عمل سے اس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور قرآن کے احکام پر (اللہ کی مرضی کے مطابق۔مرتب) عمل کرنا سکھائیں۔اس لیے صرف ایک بیوقوف آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تشریح علم کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔اللہ تعالیٰ نے خود سورۂ نحل کی آیت۔44۔میں فرمایا ہے: ''اور اے نبیؐ یہ ذکر ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے۔'' اور قرآن میں چار جگہ اللہ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا کام صرف کتاب اللہ کی آیات سنا دینا ہی نہیں تھا بلکہ اس کتاب کی تعلیم دینا بھی تھا۔(ان سب آیات کی تشریح ہم ''سنت کی آئینی حیثیت'' میں صفحہ 74 تا 77 میں تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں)۔اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو مانتا ہو اس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی مستند اور سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول اور عمل سے فرما دی ہے کیونکہ وہ آپؐ کی ذاتی تشریح نہیں ہے بلکہ قرآن نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔

ثالثاً قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جنہیں ایک عربی جاننے والا محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ ان کا حقیقی مدعا کیا ہے اور ان میں جو حکم بیان کیا گیا ہی اس پر کیسے عمل کیا جائے۔مثال کے طور پر لفظ صلوٰۃ ہے۔محض عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم تک تعین نہیں کر سکتا۔قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مراد کوئی خاص فعل ہے لیکن قرآن پڑھ کر کوئی عربی جاننے والا یہ طے نہیں کر سکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک معلم کو مقرر کر کے صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کرنے کا طریقہ پوری وضاحت کے ساتھ اسے سکھا دیا جس کی وجہ سے آج ڈیڑھ ہزار 1940 برس سے مسلمان نسل در نسل نماز کے حکم پر یکساں عمل کر رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر صرف قرآن کے الفاظ ہی وحی نہیں فرمائے تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپؐ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا۔

رابعًا قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ نے اپنے رسولؐ کو بتائی اور رسولؐ نے اپنے قول و عمل سے اس کی جو تعلیم امت کو دی، اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث و سنت کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضورؐ کے اقوال و افعال کے متعلق سند کے ساتھ اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہوئیں۔ اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضورؐ کی قولی و عملی تعلیم سے مسلم معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رائج ہوا۔ اس ذریعہ علم کو جو شخص قبول کرنے سے انکار کرتا ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت۔19۔ میں قرآن کا مطلب اپنے رسول کو سمجھا دینے کی جو ذمہ داری لی تھی اسے پورا کرنے میں معاذ اللہ وہ ناکام ہو گیا ہے۔ (والعیاذ باللہ)

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ لی تھی، تو ان کا یہ قول خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آغازِ اسلام میں پوری امت رسول اللہ ﷺ کے اقوال و اعمال کو قانون کا درجہ دیتی تھی، ورنہ گمراہی پھیلانے والوں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ جعل ساز لوگ وہی سکے جعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن نوٹوں کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو انہیں کون جعلی طور پر چھاپے گا۔ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اس امت نے اول روز سے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذاتِ پاکؐ کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے۔ اس امت کے خیر خواہ لوگوں نے اس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا تھا کہ صحیح کو غلط سے ممیز کیا جائے۔ صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا ہی عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا۔ سخت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کیے بغیر حدیث سنت کو ناقابل اعتبار ٹھہراتے ہیں۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶، ص۱۶۹ تا ۱۷۱ سے ماخوذ)

نوٹ: 4 اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی انسانی صلاحیت کے متعلق بات ہو چکی ہے۔ آیت نمبر 6/ الانعام: 103، نوٹ۔ 1 ﷺ دوبارہ دیکھ لیں۔

آیت نمبر (31 تا 40)

م	ط	ی

(س) مَطِيًّا لمبا ہونا۔ دراز ہونا۔

(تفعل) تَمَطَّيَا بتکلف دراز ہونا۔ اکڑ کر چلنا۔ زیر مطالعہ آیت۔33۔

ترجمہ

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾	وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾
پھر اس نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی	اور لیکن (بلکہ) اس نے جھٹلایا اور روگردانی کی

ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ	يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾	اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾
پھر وہ گیا اپنے گھر والوں کی طرف	اکڑتا ہوا	(تباہی) زیادہ قریب ہے تیرے لیے، زیادہ قریب

ثُمَّ	اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾	اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ
پھر (I Repeat)	(تباہی) زیادہ قریب ہے تیرے لیے، زیادہ قریب	کیا سمجھتا ہے انسان

اَنْ يُّتْرَكَ	سُدًى ﴿۳۶﴾	اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً	مِّنْ مَّنِيٍّ	يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾
کہ وہ چھوڑ دیا جائے گا	(یوں ہی) بے لگام	کیا وہ نہیں تھا ایک ایسی بوند	کسی منی میں سے جو	ٹپکائی گئی

ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً	فَخَلَقَ	فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾	فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ
پھر وہ تھا خون کا ایک لوتھڑا	تو اس نے بنایا (اس کو)	پھر اس نے (ناک نقشہ) درست کیا	پھر اس نے بنائے اس سے جوڑے

الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾	اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ	عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾
مذکر اور مؤنث کے	کیا وہ قدرت رکھنے والا نہیں ہے	اس پر کہ وہ زندہ کرے مُردوں کو

نوٹ: 1

آیات۔31 تا33۔کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص آخرت کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا اس نے وہ سب کچھ سنا جو اوپر کی آیات میں بیان کیا گیا ہے، مگر پھر بھی وہ اپنے انکار پر ہی اڑا رہا اور یہ آیات سننے کے بعد اکڑتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا ہے اس میں یہ الفاظ کہ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ خاص طور پر توجہ کے مستحق ہیں۔ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ، اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب کی صداقت تسلیم کر لینے کا اولین اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی نماز پڑھے۔اللہ کے دوسرے احکام کی تعمیل کی نوبت تو بعد میں آتی ہے، لیکن ایمان کے اقرار کے بعد کچھ زیادہ مدت نہیں گزرتی کہ نماز کا وقت آجاتا ہے۔اس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی نے زبان سے جس چیز کے ماننے کا اقرار کیا ہے وہ کس حد تک اس کے دل کی آواز ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

عربی زبان میں اِبِلٌ سُدًی اس اونٹ کے لیے بولتے ہیں جو یوں ہی چھوٹا پھر رہا ہو، جہاں چاہے چرتا پھرے اور کوئی اس کی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔اس معنی میں ہم شتر بے مہار کا لفظ بولتے ہیں۔پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنے آپ کو شتر بے مہار سمجھ رکھا ہے کہ اس کے خالق نے اسے زمین میں غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا ہے۔کوئی فرض اس پر عائد نہ ہو۔کوئی چیز اس کے لیے ممنوع نہ ہو۔اور کوئی وقت ایسا آنے والا نہ ہو جب اس سے اس کے اعمال کی باز پرس کی جائے، یہی بات سورۂ المومنون کی آیت۔115۔میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں کبھی ہماری طرف پلٹ کر نہیں آنا ہے۔''

ان دونوں مقامات پر موت کے بعد کی زندگی کے واجب ہونے کی دلیل سوال کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا تم نے اپنے آپ کو جانور سمجھ رکھا ہے۔کیا تمہیں اپنے میں اور جانور میں یہ کھلا فرق نظر نہیں آتا کہ وہ بے اختیار ہے اور تم بااختیار ہو۔اس کے افعال میں اخلاقی حسن وقبح کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور تمہارے افعال میں یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے۔پھر تم نے اپنے متعلق یہ کیسے سمجھ لیا کہ جس طرح جانور غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ ہے اسی طرح تم بھی ہو۔جانور کے دوبارہ زندہ کر کے نہ اٹھانے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اس پر اپنے کسی عمل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جس کی باز پرس کے لیے اسے دوبارہ زندہ کرنے کی حاجت ہو۔لیکن تم حیات بعد موت سے کیسے معاف کیے جا سکتے ہو جبکہ مرتے دم تک تم ایسے اخلاقی افعال کرتے رہتے ہو جن کے نیک یا بد ہونے اور جزا یا سزا کے مستوجب ہونے کا خود تمہاری عقل حکم لگاتی ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سورۂ قیامہ کی آخری آیت کی تلاوت کرے، اس کو یہ کلمات کہنے چاہیے، بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ یعنی بلاشبہ وہ اس پر قادر ہے اور میں بھی ان لوگوں میں داخل ہوں جو اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اس حدیث میں یہی الفاظ سورۂ والتین کی آخری آیت پڑھنے کے وقت بھی کہنے کی تعلیم دی گئی ہے اور اسی حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ جو شخص سورۂ مرسلٰت کی آخری آیت پر پہنچے تو اس کو اٰمَنَّا بِاللّٰهِ کہنا چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ(76)

آیت نمبر(1تا10)

م	ش	ج

(ن) مَشْجًا خلط ملط کرنا۔ ملانا۔
مَشِيْجٌ ج اَمْشَاجٌ مخلوط۔ ملا ہوا۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

م	ز	ج

(ن) مَزْجًا پینے کی چیز میں کچھ ملانا جیسے شراب میں پانی ملانا۔
مِزَاجٌ جو چیز ملائی جائے۔ ملاوٹ۔ آمیزش۔ زیر مطالعہ آیت۔5۔

ترجمہ

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ	حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ	لَمْ يَكُنْ	شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ①
کیا پہنچا (گزرا) انسان پر	کوئی ایسا وقت زمانے میں سے	جب وہ تھا ہی نہیں	کوئی ذکر کی جانے والی چیز

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ	مِنْ نُّطْفَةٍ	اَمْشَاجٍ ۖ	نَّبْتَلِيْهِ
بیشک ہم نے پیدا کیا انسان کو	ایک ایسی بوند سے جو	ملی جلی چیزوں سے تھی	ہم (رحم مادر میں) الٹتے پلٹتے رہے اس (انسان) کو

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ②	اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ	اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ③
پھر ہم نے بنایا اس کو سننے والا دیکھنے والا	بیشک ہم نے سجھا دیا اس کو یہ راستہ	(اب) چاہے شکر کرنے والا ہو اور چاہے ناشکری کرنے والا ہو

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ	سَلٰسِلَا۠ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ④	اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ
بیشک ہم نے تیار کیا کافروں کے لیے	زنجیریں اور طوق اور دہکتی آگ	بیشک نیک لوگ پئیں گے

مِنْ كَاْسٍ	كَانَ مِزَاجُهَا	كَافُوْرًا ۚ ⑤	عَيْنًا	يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ
ایک ایسے جام سے	جس کی آمیزش	کافور ہے	جو ایک چشمہ ہے	پئیں گے جس سے اللہ کے بندے

يُفَجِّرُوْنَهَا	تَفْجِيْرًا ⑥	يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ	وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا
وہ لوگ جاری کریں گے اس کو	جیسے جاری کرنے کا حق ہے	وہ لوگ (اس دنیا میں) پوری کرتے ہیں منت	اور ڈرتے ہیں ایک ایسے دن سے

كَانَ شَرُّهٗ	مُسْتَطِيْرًا ۝۷	وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ	عَلٰى حُبِّهٖ 1940
جس کا شر	پھیل جانے والا ہے	اور وہ لوگ کھلاتے ہیں کھانا	اس (کھانے) کی محبت کے باوجود

مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝۸	اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ	لِوَجْهِ اللّٰهِ
مسکین کو اور یتیم کو اور قیدی کو	(کہتے ہیں) ہم تو بس کھلاتے ہیں تم کو	اللہ کی توجہ (حاصل کرنے) کے لیے

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ	جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝۹	اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا
ہم نہیں چاہتے تم سے	کوئی بدلہ اور نہ کوئی احسان ماننا	بیشک ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے

يَوْمًا	عَبُوْسًا	قَمْطَرِيْرًا ۝۱۰
ایک ایسے دن سے جو	بہت ترش ہوگا	بہت شدید ہوگا

نوٹ: 1

اکثر مفسرین نے یہاں هَلْ کو قَدْ کے معنی میں لیا ہے اور وہ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ بیشک انسان پر ایسا ایک وقت آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ هَلْ عربی زبان میں ''کیا'' کے معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس سے مقصود ہر حال میں سوال ہی نہیں ہوتا بلکہ مختلف مواقع پر یہ بظاہر سوالیہ لفظ مختلف معانی میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں واقعہ پیش آیا ہے یا نہیں تو پوچھتے ہیں کہ کیا یہ واقعہ ہوا ہے؟ کبھی ہمارا مقصود سوال نہیں بلکہ کسی بات کا انکار کرنا ہوتا ہے اور یہ انکار ہم اس انداز میں کرتے ہیں کہ کیا یہ کام کوئی اور بھی کرسکتا ہے۔ (یعنی نہیں کرسکتا)۔ کبھی ہم کسی بات کا اقرار کرانا چاہتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ کیا میں نے تمہاری رقم ادا کردی۔ اور کبھی ہمارا مقصود محض اقرار ہی کرانا نہیں ہوتا بلکہ سوال ہم اس غرض سے کرتے ہیں کہ مخاطب کے ذہن کو ایک اور بات سوچنے پر مجبور کردیں جو لازماً اقرار کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہم کسی سے پوچھتے ہیں کہ کیا میں نے تمہارے ساتھ کوئی برائی کی ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ آپ نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے، بلکہ اسے یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی ہوتا ہے کہ جس نے میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی اس کے ساتھ میں برائی کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔ آیت زیر بحث میں سوالیہ فقرہ دراصل اسی آخری معنی میں ارشاد ہوا ہے۔ اس سے مقصود انسان سے صرف یہی اقرار کرانا نہیں ہے کہ فی الواقعہ اس پر ایک ایسا وقت گزرا ہے، بلکہ یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی ہے کہ جس خدا نے اس کی تخلیق کا آغاز ایسی حقیری حالت سے کرکے اسے پورا انسان بنا کھڑا کیا وہ اسے دوبارہ پیدا کرنے سے آخر کیوں عاجز ہوگا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ میں لفظ اَمْشَاجٍ جمع ہے مَشِيْجٌ کی (جبکہ نُّطْفَةٍ واحد ہے) اس کے معنی ملی جلی اور مخلوط چیز کے ہیں۔ اَمْشَاجٍ اگرچہ جمع ہے لیکن یہ ان الفاظ میں سے ہے جو جمع ہونے کے باوجود مفرد الفاظ کی صفت کے طور پر آئے ہیں۔ (تدبر قرآن)۔

اِمْشَاجٌ کے معنی مخلوط کے آتے ہیں اور یہاں ظاہر یہ ہے کہ مرد و زن کا مخلوط نطفہ مراد ہے جیسا کہ اکثر مفسرین نے فرمایا ہے۔ اور روح المعانی میں بعض مفسرین سے نقل کیا ہے کہ امشاج سے مراد اخلاطِ اربعہ یعنی خون، بلغم، سودا اور صفراء ہیں جن سے نطفہ مرکب ہوتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ اخلاطِ اربعہ بھی اقسام غذا سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور ہر انسان کی غذا میں غور کیا جائے تو اس میں دور دراز ملکوں اور خطوں کی آب و ہوا کے اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک انسان کے موجودہ جسم کا تجزیہ اور تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایسے اجزاء و ذرات کا مجموعہ ہے جو دنیا کے گوشے گوشے میں بکھرے ہوئے تھے۔ قدرت کے نظامِ عجیب نے حیرت انگیز طریقہ پر

ان کو اس کے وجود میں سمویا۔ ہے۔ اگر امشاج کا یہ مطلب لیا جائے تو اس جگہ لفظ امشاج کے ذکر سے منکرین قیامت کے سب سے بڑے شبہ کا ازالہ بھی ہو جائے گا۔ کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک قیامت قائم ہونے اور مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے میں سب سے بڑا اشکال یہی ہے کہ انسان مر کر مٹی اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر دنیا میں بکھر جاتا ہے، ان کو دوبارہ جمع کرنا پھر ان میں روح ڈالنا ان کے نزدیک گویا ناممکن ہے۔ امشاج کی اس تفسیر میں ان کے اس شبہ کا واضح جواب ہے کہ ابتدائی تخلیق انسان میں بھی تو دنیا بھر کے اجزاء و ذرات شامل تھے۔ جس کو یہ ابتدائی تخلیق مشکل نہ ہوئی اس کے لیے اس کا دوبارہ پیدا کرنا کیوں مشکل ہو گیا۔ اس طرح اس جگہ لفظ امشاج کا اضافہ ایک مستقل فائدہ کے لیے ہو سکتا ہے۔ (معارف القرآن)۔ کیونکہ لفظ امشاج کے بغیر صرف لفظ نطفہ سے بھی بات مکمل ہو جاتی ہے۔ اس کے باجود اگر اس پر لفظ امشاج کا اضافہ کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ زیب داستان کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی مقصد ہے۔ (مرتب)

نَبْتَلِيْهِ کو عام طور پر لوگوں نے بیان علت کے مفہوم میں لیا ہے، یعنی ہم نے انسان کو آزمانے کے لیے پیدا کیا۔ لیکن یہ اگر علت کے مفہوم میں ہوتا تو اس پر لامِ علت آنا تھا حالانکہ یہ حال کی صورت میں ہے اور حال کا مفہوم علت کے مفہوم سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حال ہی کے مفہوم میں ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم نے انسان کو اس طرح (یعنی اس حال میں۔ مرتب) پیدا کیا کہ درجہ بدرجہ اس کو مختلف اطوار و مراحل سے گزارتے ہوئے ایک سمیع و بصیر مخلوق کے درجے تک پہنچا دیا۔ ابتلاء کے معنی لغت میں جانچنے پرکھنے کے ہیں۔ آدمی جب کسی چیز کو جانچتا ہے تو اس کو مختلف پہلوؤں سے الٹ پلٹ کر اور ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے۔ یہیں سے اس کے اندر ایک طور سے گزار کر دوسرے طور میں لے جانے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ یہاں یہ لفظ اسی معنی میں ہے۔

انسان کی تخلیق جن اطوار و مراحل سے گزر کر مرتبۂ تکمیل تک پہنچتی ہے اس کی وضاحت قرآن مجید میں جگہ جگہ ہوئی ہے۔ مثلاً سورۂ حج کی آیت۔ 5۔ میں ہے کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر ایک نطفہ سے پھر خون کی ایک پھٹکی سے پھر گوشت کی ایک بوٹی سے، کوئی تمام اور کوئی نا تمام۔ پھر ہم رحموں میں ٹھہراتے ہیں جتنا چاہتے ہیں ایک مدت معین تک پھر ہم تم کو بچے کی صورت میں باہر لاتے ہیں پھر ہم تم کو پروان چڑھاتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ انہی اطوار و مراحل کی تفصیل سورۂ مومنون کی ایات۔ 12 تا 14۔ میں یوں آئی ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا مٹی کے جوہر سے پھر ہم نے اس کو رکھا ایک نطفہ کی صورت میں ایک محفوظ ٹھکانے میں پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کی پھٹکی کی شکل دی پھر خون کی پھٹکی کو مضغۂ گوشت بنایا پھر گوشت میں ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا پھر اس کو ایک بالکل دوسری ہی مخلوق کی صورت میں کھڑا کر دیا۔

ان آیات میں جن اطوار و مراحل کی تفصیل ہے انہی کی طرف آیت زیر بحث میں اجمال کے ساتھ اشارہ فرمایا ہے اور انہی مراحل سے درجہ بدرجہ گزارنے کے لیے لفظ نَبْتَلِيْهِ آیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس قطرے کو گہر ہونے تک بہت سے مرحلے طے کرنے پڑے ہیں اور ہر مرحلہ میں قدرت نے اس کو اچھی طرح جانچا پرکھا ہے کہ جس دور میں جو صلاحیت اس کے اندر پیدا ہونی چاہیے وہ پیدا ہو گئی یا نہیں۔ پھر وہ دور آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سمع و بصر کی اعلیٰ صفات سے متصف ہستی بنا دیا۔ یہاں پر سَمِيْعًا بَصِيْرًا انسان کی تمام اعلیٰ صفات کی نہایت جامع تعبیر ہے۔ انہی صفات کے فیض سے انسان کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ٹھہرا کہ اللہ تعالیٰ اس کا امتحان کرے کہ وہ خیر کی راہ اختیار کر کے اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا شر کی راہ اختیار کر کے ناشکرا بن جاتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ بھی نکلنا لازمی ہے ورنہ اس سارے اہتمام کا کیا مقصد جو انسان کی پیدائش کے لیے قدرت نے کیے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 3

کوئی نیک کام کرنے کا عہد کر لینے کو نذر (منت) کہتے ہیں۔ وفادار بندوں (ابرار) کے اوصاف میں ایفائے نذر کو خاص طور سے نمایاں کیا گیا 6940 ہے۔ جو لوگ ایسی نذروں کو پورا کرنے کا بھی اہتمام کریں جو انہوں نے بطور خود اپنے اوپر واجب کی ہوں، ان سے ایسی نیکیوں کے اہتمام کی توقع بدرجۂ اولیٰ ہے جو ان کے رب نے ان پر واجب ٹھہرائی ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نذر کی اہمیت سابق ادیان میں بھی بہت رہی ہے اور عرب جاہلیت میں بھی اس کا بڑا اہتمام تھا۔ عربوں کے اندر اس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ دین کے طریقے ان کو واضح طور پر معلوم نہیں تھے اس لیے ان کے نیک لوگ نذروں کے ذریعے سے اس خلا کو بھرتے تھے۔ اسلام کے آجانے کے بعد جب شریعت کے اصول و فروع لوگوں کو معلوم ہو گئے تو اس کا دائرہ محدود ہو گیا۔ وہ نذریں جو مشرکانہ نوعیت کی تھیں، وہ تو بالکل ہی ختم کر دی گئیں۔ جو نذریں تکلف مالا یطاق نوعیت کی تھیں، وہ بھی یا تو ممنوع قرار پا گئیں یا ان کی اصلاح کر دی گئی۔ یہ سورہ چونکہ اس دور کی ہے جب شریعت کے احکام و آداب تفصیل سے معلوم نہیں ہوئے تھے، اس وجہ سے اس میں اس کا ذکر خاص اہمیت سے ہوا ہے۔ بعد میں جب شریعت کا پورا میثاق نازل ہو گیا تو اس کا دائرہ نہایت محدود ہو گیا۔ (تدبر قرآن)۔

فقہاء نے نذر کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اللہ سے یہ عہد کرے کہ وہ اس کی رضا کی خاطر فلاں نیک کام کرے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ اس بات کی نذر مانے کہ اگر اللہ نے میری فلاں حاجت پوری کر دی تو میں شکرانے میں فلاں نیک کام کروں گا۔ ان دونوں قسم کی نذروں پر اتفاق ہے کہ اسے پورا کرنا واجب ہے۔ تیسرے یہ کہ آدمی کوئی ناجائز کام کرنے یا کوئی واجب کام نہ کرنے کا عہد کر لے۔ چوتھے یہ کہ آدمی کوئی مباح کام کرنے کو اپنے اوپر لازم کر لے یا کوئی مستحب کام نہ کرنے کا عہد کر لے۔ تیسری قسم کی نذر کے متعلق اتفاق ہے کہ وہ منعقد ہی نہیں ہوتی۔ چوتھی قسم کے متعلق فقہاء میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسے پورا کرنا چاہیے۔ بعض کہتے ہیں کہ قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آدمی کو اختیار ہے، خواہ نذر پوری کر دے یا کفارہ ادا کر دے۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (11 تا 22)

ترکیب

(آیت۔ 11) فَوَقٰهُمْ اور لَقّٰهُمْ میں هُمْ کی ضمیریں آیت۔ 5۔ میں مذکور اَلْاَبْرَارَ کے لیے ہے جبکہ ذٰلِكَ الْيَوْمِ میں اشارہ گزشتہ آیت میں مذکور يَوْمًا عَبُوْسًا کے لیے ہے۔ (آیت۔ 14) دَانِيَةً حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے اور یہ اسم الفاعل ہے۔ یہاں پر اس نے فعل کا عمل کیا ہے۔ (دیکھیں آیت۔ 2/ البقرۃ: 54، نوٹ۔ 1) ظِلٰلُهَا اس کا فاعل ہے۔ ذُلِّلَتْ کا نائب فاعل قُطُوْفُهَا ہے۔ قُطُوْفٌ جمع مکسر ہے اس لیے فعل ذُلِّلَتْ واحد مؤنث آیا ہے۔ (آیت۔ 15) بِاٰنِيَةٍ کے حرفِ جر ب پر عطف ہونے کی وجہ سے اَكْوَابٍ حالت جر میں آیا ہے۔ اٰنِيَةٍ اور اَكْوَابٍ کو يُطَافُ کا نائب فاعل مان کر بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن حافظ احمد یار صاحب کی رائے ہے کہ يُطَافُ کا نائب فاعل اس میں شامل ضمیر ہے جو خُدّام کے لیے ہے۔ ترجمہ شیخ الہند کے ترجمہ میں بھی اسی لحاظ سے ترجمہ ہے۔ ہم اسی کو ترجیح دیں گے۔ قَوَارِيْرُ آتا ہے۔ یہاں الف کے اضافے کے ساتھ لکھنا قرآن کا مخصوص املا ہے۔ (آیت۔ 21) عٰلِيَهُمْ میں اسم الفاعل عَالٍ حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں عَالِيًا ہے مضاف ہونے کی وجہ سے تنوین ضم ہوئی تو عَالِيَ استعمال ہوا۔ یہ بھی یہاں فعل کا عمل کر رہا ہے۔ ثِيَابُ سُنْدُسٍ اس کا فاعل ہے۔ خُضْرٌ اِسْتَبْرَقٌ صفت نہیں ہیں۔ اگر یہ ثِيَابُ کی صفت ہوتے تو اَلْخُضْرُ اور اَلْاِسْتَبْرَقُ آتے۔ کیونکہ ثِيَابُ سُنْدُسٍ اضافت کی وجہ سے معرفہ ہے جب موصوف معرفہ ہو تو صفت بھی معرفہ ہی ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ خبر ہیں اور ان کا مبتدا هِيَ محذوف ہے جو ثِيَابُ کے لیے ہے۔ (آیت۔ 22) اِنَّ کا اسم هٰذَا ہے اور محلاً حالت نصب میں

ہے۔اس کے آگے پورا جملہ كَانَ لَكُمْ جَزَاءً۔ اِنَّ کی خبر ہے اور محلاً حالتِ رفع میں ہے۔اس جملے میں كَانَ کا اسم اس میں شامل هُوَ کی ضمیر ہے اور اس کی خبر ہونے کی وجہ سے جزاءً حالتِ نصب میں ہے۔اگلے جملے میں كَانَ کا اسم سَعْيُكُمْ ہے اور مَشْكُوْرًا اس کی خبر ہے۔ان آیات میں قیامت کے حالات کا ذکر ہے۔اس لیے افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔(دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:27،نوٹ۔3)

ترجمہ

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ	شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ	وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۚ ﴿۱۱﴾
تو بچایا ان کو اللہ نے	اس دن کے شر سے	اور دی ان کو تازی اور سرور

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا	جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ﴿۱۲﴾	مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا
اور اس نے بدلے میں دیا ان کو بسبب اس کے جو وہ ثابت قدم رہے	ایک باغ اور باریک ریشم	ٹیک لگا کر بیٹھنے والے ہوتے ہوئے اس میں

عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ	لَا يَرَوْنَ فِيْهَا	شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۚ ﴿۱۳﴾
آراستہ تختوں پر	وہ لوگ نہیں دیکھیں گے اس میں	کوئی سورج (دھوپ) اور نہ کوئی ٹھٹھرن

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ	ظِلٰلُهَا	وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا
اور نزدیک ہونے (جھکنے) والے ہوتے ہوئے ان پر	اس کے سائے	اور مطیع کیے (جھکائے) گئے اس کے پھل

تَذْلِيْلًا ﴿۱۴﴾	وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ	بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ
جیسی جھکائے جانے کا حق ہے	اور گھمائے پھرائے جائیں گے ان کے گرد (خدام)	ایسے برتنوں کے ساتھ جو چاندی کے ہوں گے

وَّاَكْوَابٍ	كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۠ ﴿۱۵﴾	قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ
اور ایسے آبخوروں کے ساتھ جو	ہوں گے شیشے کے	(وہ) شیشے چاندی کے ہوں گے

قَدَّرُوْهَا	تَقْدِيْرًا ﴿۱۶﴾	وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا	كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا
(خدّام) اندازہ مقرر کریں گے جن کا	جیسے اندازہ کرنے کا حق ہے	وہ (ابرار) لوگ پلائے جائیں گے اس میں	ایک ایسے پیالے سے جس کی ملاوٹ

زَنْجَبِيْلًا ۚ ﴿۱۷﴾	عَيْنًا فِيْهَا	تُسَمّٰى	سَلْسَبِيْلًا ﴿۱۸﴾	وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ
ادرک ہے	جو ایک چشمہ ہے اس میں	اس کو نام دیا جائے گا	سلسبیل	اور گھومیں پھریں گے ان کے گرد

وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ	اِذَا رَاَيْتَهُمْ	حَسِبْتَهُمْ	لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾
ہمیشگی دیئے ہوئے کم عمر لڑکے	جب بھی تو دیکھے گا ان کو	تو تو گمان کرے گا ان کو	بکھیرے ہوئے موتی

وَاِذَا رَاَيْتَ	ثَمَّ رَاَيْتَ	نَعِيْمًا	وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾
اور جب بھی تو دیکھے گا	تو وہیں تُو دیکھے گا	دائمی خوشحالی	اور ایک بڑی بادشاہت

عٰلِيَهُمْ	ثِيَابُ سُنْدُسٍ	خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ	وَّحُلُّوْٓا 40
چڑھنے والے ہوتے ہوئے ان پر	کچھ باریک ریشم کے کپڑے ہوں گے	(وہ) سبز اور بھڑکیلے ہوں گے	اور ان کو آراستہ کیا جائے گا

اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ	وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ	شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿٢١﴾
چاندی کے کنگنوں سے	اور پلائے گا ان کو ان کا رب	ایک نہایت پاکیزہ مشروب

اِنَّ هٰذَا	كَانَ لَكُمْ جَزَآءً	وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ	مَّشْكُوْرًا ﴿٢٢﴾ ع
بیشک یہ	ہوگا تمہارے لیے ایک بدلہ	اور ہوگی تمہاری دوڑ دھوپ	قدر کی ہوئی

نوٹ:1

آیت۔13۔ میں سورج اور زمہریر نہ دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ گرمی اور سردی دونوں کی اذیتوں سے محفوظ رہیں گے۔ ان کے سورج میں روشنی اور قوت بخشی تو ہوگی مگر اس میں حدت اور تمازت نہ ہوگی۔ وہاں کا موسم معتدل اور پُر بہار رہے گا۔ خزاں کی نحوست اور بادِ زمہریر (یخ ٹھنڈی ہوا) سے ان کو کبھی سابقہ پیش نہیں آئے گا۔ (تدبر قرآن)۔

اگلی آیت میں شاید درختوں کی شاخوں کو ظلال (سائے) سے تعبیر فرمایا ہے یا واقعی سایہ ہو۔ کیونکہ آفتاب کی دھوپ نہ سہی کوئی دوسری قسم کا نور ہوگا۔ اس کے سایہ میں بہشتی تفنن و تفریح کی غرض سے کبھی بیٹھنا چاہیں گے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:2

آیت۔16۔ میں چاندی کے شیشے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہوگی تو چاندی مگر شیشے کی طرح شفاف ہوگی۔ چاندی کی یہ قسم اس دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ یہ صرف جنت کی خصوصیت ہوگی کہ وہاں شیشے جیسی شفاف چاندی کے برتن اہل جنت کے دسترخوان پر ہوں گے۔

اور قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے لیے اس کی خواہش کے ٹھیک اندازے کے مطابق ساغر بھر بھر کر دیئے جائیں گے۔ نہ وہ اس کی خواہش سے کم ہوں گے نہ زیادہ۔ دوسرے الفاظ میں اہل جنت کے خدام اس قدر ہوشیار اور تمیز دار ہوں کہ وہ جس کی خدمت میں جام پیش کریں گے اس کے متعلق ان کو پورا اندازہ ہوگا کہ وہ کتنی شراب پینا چاہتا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔21۔ میں ہے وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا۔ اس میں ایک نکتہ قابل توجہ ہے۔ پہلے آیت۔5 میں ہے يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ (وہ لوگ پئیں گے ایک ایسے جام سے) اس کے بعد آیت۔17۔ میں فرمایا يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا (ان لوگوں کو پینے کے لیے دیا جائے گا اس میں ایک ایسے جام سے) اور یہاں ارشاد ہوا کہ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ (پلائے گا ان کو ان کا رب)۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے آسانی سے اس فرق کو سمجھ سکتے ہیں جو ان تینوں اسلوبوں یعنی يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ، يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا اور سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ میں ہے۔ (تدبر قرآن) (فرق یہ ہے کہ شَرِبَ۔ يَشْرَبُ میں مفہوم یہ ہے کہ سامنے کسی چیز میں پینے کی کوئی چیز دیکھی یا کسی نہر یا دریا پر گزر ہوا تو ہاتھ بڑھا کر خود پی لیا۔ جبکہ باب افعال میں اَسْقٰى۔ يُسْقِيْ کے معنی ہیں کسی کو پینے کی کوئی چیز دینا۔ يُسْقَوْنَ اس کا مضارع مجہول ہے۔ اس میں مفہوم یہ ہے کہ پینے کی چیز ان کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔ اور ثلاثی مجرد میں سَقٰى۔ يَسْقِيْ کے معنی ہیں کسی کو پلانا، اس طرح سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ میں مفہوم یہ ہے کہ ان کا رب خود ان کو پلائے گا۔ مرتب)

سوال یہ ہے کہ فرق کیوں ہے۔ شاید یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ یہ ابرار درجہ بدرجہ قرب الٰہی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جائیں گے کہ خود ربِ کریم ان کو شراب طہور کا جام پلائے گا۔ یہ شراب طہور کیا ہے، اس کا تصور اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہی

وجہ ہے کہ اس کے لیے قرآن نے کوئی اس طرح کا تمثیلی اسلوب اختیار نہیں کیا جس طرح کا اسلوب اوپر چشمہ کافور اور چشمہ زنجبیل کے لیے 6940 اختیار فرمایا۔ اس کو صرف رب کریم ہی جانتا ہے۔ (تدبر قرآن)۔

آیت نمبر (23 تا 31)

ترجمہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ	الْقُرْاٰنَ	تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾	فَاصْبِرْ
بیشک ہم نے ہی اتارا آپؐ پر	اس قرآن کو	جیسے جستہ جستہ اتارنے کا حق ہے	پس آپؐ ثابت قدم رہیں

لِحُكْمِ رَبِّكَ	وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ	اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾	وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ
اپنے رب کے حکم کے لیے (حقیقی حکم پر)	اور کہنا مت مانیں ان میں سے	کسی گنہگار کا یا کسی ناشکرے کا	اور آپؐ یاد کریں اپنے رب کے نام کو

بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾	وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ	وَسَبِّحْهُ	لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾
صبح سویرے اور شام کے وقت	اور رات میں سے پھر آپ سجدہ کریں اس کو	اور آپ تسبیح کریں اس کی	طویل رات میں

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ	الْعَاجِلَةَ	وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ	يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾
بیشک یہ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں	جلد حاصل ہونے والی (دنیا) کو	اور وہ چھوڑتے ہیں اپنے (پیٹھ) پیچھے	ایک بھاری دن (قیامت کی فکر) کو

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ	وَشَدَدْنَآ	اَسْرَهُمْ ۚ	وَاِذَا شِئْنَا	بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ
ہم نے ہی پیدا کیا ان کو	اور ہم نے مضبوط کیا	ان کی بندش (جوڑ بند) کو	اور جب بھی ہم چاہیں گے	ہم تبدیل کر دیں گے (ان کو) ان کے جیسوں سے

تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾	اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ	فَمَنْ شَآءَ	اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ	سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾
جیسے تبدیل کرتے ہیں	بیشک یہ ایک یاددہانی ہے	تو جو چاہے	وہ بنالے اپنے رب کی طرف	ایک راستہ

وَمَا تَشَآءُوْنَ	اِلَّآ اَنْ	يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ	اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾
اور تم لوگ کیا چاہو گے	سوائے اس کے کہ جو	چاہے گا اللہ	بیشک اللہ ہے	جاننے والا حکمت والا

يُّدْخِلُ	مَنْ يَّشَآءُ	فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ
وہ داخل کرتا ہے	اس کو جس کو وہ چاہتا ہے	اپنی رحمت میں

وَالظّٰلِمِيْنَ	اَعَدَّ لَهُمْ	عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾
اور ظلم (شرک) کرنے والوں کو	اس نے تیار کیا ان کے لیے	ایک دردناک عذاب

نوٹ: 1 آیت۔23 میں مخاطب بظاہر نبی ﷺ ہیں لیکن دراصل روئے سخن کفار کی طرف ہے کفار مکہ کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) یہ قرآن خود سوچ سوچ کر بنا رہے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرمان آتا تو اکٹھا ایک ہی مرتبہ آجاتا۔ قرآن میں بعض مقامات پر ان کا یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ لیکن یہاں اسے نقل کیے بغیر اللہ تعالیٰ نے پورے زور کے ساتھ فرمایا ہے کہ اس کے نازل کرنے والے ہم ہی ہیں یعنی محمد ﷺ اس کے مصنف نہیں ہیں۔ اور ہم ہی اس کو بتدریج نازل کر رہے ہیں۔ یہ ہماری حکمت کا تقاضہ ہے کہ اپنا پیغام بیک وقت ایک کتاب کی شکل میں نازل نہ کریں، بلکہ اسے تھوڑا

تھوڑا کر کے بھیجیں۔(تفہیم القرآن)۔

1940

نوٹ:2

آیت۔28 میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان اپنے ایک ایک جوڑ پر نظر ڈالے کہ بتقاضائے حکمت وراحت انسانی جوڑ دیکھنے میں نرم ونازک معلوم ہوتے ہیں اور نرم نرم پٹھوں کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، جس کا طبعی تقاضا یہ تھا کہ سال دوسال ہی میں یہ جوڑوں کے بندھن اور اعصاب گھس جاتے اور ٹوٹ جاتے، خصوصاً جبکہ دن رات وہ حرکت میں رہتے ہیں اور موڑے تورے جاتے ہیں۔ اتنی شبانہ روز حرکت کے ساتھ تو لوہے کے اسپرنگ بھی سال دوسال میں گھس کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ ان نرم ونازک پٹھوں کو دیکھو کس طرح اعضاء کے جوڑوں کو باندھے ہوئے ہیں، نہ گھستے ہیں نہ ٹوٹتے ہیں۔ انسان اپنی انگلیوں کے جوڑوں کو دیکھے اور حساب لگائے کہ عمر بھر میں ان جوڑوں نے کتنی حرکتیں کی ہیں، کیسے کیسے زور آور دباؤ ان پر ڈالے گئے ہیں کہ اگر فولاد بھی ہوتا تو گھس گیا ہوتا مگر یہ جوڑ ہیں جو ستر اسی سال چلنے پر بھی اپنی جگہ قائم ہیں۔(معارف القرآن)۔

نوٹ:3

آیات۔29۔30۔ میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرے۔ دوسرے یہ کہ تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ بڑا حکیم وعلیم ہے۔ ان تینوں باتوں پر اگر اچھی طرح غور کیا جائے تو انسان کی آزادئ اختیار اور اللہ کی مشیت کا تعلق بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے اور وہ تمام الجھنیں صاف ہوجاتی ہیں جو تقدیر کے مسئلہ میں بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ پہلی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو اختیارات دیے گئے ہیں وہ صرف اس حد تک ہیں کہ یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے جو مختلف راستے اس کے سامنے آتے ہیں ان میں سے کسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرے۔ یہ انتخاب کی آزادی (Freedom of Choice) ہے جو اللہ نے انسان کو دی ہے۔ مثلاً ایک آدمی کے سامنے اپنی روزی حاصل کرنے کا سوال جب آتا ہے تو اس کے سامنے بہت سے راستے ہوتے ہیں جن میں سے کچھ حلال ہیں اور کچھ حرام ہیں۔ ان میں کسی ایک راستے کو انتخاب کرنے کا فیصلہ انسان کے اپنے انتخاب پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنا رزق کس طریقے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح اخلاق کے مختلف ڈھنگ ہیں۔ اس کو پوری آزادی ہے کہ وہ اچھے بُرے جس ڈھنگ کے اخلاق اختیار کرنا چاہے کرلے۔ ایسا ہی معاملہ دین ومذہب کا ہے کہ اس میں بھی بہت سے راستے انسان کے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ الحاد اور انکار خدا، شرک وبت پرستی، شرک وتوحید کے مختلف مخلوطے، ایک وہ خالص خدا پرستی جس کی تعلیم قرآن دیتا ہے۔ یہ فیصلہ بھی انسان پر ہی چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان میں سے کس کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر جبراً اپنا کوئی فیصلہ نہیں ٹھونستا کہ وہ چاہتا تو ہو حلال روزی اور اللہ زبردستی اس کو حرام خور بنائے، یا وہ چاہتا تو ہو قرآن کی پیروی اور اللہ جبراً اسے ملحد یا مشرک یا کافر بنادے۔

لیکن اس آزادئ انتخاب کے بعد یہ بات کہ انسان عملاً بھی وہی کچھ کرسکے جو وہ کرنا چاہتا ہے، اللہ کی مشیت اور اس کے اذن اور اس کی توفیق پر منحصر ہے۔ اگر اللہ کی مشیت یہ ہو کہ انسان کو وہ کام کرنے دے جس کے کرنے کی خواہش یا ارادہ یا فیصلہ اس نے کیا ہے، تب ہی وہ اس کو کرسکتا ہے ورنہ وہ چاہے کتنی بھی کوشش کرلے اللہ کے اذن کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ یہی بات دوسری بات میں فرمائی گئی ہے۔ اس معاملہ کو یوں سمجھئے کہ اگر دنیا میں انسان کو سارے اختیارات دے دیئے گئے ہوتے اور یہ بات اس کی مرضی پر چھوڑی گئی ہوتی کہ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے کرگزرے تو نظام عالم درہم برہم ہوجاتا۔ ایک قاتل دنیا کے تمام انسانوں کو قتل کردینے کے لیے کافی تھا ایک جیب کترا دنیا کے کسی آدمی کی جیب سلامت نہ چھوڑتا، ایک ڈاکو سے کسی کا گھر نہ بچ سکتا اگر ان میں سے ہر ایک کو من مانی کرنے کے پورے اختیارات حاصل ہوتے۔ اس لیے یہ بات اللہ نے اپنے ہی اختیار میں رکھی ہے کہ انسان صحیح یا غلط جس راستے پر بھی جانا چاہے اس پر اسے چلنے دے۔

اس کے بعد تیسری بات اس غلط فہمی کو رفع کرتی ہے کہ اللہ کی یہ مشیت اَلَل ٹپ (Arbitrary) نہیں ہے۔ وہ دانا ہے اور سب کچھ جانتا ہے وہ جو کچھ بھی کرتا ہے علم اور دانائی کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ اپنے پورے علم اور پوری حکمت کے ساتھ یہ طے کرتا ہے کہ کس کو کیا ڈھیل دینی چاہیے اور کیا نہ دینی چاہیے۔ جس حد تک وہ انسان کو موقع دیتا ہے اور اسباب کو اس کے لیے سازگار بناتا ہے اسی حد تک وہ اپنی خواہش کے مطابق کام کر سکتا ہے خواہ وہ اچھا کام ہو یا برا ہو۔ ہدایت کا معاملہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم کی بنا پر جانتا ہے اور وہی اپنی حکمت کی بنا پر طے کرتا ہے کہ کون ہدایت کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے (تفہیم القرآن۔ ج6، ص576۔577)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ المرسلٰت (77)

آیت نمبر (1 تا 28)

ك	ف	ت

(ض) كَفۡتًا کسی چیز کو جمع کر کے اپنے قبضہ میں لے لینا۔ سمیٹنا۔ زیر مطالعہ آیت۔25۔

ش	م	خ

(ف) شَمۡخًا بلند ہونا۔

شَامِخَةٌ اسم الفاعل کے وزن پر صفت ہے۔ بلند ہونے والی یعنی بلند۔ زیر مطالعہ آیت۔27۔

ترجمہ

وَالۡمُرۡسَلٰتِ	عُرۡفًا ۙ﴿۱﴾	فَالۡعٰصِفٰتِ	عَصۡفًا ۙ﴿۲﴾
قسم ہے بھیجی جانے والیوں (ہواؤں) کی	بھلائی ہوتے ہوئے	پھر قسم ہے جھونکا دینے والیوں کی	جیسے جھونکا دیتے ہیں

وَّالنّٰشِرٰتِ	نَشۡرًا ۙ﴿۳﴾	فَالۡفٰرِقٰتِ	فَرۡقًا ۙ﴿۴﴾	فَالۡمُلۡقِيٰتِ
اور قسم ہے پھیلانے والیوں کی	جیسے پھیلاتے ہیں	پھر قسم ہے الگ الگ کرنے والیوں کی	جیسے الگ الگ کرتے ہیں	پھر قسم ہے سامنے کرنے والیوں کی

ذِكۡرًا ۙ﴿۵﴾	عُذۡرًا اَوۡ	نُذۡرًا ۙ﴿۶﴾	اِنَّمَا	تُوۡعَدُوۡنَ
یاددہانی کو	عذر ختم کرنے کے لیے	یا خبردار کرنے کے لیے	کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	جو تم لوگوں سے وعدہ کیا جاتا ہے

لَوَاقِعٌ ؕ﴿۷﴾	فَاِذَا النُّجُوۡمُ طُمِسَتۡ ۙ﴿۸﴾	وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتۡ ۙ﴿۹﴾
یقیناً واقع ہونے والا ہے	پھر جب ستارے مٹا دیئے جائیں گے	اور جب آسمان میں شگاف ڈالے جائیں گے

وَاِذَا الۡجِبَالُ نُسِفَتۡ ۙ﴿۱۰﴾	وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتۡ ؕ﴿۱۱﴾	لِاَیِّ یَوۡمٍ اُجِّلَتۡ ؕ﴿۱۲﴾
اور جب پہاڑوں کو اکھاڑ کر اڑا دیا جائے گا	اور جب تمام رسول اکٹھا کیے جائیں گے	کس دن کے لیے مدت مقرر کی گئی

لِیَوۡمِ الۡفَصۡلِ ۚ﴿۱۳﴾	وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا یَوۡمُ الۡفَصۡلِ ؕ﴿۱۴﴾	وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِیۡنَ ﴿۱۵﴾
فیصلہ کرنے کے دن کے لیے	اور تو کیا جانے کیا ہے فیصلہ کرنے کا دن	تباہی ہے جس دن جھٹلانے والوں کے لیے

اَلَمۡ نُهۡلِكِ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۶﴾	ثُمَّ نُتۡبِعُهُمُ	الۡاٰخِرِيۡنَ ﴿۱۷﴾	كَذٰلِكَ نَفۡعَلُ بِالۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۸﴾
کیا ہم نے ہلاک نہیں کیا پہلوں کو	پھر ہم ان کے پیچھے بھیجتے ہیں	بعد والوں کو	اس کے جیسا ہی ہم کرتے ہیں مجرموں کے ساتھ

وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۱۹﴾	اَلَمۡ نَخۡلُقۡكُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ ﴿۲۰﴾	فَجَعَلۡنٰهُ
تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	کیا ہم نے پیدا نہیں کیا تم کو ایک حقیر پانی سے	پھر ہم نے رکھا اس (پانی) کو

فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ ﴿۲۱﴾	اِلٰى قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۲۲﴾	فَقَدَرۡنَا ۖ
ایک مضبوط ٹھکانے میں	ایک طے شدہ اندازے (مدت) تک	پھر ہم قابو یافتہ رہے

فَنِعۡمَ الۡقٰدِرُوۡنَ ﴿۲۳﴾	وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۲۴﴾	اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾
تو کیا ہم ہی اچھے قابو پانے والے ہیں	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	کیا ہم نے نہیں بنایا زمین سمیٹنے کے لیے

اَحۡيَآءً	وَّاَمۡوَاتًا ﴿۲۶﴾	وَّجَعَلۡنَا فِيۡهَا رَوَاسِىَ شٰمِخٰتٍ
زندوں کو (اپنی پیٹھ پر)	اور مُردوں کو (اپنے پیٹ میں)	اور ہم نے بنائے اس میں اونچے پہاڑ

وَّاَسۡقَيۡنٰكُمۡ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾	وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۲۸﴾
اور ہم نے پینے کے لیے دیا تم کو شیریں پانی	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے

نوٹ: 1

اس سورت میں حق تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسمیں کھا کر قیامت کے یقینی طور آنے کا ذکر فرمایا ہے۔ ان چیزوں کا نام بیان کرنے کے بجائے ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ مرسلات۔ عاصفات۔ ناشرات۔ فارقات اور ملقیت الذکر۔ کسی حدیث میں بھی یہ تعین نہیں ہے کہ یہ کن چیزوں کی صفات ہیں۔ اس لیے صحابہ اور تابعین کی تفسیریں اس معاملہ میں مختلف ہوگئیں۔ بعض حضرات نے ان پانچوں صفات کا موصوف فرشتوں کو قرار دیا ہے۔ جبکہ بعض حضرات نے ان کا موصوف انبیاء ورسل کو قرار دیا ہے۔ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ شروع کی تین صفات ہواؤں کے لیے ہیں۔ ان تین میں ہواؤں کی قسم ہے۔ باقی دو صفتیں فرشتوں کے لیے ہیں تو یہ فرشتوں کی قسم ہے۔ (معارف القرآن)

نوٹ: 2

ان آیات میں بارش لانے والی ہواؤں کی ترتیب یہ بیان کی گئی کہ پہلے پے در پے ہوائیں چلتی ہیں، پھر آندھی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، پھر بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں، پھر انہیں پھاڑ کر جدا کرتی ہیں۔ اس کے بعد بارش کے نزول کا ذکر کرنے کے بجائے یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی یاد دلوں میں ڈالتی ہیں، عذر کے طور پر اگر ایک مدت تک بارش نہ ہوئی ہو اور لوگ پانی کے قطرے قطرے کو ترس رہے ہوں تو اس موقع پر کٹے سے کٹا کافر بھی خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ اگر معمولی قحط ہو تو عام آدمی جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ دور نہیں ہے، وہ تو اللہ کو یاد کرے گا۔ لیکن دوسرے لوگ (یعنی اعلیٰ تعلیم یافتہ دانشور لوگ) سائنس بگھاریں گے اور کہیں گے کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے، فلاں فلاں اسباب سے بارش نہیں ہو رہی ہے، اتنی سی بات پر دعائیں مانگنے لگنا ضعیف الاعتقادی ہے۔ البتہ اگر طویل مدت تک قحط برپا رہے تو بڑے سے بڑے کافر کو خدا یاد آنے لگتا ہے۔ اور خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ جو ہوائیں بادل اٹھا کر لا رہی ہیں ان سے پورے ملک میں بارش ہو جائے۔ یہ ہے عذر کے طور پر دلوں میں خدا کی یاد کا القاء۔ رہا نُذُرًا (ڈراوے) کے طور پر اس کا القاء تو یہ اس وقت ہوتا ہے جب آندھی طوفانِ عظیم بن جائے یا بارش اس قدر زور دار ہو کہ سیلاب بلا بن جائے اپنے وقت میں مضبوط سے مضبوط دل کا منکر بھی خدا کے آگے گڑگڑانے لگتا ہے اور اس وقت طوفان یا سیلاب کی ساری سائنٹیفیک توجیہات اس کے نہاں خانۂ دماغ سے فرار اختیار کر جاتی ہیں۔ (تفہیم القرآن۔ ج6 ص579)

آیت نمبر (29 تا 50)

6940

ل	ھ	ب

(ف) لَهَبًا آگ کا بھڑکنا۔
لَهَبٌ آگ کا شعلہ، بلند غبار۔ زیر مطالعہ آیت۔ 31۔

ترکیب (آیت۔ 36) وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ میں نون اعرابی کی موجودگی بتا رہی ہے کہ اس کا فاسیبہ نہیں ہے۔ اگر یہ فاسیبہ ہوتا تو فَيَعْتَذِرُوْا آتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ فَا عاطفہ ہے جو لَا يُؤْذَنُ پر عطف ہے۔ ترجمہ میں اس کا لحاظ کرنا ہوگا۔ فاسیبہ کے طور پر جو ترجمے کیے گئے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ (حافظ احمد یار صاحب مرحوم)

ترجمہ

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا	كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٩﴾	اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ
تم لوگ چلو اس کی طرف	تم لوگ جھٹلایا کرتے تھے جس کو	تم لوگ چلو ایک ایسے سائے کی طرف جو

ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿٣٠﴾	لَّا ظَلِيْلٍ	وَّلَا يُغْنِيْ	مِنَ اللَّهَبِ ﴿٣١﴾	اِنَّهَا تَرْمِيْ
تین شاخوں والا ہے	جو نہ گھنی چھاؤں ہے	اور جو فائدہ نہیں پہنچائے گا	آگ کی لپٹ سے	بیشک وہ (آگ) پھینکتی ہے

بِشَرَرٍ	كَالْقَصْرِ ﴿٣٢﴾	كَاَنَّهٗ	جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿٣٣﴾	وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٤﴾
ایسی چنگاریاں جو	محل کے مانند ہیں	جیسے کہ وہ (چنگاریاں)	زرد اونٹ ہوں	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٣٥﴾	وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ	فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿٣٦﴾	وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٧﴾
یہ ان کے نہ بول سکنے کا دن ہے	اور نہ اجازت دی جائے گی ان کو	پس وہ معذرت نہ کر سکیں گے	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ	جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٨﴾	فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ	فَكِيْدُوْنِ ﴿٣٩﴾
یہ فیصلہ کرنے کا دن ہے	ہم نے جمع کیا تم کو اور پہلوں کو	پھر اگر ہے تمہاری کوئی چالبازی	تو تم لوگ چالبازی کرو مجھ سے

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٠﴾	اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ	فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿٤١﴾
تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	یقیناً متقی لوگ	سایوں اور چشموں میں ہوں گے

وَّفَوَاكِهَ	مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٤٢﴾	كُلُوْا وَاشْرَبُوْا	هَنِيْٓـًٔا بِمَا	كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٤٣﴾
اور پھلوں میں	اس میں سے جو وہ چاہیں گے	تم لوگ کھاؤ اور پیو	خوشگوار ہوتے ہوئے بسبب اس کے جو	تم لوگ عمل کیا کرتے تھے

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي	الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٤٤﴾	وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٥﴾	كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا
بیشک ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں	خوب کاروں کا	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	کھالو اور برت لو تھوڑا عرصہ

اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾	وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾	وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ
بیشک تم لوگ مجرم ہو	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	اور جب کہا جاتا ہے ان سے

ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾	وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾
تم لوگ رکوع کرو تو وہ رکوع نہیں کرتے	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ	بَعْدَهٗ	يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع
تو (اب) کس بات پر	اس (قرآن) کے بعد	وہ لوگ ایمان لائیں گے

نوٹ: 1

آیت۔35۔36 میں ایک ایسے دن کا ذکر ہے جب کافر لوگ نہ بول سکیں گے نہ کوئی عذر پیش کریں گے۔ یہ ان کی آخری حالت ہوگی جو جہنم میں داخلہ کے وقت ان پر طاری ہوگی۔ اس سے پہلے میدان حشر میں تو یہ لوگ بہت کچھ کہیں گے، بہت سی معذرتیں پیش کریں گے، ایک دوسرے پر اپنے قصوروں کا الزام ڈال کر خود بے قصور بننے کی کوشش کریں گے، اپنے گمراہ کرنے والے سرداروں اور پیشواؤں کو گالیاں دیں گے حتیٰ کہ بعض لوگ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے جرائم کا انکار تک کر گزریں گے جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مگر جب تمام شہادتوں سے ان کا مجرم ہونا ثابت کر دیا جائے گا اور جب ان کے ہاتھ پاؤں اور ان کے اعضاء تک ان کے خلاف گواہی دے کر ثبوت جرم میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے تو ان کے لیے اپنی معذرت میں کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ عذر پیش کرنے کی اجازت نہ دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صفائی کا موقع دیئے بغیر ان کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا جرم اس طرح قطعی حد تک ثابت کر دیا جائے گا کہ ان کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ میں نے اس کو بولنے نہیں دیا یا میں نے اس کی زبان (بولتی) بند کر دی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس پر ایسی حجت تمام کی کہ اس کے لیے زبان کھولنے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ (تفہیم القرآن)

6940

6940

6940

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6973

سورۃ النبا (78)

آیت نمبر (1 تا 16)

و ھ ج

(ض) وَهْجًا آگ یا سورج کا روشن ہونا۔

وَهَّاجٌ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔خوب روشن ہونے والا۔زیر مطالعہ آیت۔13۔

ث ج ج

(ن) ثَجُوْجًا پانی کا زور سے بہنا یا برسنا۔

ثَجَّاجٌ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے بہت زور سے بہنے والا یا برسنے والا۔زیر مطالعہ آیت۔14۔

ترجمہ

عَمَّ	یَتَسَآءَلُوْنَ ۚ﴿۱﴾	عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ ۙ﴿۲﴾	الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ
کس چیز کے بارے میں	یہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں	اُس عظیم خبر کے بارے میں؟	وہ، یہ لوگ جس میں
مُخْتَلِفُوْنَ ؕ﴿۳﴾	كَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۴﴾	ثُمَّ	كَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ ﴿۵﴾
اختلاف کرنے والے ہیں	ہرگز نہیں! یا یہ لوگ جان لیں گے	پھر (مکرر)	ہرگز نہیں! یہ لوگ جان لیں گے
اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ	مِهٰدًا ۙ﴿۶﴾	وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۖ﴿۷﴾	
کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو	آرام دہ ٹھکانہ	اور پہاڑوں کو میخیں	
وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ﴿۸﴾	وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ	سُبَاتًا ۙ﴿۹﴾	وَّجَعَلْنَا الَّیْلَ
اور ہم نے پیدا کیے تم لوگوں کو جوڑے جوڑے	اور ہم نے بنایا تمہاری نیند کو	آرام کے لیے	اور ہم نے بنایا رات کو
لِبَاسًا ۙ﴿۱۰﴾	وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ	مَعَاشًا ۖ﴿۱۱﴾	وَّبَنَیْنَا فَوْقَكُمْ
ایک پردہ	اور ہم نے بنایا دن کو	زندگی گزارنے کا وقت	اور ہم نے بنائے تمہارے اوپر
سَبْعًا شِدَادًا ۙ﴿۱۲﴾	وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۖ﴿۱۳﴾	وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ	
سات مضبوط (آسمان)	اور ہم نے بنایا ایک بہت روشن چراغ	اور ہم نے اتارا بدلیوں میں سے	
مَآءً ثَجَّاجًا ۙ﴿۱۴﴾	لِّنُخْرِجَ بِهٖ	حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ﴿۱۵﴾	وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ؕ﴿۱۶﴾
موسلا دھار پانی	تاکہ ہم نکالیں اس سے	دانے اور سبزہ	اور کچھ گھنے باغات

نوٹ:1 عَمَّ دراصل دو حرفوں عن اور ما سے مرکب ہے۔حرف مَا استفہام کے لیے آتا ہے۔اس ترکیب میں حرف مَا سے الف ساقط کر دیا جاتا ہے۔

معنی ہوئے جس چیز کے بارے میں (معارف القرآن)۔ 6973

نوٹ:2 مکہ معظّمہ میں جب اوّل اوّل رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو اس کی بنیاد تین چیزیں تھیں۔ ایک یہ بات کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے۔ دوسری یہ کہ آپ ﷺ کو اللہ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے۔ تیسری یہ کہ اس دنیا کا ایک روز خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ایک دوسرا عالم برپا ہوگا جس میں تمام اولین و آخرین دوبارہ زندہ کر کے اسی جسم کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جس میں رہ کر انہوں نے اس دنیا میں کام کیا تھا۔ پھر ان کے عقائد اور اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ اس محاسبہ میں جو لوگ مومن اور صالح ثابت ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں جائیں گے اور جو کافر و فاسق ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے۔

ان میں سے پہلی بات اگرچہ اہل مکہ کو سخت ناگوار تھی، لیکن بہرحال وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے، اس کے رب اعلیٰ اور خالق و رازق ہونے کو بھی مانتے تھے اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ دوسری جن جن ہستیوں کو وہ معبود قرار دیتے ہیں وہ اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔ اس لیے جھگڑا صرف اس بات میں تھا کہ خدا کی خدائی میں ان ہستیوں کی کوئی شرکت ہے یا نہیں۔ دوسری بات کو مکہ کے لوگ ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن اس امر سے انکار کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ چالیس سال تک جو زندگی آپ ﷺ نے ان کے درمیان گزاری تھی اس میں انہوں نے کبھی آپ ﷺ کو جھوٹا یا فریب کار یا مطلبی نہ پایا تھا۔ اس لیے ہزار بہانے اور الزامات تراشنے کے باوجود انہیں دوسروں کو باور کرانے اور خود باور کرنے میں سخت مشکل پیش آ رہی تھی کہ حضور ﷺ سارے معاملات میں تو راستباز ہیں اور صرف رسالت کے دعوے میں معاذ اللہ جھوٹے ہیں۔

اس طرح پہلی دو باتیں اہل مکہ کے لیے اتنی زیادہ الجھن کا باعث نہ تھیں جتنی تیسری بات تھی۔ انہوں نے سب سے زیادہ اسی کا مذاق اڑایا، سب سے زیادہ حیرانی اور تعجب کا اظہار کیا اور اسے بالکل بعید از عقل اور ناممکن سمجھ کر جگہ جگہ اس کے ناقابل تصور ہونے کے چرچے شروع کر دیئے۔ مگر ان لوگوں کو اسلام کی راہ پر لانے کے لیے یہ قطعی ناگزیر تھا کہ آخرت کا عقیدہ ان کے ذہن میں اتارا جائے کیونکہ اس عقیدے کو مانے بغیر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حق اور باطل کے معاملہ میں ان کا طرز فکر سنجیدہ ہو سکتا، خیر و شر کے معاملہ میں ان کا معیار بدل سکتا اور دنیا پرستی کی راہ چھوڑ کر اس راہ پر ایک قدم بھی چل سکتے جس پر اسلام ان کو چلانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ معظّمہ کے ابتدائی دور کی سورتوں میں زیادہ تر زور آخرت کا عقیدہ دلوں میں بٹھانے پر صرف کیا گیا ہے۔ البتہ اس کے لیے دلائل ایسے انداز سے دیئے گئے ہیں جن سے توحید کا تصور بھی خود بخود ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے اور بیچ بیچ میں رسول اللہ ﷺ اور قرآن کے برحق ہونے کے دلائل بھی مختصراً دے دیے گئے ہیں۔ اس لیے اس دور کی سورتوں میں سورۂ قیامہ سے نازعات تک) آخرت کے مضمون کی تکرار زیادہ ہے۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶۔ ص: ۲۲۰۔۲۲۱)

نوٹ:3 آیت۔9۔ میں حق تعالیٰ نے انسان کی راحت کے سب سامانوں میں سے خاص طور پر نیند کا ذکر فرمایا ہے۔ غور کیجئے تو یہ ایک عظیم الشان نعمت ہے۔ اور اس نعمت کو حق تعالیٰ نے پوری مخلوق کے لیے ایسا عام فرما دیا ہے کہ امیر، غریب، عالم، جاہل، بادشاہ اور مزدور سب کو یہ دولت بیک وقت عطا ہوتی ہے۔ بلکہ دنیا کے حالات کا تجزیہ کریں تو غریبوں اور محنت کشوں کو یہ نعمت جیسی حاصل ہوتی ہے وہ مالداروں اور دنیا کے بڑوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ نیند کی نعمت گدوں، تکیوں یا کوٹھی بنگلوں کی فضا کے تابع نہیں ہے، یہ تو حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو براہِ راست اس کی طرف سے ملتی ہے۔ بعض اوقات مفلس کو بغیر کسی بستر تکیے کے، کھلی زمین پر یہ نعمت فراوانی سے دے دی جاتی

ہے اور بعض اوقات ساز وسامان والوں کو نہیں دی جاتی، ان کو خواب آور گولیاں کھا کر حاصل ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ گولیاں بھی کام 6973 نہیں کرتیں۔ پھر غور کرو کہ حق تعالیٰ نے ساری مخلوق کو یہ نعمت مفت اور بلامحنت دی ہے۔ پھر اس سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے اپنی رحمت کاملہ سے اس نعمت کو جبری بنا دیا ہے۔ انسان بعض اوقات کام کی کثرت سے مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ رات بھر جاگتا رہے مگر رحمت حق اس پر جبراً نیند مسلط کر کے اس کو سلا دیتی ہے کہ دن بھر کی تھکان دور ہو جائے اور اس کے قویٰ مزید کام کے لیے تیز ہو جائیں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 4

آیت۔13۔ میں روشن چراغ سے مراد سورج ہے۔ اس مختصر سے فقرے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے جس عظیم الشان نشان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا قطر زمین کے قطر سے ۱۰۹ گنا اور حجم زمین کے حجم سے ۱۳ لاکھ ۳۳ ہزار گنا زیادہ بڑا ہے۔ اس کا درجۂ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ زمین سے ۹ کروڑ تیس لاکھ میل دور ہونے کے باوجود اس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ انسان اگر برہنہ آنکھ سے اس کی طرف نظر جمانے کی کوشش کرے تو اپنی بینائی کھو بیٹھے۔ یہ اللہ ہی کی حکمت ہے کہ اس نے زمین کو اس سے ٹھیک اتنے فاصلے پر رکھا ہے کہ نہ اس سے بہت قریب ہونے کے باعث اتنا گرم ہے اور نہ بہت دور ہونے کے باعث بے انتہا سرد۔ اسی وجہ سے یہاں انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی ممکن ہوئی ہے۔ اسی سے قوت کے بے حساب خزانے نکل کر زمین پر پہنچ رہے ہیں۔ اسی سے فصلیں پک رہی ہیں اور ہر مخلوق کو غذا پہنچ رہی ہے۔ اسی کی حرارت سمندروں کے پانی کو گرم کر کے وہ بھاپیں اٹھاتی ہے جو ہواؤں کے ذریعہ سے زمین کے مختلف حصوں میں پھیلی اور بارش کی شکل میں برستی ہیں۔ اس سورج میں اللہ تعالیٰ نے ایسی زبردست بھٹی سلگا رکھی ہے جو اربوں سال سے روشنی، حرارت اور مختلف اقسام کی شعاعیں سارے نظام شمسی میں پھینکے جا رہی ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (17 تا 30)

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ	كَانَ مِيْقَاتًا ﴿١٧﴾	يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ	فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ﴿١٨﴾
یقیناً فیصلے کا دن	ہے ایک طے شدہ وقت	جس دن پھونکا جائے گا صور میں	تو تم لوگ آؤ گے فوج در فوج

وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ	فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴿١٩﴾	وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ	فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿٢٠﴾
اور کھولا جائے گا آسمان	تو وہ ہوگا دروازے دروازے	اور چلایا جائے گا پہاڑوں کو	تو وہ ہوں گے چمکتی ریت

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿٢١﴾	لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ﴿٢٢﴾	لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ﴿٢٣﴾
بیشک جہنم ہے گھات لگانے کا مستقل ٹھکانہ	سرکشی کرنے والوں کے لیے واپس ہونے کی جگہ ہوتے ہوئے	رہنے والے ہوتے ہوئے اس میں مدتوں

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا	بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿٢٤﴾	اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿٢٥﴾
وہ لوگ نہیں چکھیں گے اس میں	کوئی ٹھنڈک اور نہ کوئی پینے کی چیز	سوائے گرم پانی اور پیپ کے

جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿٢٦﴾	اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿٢٧﴾	وَّكَذَّبُوْا
جیسے کا تیسا بدلہ ہوتے ہوئے	بیشک یہ لوگ توقع نہیں کیا کرتے تھے کسی محاسبہ کی	اور انہوں نے جھٹلایا ہماری نشانیوں کو

بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿٢٨﴾	وَكُلَّ شَيْءٍ	اَحْصَيْنٰهُ	كِتٰبًا ﴿٢٩﴾
بہت زیادہ جھٹلاتے ہوئے	اور ہر چیز کو	ہم نے احاطہ کیا اس کا	بطور لکھی ہوئی ہونے کے

فَذُوْقُوْا	فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ	اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾
پس تم لوگ چکھو	تو ہم ہرگز زیادہ نہیں کریں گے تم کو	مگر بلحاظ عذاب کے

6973

نوٹ:1

یَوْمَ الْفَصْلِ سے مراد قیامت ہے۔ وہ ایک وقت اور متعین حد ہے جس پر یہ دنیا ختم ہوجائے گی جبکہ صور پھنکا جائے گا۔ اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخ صور دو مرتبہ ہوگا۔ پہلے نفخہ سے سارا عالم فنا ہوجائے گا اور دوسرے نفخہ سے پھر زندہ وقائم ہوجائے گا۔ اس دوسرے نفخہ کے وقت سارے عالم کے اگلے پچھلے انسان اپنے رب کے سامنے فوج درفوج ہوکر حاضر ہوں گے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ قیامت کے روز تین فوجوں میں تقسیم ہوں گے۔ ایک فوج ان لوگوں کی ہوگی جو پیٹ بھرے ہوئے لباس پہنے ہوئے سواریوں پر سوار میدان حشر میں آئیں گے، دوسری فوج پیادہ لوگوں کی ہوگی جو چل کر میدان میں آئیں گے اور تیسری فوج ان لوگوں کی ہوگی جن کو چہروں کے بل گھسیٹ کر میدان حشر میں لایا جائے گا۔ بعض روایات میں افواج کی تشریح دس قسم کی افواج سے کی گئی ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ حاضرین محشر کی بے شمار جماعتیں اپنے اپنے اعمال کے اعتبار سے ہوں گی۔ ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں، سب جمع ہوسکتے ہیں، (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔23۔ میں ہے کہ وہ لوگ اس میں مدتوں رہنے والے ہیں۔ مدتوں کے لیے لفظ احقاب استعمال کیا گیا ہے (یہ جمع الجمع ہے۔ اس کا واحد حُقْبٌ ہے۔ اس کی جمع حُقُبٌ ہے اور اس کی جمع اَحْقَابٌ ہے۔ مرتب) جس کے معنی ہیں پے در پے آنے والے طویل زمانے۔ اس لفظ سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنت کی زندگی میں تو ہمیشگی ہوگی مگر جہنم میں ہمیشگی نہیں ہوگی کیونکہ یہ مدتیں خواہ کتنی ہی طویل ہوں لیکن بہرحال کبھی نہ کبھی جا کر ختم ہوجائیں گی۔ لیکن یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ عربی لغت کے لحاظ سے حقب کے لفظ ہی میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ایک حقب کے پیچھے دوسرا حقب ہو۔ اس لیے احقاب لازماً ایسے ادوار ہی کے لیے بولا جائے گا جو پے در پے ایک دوسرے کے بعد آتے چلے جائیں اور کوئی دور بھی ایسا نہ ہو جس کے پیچھے دوسرا دور نہ آئے۔ دوسرے یہ کہ کسی موضوع کے متعلق قرآن مجید کی کسی آیت سے کوئی ایسا مفہوم لینا اصولاً غلط ہے جو اسی موضوع کے بارے میں قرآن کے دوسرے بیانات سے متصادم ہو۔ قرآن میں ۳۴ مقامات پر اہل جہنم کے لیے خلود (ہمیشگی) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ایک جگہ صاف صاف ارشاد ہوا ہے کہ وہ چاہیں گے کہ جہنم سے نکل جائیں مگر وہ اس سے ہرگز نکلنے والے نہیں ہیں۔ (المائدۃ۔37) ان تصریحات کے بعد لفظ احقاب کی بنیاد پر یہ کہنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ جہنم میں خدا کے باغیوں کا قیام دائمی نہیں ہوگا۔ (تفہیم القرآن)۔

یہ بات اس لیے بھی غلط ہے کہ زبان سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ مجمل کی شرح مفصل کی روشنی میں کرتے ہیں نہ کہ مفصل کی شرح مجمل کی روشنی میں۔ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا کے الفاظ ظاہر ہے کہ مفصل ہیں اور لفظ اَحْقَابٌ مجمل ہے۔ اس مجمل کو مفصل کی روشنی میں سمجھیں گے نہ کہ اس کے برعکس (تدبر قرآن)۔

آیت نمبر (31 تا 40)

6973

د	ہ	ق

(ف) دَهْقًا پیالہ بھرنا۔ پانی کو زور سے گرانا۔
دِهَاقَ لبالب بھرا ہوا پیالہ۔ زیر مطالعہ آیت۔34۔

ترکیب

(آیت۔31) مَفَازًا مبتدا مؤخر نکرہ ہے اور اِنَّ کا اسم ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے جو مَوْجُوْدٌ ہو سکتی ہے۔ لِلْمُتَّقِيْنَ قائم مقام خبر مقدم ہے۔ (آیت۔23 تا 34)۔ ان آیات کے الفاظ سابقہ آیت کے اِنَّ پر عطف ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں، (آیت۔35)۔ لَغْوًا اور كِذَّابًا، لَا يَسْمَعُوْنَ کا مفعول ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں۔ (آیت۔36)۔ جَزَاءً اور عَطَاءً حِسَابًا حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں۔ (آیت۔37) اس آیت میں رَبِّ اور اَلرَّحْمٰنِ، یہ دونوں گزشتہ آیت کے رَبِّكَ کا بدل ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہیں۔ (آیت۔40) اَلْمَرْءُ اور اَلْكَافِرُ دونوں پر لام جنس ہے۔

ترجمہ

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ	مَفَازًا ﴿٣١﴾	حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ﴿٣٢﴾
یقیناً متقی لوگوں ہی کے لیے	مراد پانے کی ایک جگہ ہے	باغیچے ہیں اور انگور ہیں
وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿٣٣﴾	وَّ كَاْسًا دِهَاقًا ﴿٣٤﴾	لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا
اور نوخیز ہم جولیاں ہیں	اور چھلکتے جام ہیں	وہ لوگ نہیں سنیں گے اس میں
لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿٣٥﴾	جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ	عَطَآءً حِسَابًا ﴿٣٦﴾
کوئی بے سود بات اور نہ کوئی جھوٹ	بدلہ ہوتے ہوئے آپؐ کے رب (کی طرف) سے	حساب کی ہوئی بخشش ہوتے ہوئے
رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	وَمَا بَيْنَهُمَا	الرَّحْمٰنِ
جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے	اور اس کا جو ان دونوں کے درمیان ہے	جو انتہائی رحمت والا ہے
لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿٣٧﴾	يَوْمَ يَقُوْمُ	الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ	صَفًّا
لوگ اختیار نہیں رکھتے اس سے خطاب کرنے کا	جس دن کھڑے ہوں گے	وہ روح (جبریلؑ) اور سارے فرشتے	صف بنائے ہوئے
لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ	اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ	وَقَالَ صَوَابًا ﴿٣٨﴾	ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ
لوگ بول نہیں پائیں گے سوائے اس کے	اجازت دے گا جس کے لیے رحمٰن	اور وہ کہے گا بے لاگ بات	یہ ہوگا وہ برحق دن
فَمَنْ شَآءَ	اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿٣٩﴾	اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ
تو (اب) جس کا جی چاہے	وہ بنالے اپنے رب کی طرف واپس ہونے کی ایک جگہ	بیشک ہم نے خبردار کر دیا تم لوگوں کو
عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ	يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ	مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ
ایک قریبی عذاب سے	جس دن دیکھ لے گا ہر آدمی	اس کو جو آگے بھیجا اس کے دونوں ہاتھوں کو

وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ	يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝ 6973
اور کہے گا ہر کافر	اے کاش میں ہوتا کوئی مٹی

نوٹ: 1

آیت۔36۔کا مطلب یہ ہے کہ اوپر جنت کی جن نعمتوں کا ذکر آیا ہے یہ جزاء ہے مومنین کے لیے اور عطاء ہے ان کے رب کی طرف سے یہاں ان نعمتوں کو پہلے جزائے اعمال بتلایا گیا پھر عطائے ربانی۔ بظاہر ان دونوں میں تضاد ہے۔ جزاء اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے بدلے میں ہو۔ اور عطاء وہ ہے جو بلا کسی بدلے کے بطور انعام ہو۔ قرآن کریم نے ان دونوں لفظوں کو ایک جگہ جمع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جنت میں داخل ہونا اور اس کی نعمتیں صرف صورت اور ظاہر کے اعتبار سے اہل جنت کے اعمال کی جزاء ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ خالص عطائے ربانی ہے، کیونکہ انسانی اعمال تو ان نعمتوں کا بھی بدلہ نہیں بن سکتے جو ان کو دنیا میں دے دی گئیں۔ اس لیے آخرت میں نعمتوں کا ملنا تو صرف حق تعالیٰ کا انعام اور عطائے محض ہے۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے عمل سے جنت میں نہیں جا سکتا جب تک حق تعالیٰ کا فضل نہ ہو۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ کیا آپ ﷺ بھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی اپنے عمل سے جنت میں نہیں جا سکتا۔

لفظ حِسَابًا کے دو معنی کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی عطاء جو اس کی تمام ضرورتوں کے لیے کافی ہو۔ اور لفظ کے دوسرے معنی حساب کے موازنہ اور مقابلہ کے لیے بھی آتے ہیں۔ اس معنی میں آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ عطائے ربانی اہل جنت پر ان کے اعمال کے حساب سے مبذول ہوگی۔ اس عطاء میں درجات بحساب اخلاص اور احسانِ عمل کے ہوں گے جیسا کہ احادیث میں صحابہ کرامؓ کے اعمال کا درجہ باقی امت کے اعمال کے مقابلے میں یہ قرار دیا ہے کہ صحابی اگر اللہ کی راہ میں ایک مد یعنی ایک سیر خرچ کرے اور غیر صحابی اُحد پہاڑ کے برابر خرچ کرے تو صحابی کا ایک مُد اس پہاڑ سے بڑھا ہوا رہے گا۔ (معارف القرآن)

مورخہ ۲۳۔ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ النّٰزِعٰتِ (79)

آیت نمبر (1 تا 14)

ن ش ط

(ض۔ن) نَشْطًا گرہ کھولنا۔ گرہ لگانا۔ بند کھولنا۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

نَاشِطَةٌ اسم الفاعل ہے۔ بند کھولنے والی۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

ن خ ر

(س) نَخَرًا بوسیدہ ہو کر ریزہ ریزہ ہونا۔

نَخِرَةٌ صفت ہے۔ ریزہ ریزہ۔ بُھربُھری۔ زیر مطالعہ آیت۔11۔

س ھ ر

6973

سَهَرًا رات بھر جاگتے رہنا۔

سَاهِرَةٌ رات بھر جاگنے والی۔ پھر اس سے مراد لیتے ہیں سطح زمین۔ میدان۔ زیر مطالعہ آیت۔14۔

ترجمہ

وَالنّٰزِعٰتِ	غَرْقًا ۙ﴿۱﴾	وَّالنّٰشِطٰتِ	نَشْطًا ۙ﴿۲﴾
قسم ہے کھینچ نکالنے والیوں کی	ڈوب کر	اور بند کھولنے والیوں کی	جیسے کھولنے کا حق ہے

وَّالسّٰبِحٰتِ	سَبْحًا ۙ﴿۳﴾	فَالسّٰبِقٰتِ	سَبْقًا ۙ﴿۴﴾	فَالْمُدَبِّرٰتِ
اور تیرنے والیوں کی	جیسے تیرتے ہیں	پھر سبقت کرنے والیوں کی	جیسے سبقت کرتے ہیں	پھر تدبیر کرنے والیوں کی

اَمْرًا ۘ﴿۵﴾	يَوْمَ تَرْجُفُ	الرَّاجِفَةُ ۙ﴿۶﴾	تَتْبَعُهَا	الرَّادِفَةُ ؕ﴿۷﴾
کسی (بھی) حکم کے لیے	جس دن لرزے گی	وہ لرزنے والی	اس کے پیچھے آئے گی	وہ پیچھے لگنے والی

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ	وَّاجِفَةٌ ۙ﴿۸﴾	اَبْصَارُهَا	خَاشِعَةٌ ۘ﴿۹﴾	يَقُوْلُوْنَ
کچھ دل اس دن	مضطرب ہونے والے ہیں	ان کی آنکھیں	جھکنے والی ہیں	وہ لوگ کہتے ہیں

ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ	فِي الْحَافِرَةِ ؕ﴿۱۰﴾	ءَاِذَا كُنَّا	عِظَامًا نَّخِرَةً ﴿۱۱﴾
کیا بے شک ہم ضرور لوٹائے جانے والے ہیں	اُسی قدم میں (اُلٹے پاؤں)	کیا جب ہم ہو گئے	بُھر بُھری ہڈیاں

قَالُوْا	تِلْكَ اِذًا	كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿۱۲﴾	فَاِنَّمَا هِيَ
انہوں نے کہا	وہ تو پھر	خسارہ دینے والی باری ہوگی	پھر وہ تو بس

زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ﴿۱۳﴾	فَاِذَا هُمْ	بِالسَّاهِرَةِ ؕ﴿۱۴﴾
ایک (ہی) جھڑکی ہوگی	پھر جب ہی وہ لوگ	اُس میدان میں ہوں گے

نوٹ: 1

یہاں پانچ اوصاف رکھنے والی ہستیوں کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے اس کی وضاحت نہیں کی گئی لیکن آگے کا مضمون اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ قیامت ضرور آئے گی اور تمام مرے ہوئے انسان دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ اس کی وضاحت بھی نہیں کی گئی کہ یہ پانچ اوصاف کن ہستیوں کے ہیں۔ لیکن صحابہ اکرامؓ اور تابعین کی بڑی تعداد کا کہنا ہے کہ اس سے مراد فرشتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وقوعِ قیامت اور حیات بعد الموت پر فرشتوں کی قسم کیوں کھائی گئی، جبکہ یہ خود بھی اسی طرح غیر محسوس ہیں جس طرح وہ چیز غیر محسوس ہے جس کے واقع ہونے پر ان کو بطور گواہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب فرشتوں کے وجود کے منکر نہ تھے۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ انسان کی جان فرشتے ہی نکالتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ فرشتوں کی حرکت انتہائی تیز ہے۔ اور ہر حکم بلا تاخیر بجالاتے ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ فرشتے کائنات کا انتظام اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے چلاتے ہیں، اپنی مرضی کے مالک نہیں ہیں۔ اس لیے یہاں پر استدلال اس بنا پر کیا گیا ہے کہ جب خدا کے حکم سے فرشتے تمہاری جان نکالتے ہیں تو اسی کے حکم سے وہ دوبارہ جان ڈال بھی سکتے ہیں

جب خدا کے حکم سے وہ کائنات کا انتظام چلا رہے ہیں تو اسی حکم سے وہ اس کائنات کو درہم برہم کر کے ایک دوسری دنیا بھی بنا سکتے ہیں۔ (تفہیم القرآن) 6973

نوٹ: 2

اس جگہ فرشتوں کی پانچ صفات بیان کی گئی ہیں جن کا تعلق انسان کی موت اور روح قبض کرنے سے ہیں مقصد تو قیامت کا حق ہونا بیان کرنا ہے لیکن شروع انسان کی موت اس کے لیے ایک جزوی قیامت ہے۔ پہلی صفت اَلنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ہے، یعنی سختی سے کھینچ کر نکالنے والے۔ اس سے مراد وہ عذاب کے فرشتے ہیں جو کافر کی روح نکالتے ہیں۔ دوسری صفت وَالنّٰشِطٰتِ ہے۔ یہ نَشَطَ سے مشتق ہے جس کے معنے بندھن کھول دینے کے ہیں۔ جس چیز میں پانی یا ہوا وغیرہ بھری ہو اس کا بندھن کھول دینے سے وہ چیز آسانی کے ساتھ نکل جاتی ہے۔ اس میں مومن کی روح نکلنے کے لیے تشبیہ ہے کہ جو فرشتے مومن کی روح قبض کرنے پر مقرر ہیں وہ آسانی سے اس کو قبض کرتے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ کافر کو وقت نزع ہی برزخ کا عذاب سامنے آجاتا ہے۔ اس سے گھبرا کر اس کی روح بدن میں چھپنا چاہتی ہے تو فرشتے اسے کھینچ کر نکالتے ہیں۔ جبکہ مومن کی روح کے سامنے عالم برزخ کی نعمتیں آتی ہیں تو اس کی روح ان کی طرف جانا چاہتی ہے۔ (معارف القرآن)

آیت نمبر (15 تا 26)

ترجمہ

هَلْ اَتٰىكَ	حَدِيْثُ مُوْسٰى ۘ﴿۱۵﴾	اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ
کیا پہنچی آپؐ کے پاس	موسیٰؑ کی بات	جب آواز دی انؑ کو ان کے رب نے

بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ	طُوًى ۚ﴿۱۶﴾	اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ	اِنَّهٗ طَغٰى ۖ﴿۱۷﴾
پاک کی ہوئی وادی میں	جو طوٰی (کہلاتی) ہے	(اور کہا کہ) آپؑ جائیں گے فرعون کی طرف	بیشک اس نے سرکشی کی

فَقُلْ	هَلْ لَّكَ اِلٰٓى	اَنْ تَزَكّٰى ۙ﴿۱۸﴾	وَاَهْدِيَكَ
پھر آپؐ کہیں	کیا تیرے لیے اس کی طرف (کوئی رجحان ہے)	کہ تو تزکیہ حاصل کرے	اور (اس طرف) کہ میں تیری رہنمائی کروں

اِلٰى رَبِّكَ	فَتَخْشٰى ۚ﴿۱۹﴾	فَاَرٰىهُ	الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۖ﴿۲۰﴾
تیرے رب کی طرف	نتیجتاً تو رعب محسوس کرے (اس کا)	تو انہوںؑ نے دکھائی اس (فرعون) کو	وہ سب سے بڑی نشانی

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۖ﴿۲۱﴾	ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۖ﴿۲۲﴾	فَحَشَرَ فَنَادٰى ۖ﴿۲۳﴾
پس اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی	پھر اس نے پیٹھ پھیری بھاگ دوڑ کرتے ہوئے	پھر اس نے اکٹھا کیا (سب کو) تو آواز دی

فَقَالَ	اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۖ﴿۲۴﴾	فَاَخَذَهُ اللّٰهُ
پھر اس نے کہا	میں تم لوگوں کا سب سے برتر پرورش کرنے والا ہوں	تو پکڑا اس کو اللہ نے

نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ۭ﴿۲۵﴾	اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ	لَعِبْرَةً	لِّمَنْ يَّخْشٰى ۧ﴿۲۶﴾
دنیا اور آخرت کے عبرتناک سزا میں	بیشک اس میں	یقیناً ایک عبرت ہے	اس کے لیے جو ڈرتا ہے (رب سے)

نوٹ:1 سابقہ آیات میں عذاب قیامت کی تصویر تھی۔اب یہ اس عذاب کی تاریخی شہادت کا حوالہ ہے جس سے رسولوں کو جھٹلانے والوں کو اس دنیا میں 6973 سابقہ پیش آیا ہے۔ اس کے لیے حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کا انتخاب فرمایا ہے جو سب سے زیادہ مشہور معروف شہادت ہے۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:2 حضرت موسیٰؑ کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ تم اور ہارون، دونوں بھائی اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے اور خدا سے ڈرے۔(طٰہٰ۔44)۔اس نرم کلام کا ایک نمونہ تو یہاں آیت۔18۔19۔میں دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مبلغ کو کسی بگڑے ہوئے آدمی کی ہدایت کے لیے کس حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنی چاہیے۔دوسرے نمونے سورۂ طٰہٰ۔آیت 49 تا 52، الشعراء۔23 تا 28 اور القصص۔37۔میں دیئے گئے ہیں۔یہ منجملہ ان آیات کے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکمت تبلیغ کی تعلیم دی ہے۔(تفہیم القرآن)

نوٹ:3 ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے ہی فرعون کے پاس نہیں بھیجے گئے تھے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ ان کی بعثت کا پہلا مقصد فرعون اور اس کی قوم کو راہ راست دکھانا تھا اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اگر وہ راہ راست قبول نہ کرے تو بنی اسرائیل کو (جو اس وقت کی مسلمان قوم تھے) اس کی غلامی سے چھڑا کر مصر سے نکال لائیں۔یہ بات ان آیات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کیوں کہ ان میں سرے سے بنی اسرائیل کی رہائی کا ذکر ہی نہیں ہے۔بلکہ موسیٰؑ کو فرعون کے سامنے صرف حق کی تبلیغ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اور ان مقامات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے جہاں موسیٰؑ نے اسلام کی تبلیغ بھی کی ہے اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ بھی فرمایا ہے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:4 فرعون کا رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ قرآن مجید میں کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے، مثلاً الشعراء۔29۔القصص۔38۔لیکن ان باتوں سے فرعون کا یہ مطلب نہ تھا، اور نہ ہی ہوسکتا تھا، کہ وہی کائنات کا خالق ہے۔یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر اور خود رب العالمین ہونے کا مدعی تھا۔یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ صرف اپنے آپ ہی کو مذہبی معنوں میں لوگوں کا معبود قرار دیتا تھا۔قرآن مجید ہی میں اس بات کی شہادت موجود ہے کہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، وہ خود دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا تھا۔چنانچہ اس کے اہل دربار نے ایک موقع پر اس کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو یہ آزادی دیتے چلے جائیں گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔الاعراف۔127۔پس درحقیقت وہ مذہبی معنی میں نہیں بلکہ سیاسی معنی میں اپنے آپ کو الٰہ اور رب اعلیٰ کہتا تھا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ اقتدار اعلیٰ کا مالک میں ہوں، میرے سوا کسی کو میری مملکت میں حکم چلانے کا حق نہیں ہے اور میرے اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جس کا فرمان یہاں جاری ہوسکتا ہو۔(تفہیم القرآن)

آیت نمبر (27 تا 46)

س	م	ك

(ن) سَمْكًا بلند کرنا۔اونچا اٹھانا۔

سَمْكٌ اسم ذات ہے۔چھت۔ہر اونچی چیز کا قد وقامت۔ابھار۔زیر مطالعہ آیت۔28۔

غ ط ش

6973

(س) غَطَشًا کمزور نظر والا ہونا۔

(افعال) اِغْطَاشًا تاریک کرنا۔ زیر مطالعہ آیت۔29۔

ذ ک ر

(ف) دَحْيًا کسی چیز کو پھیلانا۔ زیر مطالعہ آیت۔30۔

د ح ی

(ف) طَمًّا کسی کا کسی چیز کو ڈھانک لینا۔ کسی پر چھا جانا۔

طَامَّةٌ اسم الفاعل ہے۔ چھا جانے والی۔ آفت، زیر مطالعہ آیت۔34۔

ترکیب

(آیت۔27) بَنٰهَا میں فعل بَنٰی کی ضمیر مفعولی هَا۔ اَلسَّمَآءُ کے لیے ہے۔ (آیت۔28۔29) سَمْكَهَا۔ سَوّٰهَا۔ لَيْلَهَا۔ ضُحٰهَا۔ ان سب میں بھی هَا کی ضمیریں اَلسَّمَآءُ کے لیے ہیں۔ (آیت۔30) وَالْاَرْضَ کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ فعل بَنٰی کا مفعول ہے۔ بَعْدَ ذٰلِكَ میں ذٰلِكَ کا اشارہ اَلسَّمَآءُ کی طرف مانا جا سکتا ہے اور اَلْاَرْضَ کی طرف بھی۔ اگر اَلسَّمَآءُ کی طرف مانا جائے تو مطلب ہوگا آسمان بنانے کے بعد زمین بنائی۔ اور اگر اَلْاَرْضَ کی طرف مانا جائے تو مطلب ہوگا زمین بنانے کے بعد اس کو پھیلایا۔

(آیت۔31۔32) دَحٰهَا۔ مِنْهَا۔ مَآءَهَا۔ مَرْعٰهَا۔ اَرْسٰهَا۔ ان سب میں هَا کی ضمیریں اَلْاَرْضَ کے لیے ہیں۔ فعل اَرْسٰی دو مفعولوں کا تقاضہ کرتا ہے کس کو جمایا۔ کس میں جمایا۔ یہاں اَلْجِبَالَ فعل اَرْسٰی کا مفعول مقدم اول ہے اور اس کے ساتھ هَا کی ضمیر مفعولی مفعول ثانی ہے۔

(آیت۔34۔35۔) فَاِذَا جَآءَتِ میں اِذَا شرطیہ ہے، اس کا جواب شرط محذوف ہے، کہ جب اَلطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى آئے گی تو سابقہ آیات میں آسمان و زمین کی بناوٹ، سب درہم برہم ہو جائے گی۔ يَوْمَ اسی محذوف جواب شرط کا ظرف ہے۔

(آیت۔39) فَاِنَّ کا اسم اَلْجَحِيْمَ ہے اور اَلْمَاْوٰى اس کی خبر معرفہ ہے اس لیے هِيَ ضمیر فاصل آئی ہے جس سے حصر کا مفہوم پیدا ہوا ہے۔ (آیت۔43) فِيْمَ اصل میں فِيْ مَا ہے اور یہ مَا استفہامیہ ہے۔

ترجمہ

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ	خَلْقًا	اَمِ السَّمَآءُ ؕ	بَنٰهَا ﴿۲۷﴾
کیا تم لوگ زیادہ شدید ہو	بلحاظ تخلیق کرنے کے	یا یہ آسمان	اسی نے بنایا جس کو

رَفَعَ سَمْكَهَا	فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾	وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا
اور اس نے بلند کیا اس کی اُٹھان کو	پھر اس نے ہموار کیا اس کو	اور اس نے تاریک کیا اس کی رات کو

وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ﴿۲۹﴾	وَالْاَرْضَ	بَعْدَ ذٰلِكَ	دَحٰهَا ؕ ﴿۳۰﴾
اور اس نے نکالا اس کی روشنی کو	اور (اس نے بنایا) زمین کو	اس کے بعد	اس نے پھیلایا اس کو

اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا	وَمَرۡعٰىهَا ۪ۙ﴿۳۱﴾	وَالۡجِبَالَ اَرۡسٰىهَا ۙ﴿۳۲﴾	مَتَاعًا 6973
اس نے نکالا اس سے اس کا پانی	اور اس کا چارا	اور پہاڑوں کو اس نے جمایا اس میں	برتنے کا سامان ہوتے ہوئے

لَّكُمۡ وَلِاَنۡعَامِكُمۡ ؕ﴿۳۳﴾	فَاِذَا جَآءَتِ	الطَّآمَّةُ الۡكُبۡرٰى ۖ﴿۳۴﴾
تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے	پھر جب آئے گی	وہ سب سے بڑی چھا جانے والی (قیامت تو یہ سب درہم برہم ہو جائے گا)

يَوۡمَ يَتَذَكَّرُ الۡاِنۡسَانُ	مَا سَعٰى ۙ﴿۳۵﴾	وَبُرِّزَتِ الۡجَحِيۡمُ
اس دن یاد کرے گا انسان	اس کو جو اس نے دوڑ دھوپ کی	اور ظاہر کی جائے گی دوزخ

لِمَنۡ يَّرٰى ﴿۳۶﴾	فَاَمَّا مَنۡ طَغٰى ۙ﴿۳۷﴾	وَاٰثَرَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا ۙ﴿۳۸﴾
اس کے لیے جو دیکھے گا (یعنی دوزخی کے لیے)	تو وہ جو ہے جس نے سرکشی کی	اور اس نے ترجیح دی دنیوی زندگی کو

فَاِنَّ الۡجَحِيۡمَ	هِىَ الۡمَاۡوٰى ؕ﴿۳۹﴾	وَاَمَّا مَنۡ خَافَ	مَقَامَ رَبِّهٖ
تو (اس کے لیے) یقیناً دوزخ	ہی ٹھکانہ ہے	اور وہ جو ہے جس نے خوف کیا	اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کے وقت کا

وَنَهَى النَّفۡسَ	عَنِ الۡهَوٰى ۙ﴿۴۰﴾	فَاِنَّ الۡجَنَّةَ	هِىَ الۡمَاۡوٰى ؕ﴿۴۱﴾
اور اس نے روکا (اپنے) جی کو	(من کی) چاہت سے	تو (اس کے لیے) یقیناً جنت	ہی ٹھکانہ ہے

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ	عَنِ السَّاعَةِ	اَيَّانَ مُرۡسٰىهَا ؕ﴿۴۲﴾	فِيۡمَ اَنۡتَ
یہ لوگ پوچھتے ہیں آپؐ سے	اُس گھڑی (قیامت) کے بارے میں	کب ہے اس کے قائم ہونے کا وقت	اس میں کیا ہے آپ کو

مِنۡ ذِكۡرٰىهَا ؕ﴿۴۳﴾	اِلٰى رَبِّكَ	مُنۡتَهٰىهَا ؕ﴿۴۴﴾	اِنَّمَاۤ اَنۡتَ
اس کے ذکر میں سے	آپؐ کے رب کی طرف ہیں	اس کے ٹھہرنے کا وقت ہے	آپ تو بس

مُنۡذِرُ مَنۡ	يَّخۡشٰىهَا ؕ﴿۴۵﴾	كَاَنَّهُمۡ
اس کو خبردار کرنے والے ہیں جو	ڈرتا ہے اس سے	(ایسا لگے گا) جیسے کہ وہ لوگ

يَوۡمَ يَرَوۡنَهَا	لَمۡ يَلۡبَثُوۡۤا	اِلَّا عَشِيَّةً اَوۡ ضُحٰهَا ؕ﴿۴۶﴾
جس دن وہ دیکھیں گے اس کو،	ٹھہرے ہی نہیں	سوائے ایک شام کے یا اس کی صبح کے

نوٹ: 1

سورۃ البقرہ کی آیت۔29۔اور حٰمٓ السجدہ کی آیات۔9 تا 12۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ سات آسمان زمین کی پیدائش کے بعد بنائے گئے۔ اور النّٰزِعٰت کی آیت۔30۔ سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین آسمان کے بعد بچھائی گئی۔ اس کے جواب کئی طرح دیئے گئے ہیں۔ احقر کو ابوحیان کی تقریر پسند ہے یعنی ضروری نہیں کہ سابقہ آیات میں ثُمَّ اور زیر مطالعہ آیت میں بَعۡدَ ذٰلِكَ تراخیٔ زمان (زمانے کے رخ یعنی ترتیب) کے لیے ہو۔ ممکن ہے ان الفاظ سے تراخی فی الاخبار (خبروں کی ترتیب) یا تراخیٔ رُتبی (رتبے کی ترتیب) مراد لیں جیسے قرآن کی دوسری جگہوں میں یہ ہی معنی مراد لیے گئے ہیں۔ بہرحال قرآن کریم میں ترتیب زمانی کی ترتیب نہیں ہے۔ ہاں نعمت کے تذکرہ میں زمین کا اور

عظمت وقدرت کے تذکرہ میں آسمان کا ذکر مقدم رکھا ہے۔(ترجمہ شیخ الہندؒ۔تفسیر آیات حٰم السجدہ)

امام راغب اصفہانیؒ نے وطی (مادہ ''دح ی'') کے معنے کسی چیز کو اس کے مقر (جائے قرار) سے ہٹا دینے کے لکھے ہیں۔تو شاید اس لفظ میں ادھر اشارہ ہو جو آج کل کی تخلیق ہے کہ زمین اصل میں کسی بڑے جرم فلکی کا ایک حصہ ہے جو اس سے الگ ہو گیا۔واللہ اعلم۔(ترجمہ شیخ الہندؒ۔تفسیر آیت۔النّٰزعٰت)

اس کے بعد زمین کو بچھانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آسمان کے بعد زمین کو پیدا کیا۔بلکہ یہ ایسا ہی طرز بیان ہے جس میں مقصود ایک بات کے بعد دوسری بات کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے، اگرچہ دونوں ایک ساتھ پائی جاتی ہوں۔اس طرزِ بیان کی متعدد مثالیں خود قرآن میں موجود ہیں۔مثلاً سورۃ القلم۔آیت۔13 میں فرمایا عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِکَ زَنِیْمٍ (جفا کار ہے اس کے بعد بداصل ہے)۔اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے وہ جفا کار بنا اس کے بعد بداصل بنا۔بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جفا کار ہے اور اس پر مزید یہ کہ بداصل بھی ہے۔(تفہیم القرآن)۔قرآن میں ترتیب زمانی کے ضمن میں آیت۔2۔40،نوٹ۔1(۳) کو بھی دوبارہ دیکھ لیں تو بات مزید واضح ہو جائے گی (مرتب)

نوٹ:2

ان آیات میں (یعنی آیت۔27 تا 33 میں) قیامت اور حیات بعد الموت کے لیے دو حیثیتوں سے استدلال کیا گیا ہے۔ایک یہ کہ اس خدا کی قدرت سے حیات بعد الموت کا برپا کرنا ہرگز بعید نہیں ہے جس نے یہ وسیع اور عظیم کائنات اس حیرت انگیز توازن کے ساتھ اور یہ زمین اس سروسامان کے ساتھ بنائی ہے۔دوسرے یہ کہ اللہ کے کمال حکمت کے جو آثار اس کائنات اور اس زمین میں صریحاً نظر آ رہے ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں کوئی کام بے مقصد نہیں ہو رہا ہے بلکہ کوئی بہت سوچا سمجھا منصوبہ اس کے پیچھے کارفرما ہے۔یہ رات اور دن کا باقاعدگی سے آنا اس بات پر گواہ ہے کہ زمین کو آباد کرنے کے لیے یہ نظم کمال درجہ دانائی سے قائم کیا گیا ہے۔خود اسی زمین میں وہ خطے بھی موجود ہیں جہاں 24 گھنٹے کے اندر رات اور دن کا الٹ پھیر ہو جاتا ہے۔اور وہ خطے بھی موجود ہیں جہاں بہت لمبے دن اور بہت لمبی راتیں ہوتی ہیں۔زمین کی آبادی کا بہت بڑا حصہ پہلی قسم کے خطوں میں اور جہاں رات اور دن جتنے زیادہ لمبے ہوتے جاتے ہیں، وہاں زندگی زیادہ سے زیادہ دشوار اور آبادی کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے۔یہاں تک کہ چھ مہینے کے دن اور چھ مہینے کی راتیں رکھنے والے علاقے آبادی کے بالکل قابل نہیں ہیں۔یہ دونوں نمونے اسی زمین پر دکھا کر اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی شہادت پیش کر دی ہے کہ رات اور دن کی آمد و رفت کا یہ باقاعدہ انتظام کچھ اتفاقاً نہیں ہو گیا ہے، بلکہ یہ زمین کو آبادی کے قابل بنانے کے لیے بڑی حکمت کے ساتھ ٹھیک ایک اندازے کے مطابق کیا گیا ہے۔

اسی طرح زمین کو اس طرح بچھانا کہ وہ سکونت کے قابل بن سکے۔اس میں وہ پانی پیدا کرنا جو انسان اور حیوان کے لیے پینے کے قابل اور نباتات کے لیے روئیدگی کے قابل ہو۔یہ سارے کام اس بات کی صریح علامت ہیں کہ یہ بے مقصد کام نہیں ہیں۔اب یہ ہر صاحب عقل کے سوچنے کی بات ہے کہ آخرت کا ہونا حکمت کا تقاضا ہے یا نہ ہونا؟ کیوں کہ اس سے بڑی کوئی بے مقصد بات نہیں ہو سکتی کہ اس زمین میں انسان کو تصرف کے وسیع اختیارات دے کر اسے چھوڑ دیا جائے اور کبھی اس کا محاسبہ نہ کیا جائے۔

نوٹ:3

آیات۔37 تا 41۔میں اہل دوزخ اور اہل جنت کی خاص خاص علامات کا بیان ہے جس سے ایک انسان دنیا ہی میں یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس ضابطہ کے مطابق میرا ٹھکانہ دوزخ میں ہے یا جنت میں۔ضابطہ اس لیے کہا گیا ہے کہ کسی کی شفاعت سے یا بلا واسطہ اللہ کی رحمت سے کسی جہنمی کو وہاں سے نکال کے جنت میں پہنچا دینا ایک استثنائی حکم ہے اور جنت یا دوزخ میں ٹھکانے کا اصل ضابطہ وہی ہے جو ان آیات میں بیان فرمایا ہے۔

پہلے اہل جہنم کی خاص علامات بیان کی گئیں، وہ دو ہیں۔ اول طغیان یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پابندی کرنے کی بجائے سرکشی کرنا۔ دوم دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا۔ یعنی جب ایسا کوئی کام سامنے آئے کہ اس کے اختیار کرنے سے دنیا میں تو آرام یا لذت ملتی ہے مگر آخرت میں اس پر عذاب مقرر ہے، اس وقت وہ دنیا کی لذت کو ترجیح دے کر آخرت کی فکر کو نظر انداز کر دے۔ جو شخص دنیا میں ان دو بلاؤں میں مبتلا ہے اس کے لیے فرمادیا کہ جہنم ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔ اس کے بعد اہل جنت کی اسی طرح دو علامتیں بتائی ہیں۔ اول یہ کہ جس شخص کو دنیا میں اپنے ہر عمل ہر کام کے وقت یہ خوف لگا رہے کہ مجھے ایک روز اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر ان اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ دوم یہ کہ جس نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا اور ناجائز خواہشوں سے اس کو روک دیا۔ جس نے دنیا میں یہ دو وصف حاصل کر لیے قرآن کریم نے اس کو یہ خوشخبری دی ہے کہ جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ عبس (80)

آیت نمبر (1 تا 23)

ترکیب

(آیات۔13 تا 16) فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ سے پہلے فعل کُتِبَ محذوف ہے۔ اس کا نائب فاعل اس میں شامل ھُوَ کی ضمیر ہے جو تَذۡکِرَۃٌ کے لیے ہے۔ واضح رہے کہ تَذۡکِرَۃٌ مصدر ہے جو مذکر مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے اس سے پہلے اِنَّھَا میں اس کے لیے ھَا کی مونث ضمیر آئی ہے اور اگلی آیت میں ذَکَرَہٗ میں اسی کے لیے ہٗ کی مذکر ضمیر آئی ہے۔ صُحُفٍ جمع مکسر ہے، اس لیے اس کی صفت مُکَرَّمَۃٍ واحد مونث آئی ہے۔ آگے مَرۡفُوۡعَۃٍ اور مُطَہَّرَۃٍ بھی صُحُفٍ کی خصوصیات ہیں۔ سَفَرَۃٍ نکرہ مخصوصہ ہے۔ جبکہ کِرَامٍ اور بَرَرَۃٍ اس کی خصوصیات ہیں۔ (آیت۔23)۔ اس آیت کو گزشتہ آیت سے بھی متعلق مانا جاسکتا ہے اور اگلی آیت سے بھی اگر اس کو گزشتہ آیت سے متعلق مانا جائے تو یَقۡضِ میں شامل ھُوَ کی ضمیر فاعلی کو شَاءَ کے فاعل یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے مانا جائے گا اور اَمَرَہٗ میں ہٗ کی ضمیر کو مَا کی ضمیر عائد مانا جائے گا۔ ابن کثیرؒ نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ (منقول از ترجمہ شیخ الہندؒ) اگر اس کو اگلی آیت سے متعلق مانا جائے تو پھر یَقۡضِ کی ضمیر فاعلی آیت۔17۔ میں اَلۡاِنۡسَانُ کے لیے مانی جائے گی اور اَمَرَہٗ کی ضمیر مفعولی بھی اُسی اَلۡاِنۡسَانُ کے لیے ہوگی۔

ترجمہ

عَبَسَ وَتَوَلّٰۤی ۙ﴿۱﴾	اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ﴿۲﴾	وَمَا یُدۡرِیۡکَ
انہوں ؐ نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا	(اس لیے) کہ آئے ان ؐ کے پاس وہ نابینا ؓ	اور آپ ؐ کو کیا خبر

لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ۙ﴿۳﴾	اَوۡ یَذَّکَّرُ	فَتَنۡفَعَہُ	الذِّکۡرٰی ؕ﴿۴﴾
شاید کہ وہ ؓ پاکیزگی حاصل کرتے	یا وہ یاددہانی حاصل کرتے	نتیجتاً نفع دیتی ان کو	وہ عظیم نصیحت (یعنی قرآن)

اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی ۙ﴿۵﴾	فَاَنۡتَ لَهٗ	تَصَدّٰی ؕ﴿۶﴾	وَمَا عَلَیۡكَ
وہ جو ہے جس نے بے پرواہی اختیار کی	تو آپؐ اس کے لیے ہی	متوجہ ہوئے	اور آپؐ پر نہیں ہے (کوئی الزام)

اَلَّا یَزَّكّٰی ؕ﴿۷﴾	وَ اَمَّا مَنۡ	جَآءَكَ یَسۡعٰی ۙ﴿۸﴾	وَهُوَ یَخۡشٰی ۙ﴿۹﴾
کہ وہ پاکیزگی حاصل نہیں کرتا	اور وہ جو ہے جو	آیا آپؐ کے پاس بھاگتا دوڑتا	اس حال میں کہ وہ ڈرتا ہے

فَاَنۡتَ عَنۡهُ تَلَهّٰی ۚ﴿۱۰﴾	كَلَّاۤ اِنَّهَا	تَذۡكِرَةٌ ۚ﴿۱۱﴾	فَمَنۡ شَآءَ
تو آپؐ نے اس سے غفلت برتی	ہرگز نہیں! بیشک یہ (قرآن)	ایک یاددہانی ہے	پس جو چاہے

ذَكَرَهٗ ؕ﴿۱۲﴾	فِیۡ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ﴿۱۳﴾	مَّرۡفُوۡعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ﴿۱۴﴾
وہ یاد رکھے اس کو	(اس کو لکھا گیا) معزز کیے ہوئے ایسے صحیفوں میں جو	بلندی دیئے ہوئے پاکیزگی دیئے ہوئے ہیں

بِاَیۡدِیۡ سَفَرَةٍ ۙ﴿۱۵﴾	كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ؕ﴿۱۶﴾	قُتِلَ الۡاِنۡسَانُ	مَاۤ اَكۡفَرَهٗ ؕ﴿۱۷﴾
کچھ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں سے جو	بزرگی والے نیکی کرنے والے ہیں	مارا جائے انسان	کس قدر ناشکرا ہے وہ

مِنۡ اَیِّ شَیۡءٍ	خَلَقَهٗ ؕ﴿۱۸﴾	مِنۡ نُّطۡفَةٍ ؕ	خَلَقَهٗ	فَقَدَّرَهٗ ۙ﴿۱۹﴾
(سوچو تو) کس چیز سے	اس نے پیدا کیا اس کو	(پانی کی) ایک بوند سے	اس نے تخلیق کی اس کی	پھر اس نے تقدیر مقرر کی اس کی

ثُمَّ السَّبِیۡلَ	یَسَّرَهٗ ۙ﴿۲۰﴾	ثُمَّ اَمَاتَهٗ	فَاَقۡبَرَهٗ ۙ﴿۲۱﴾	ثُمَّ اِذَا شَآءَ
پھر راہ کو	اس نے آسان کیا اس کے لیے	پھر اس نے موت دی اس کو	تو اس نے دفن کرایا اس کو	پھر جب وہ چاہے گا

اَنۡشَرَهٗ ؕ﴿۲۲﴾	كَلَّا	لَمَّا یَقۡضِ	مَاۤ	اَمَرَهٗ ؕ﴿۲۳﴾
تو وہ دوبارہ زندہ کرے گا اس کو	ہرگز نہیں	ابھی تک اس نے پورا نہیں کیا	اس کو	جس کا اس نے حکم دیا اُسے

نوٹ: 1

عَبَسَ کا فاعل یہاں مذکور نہیں ہے لیکن آگے کی آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ فاعل نبی ﷺ ہیں۔ اَعۡمٰی سے اشارہ یہاں عبداللہ بن ام مکتومؓ کی طرف ہے۔ یہ ایک نابینا صحابی تھے۔ ایک دن نبی ﷺ قریش کے لیڈروں سے باتیں کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تھا۔ اسی اثنا میں عبداللہ بن ام مکتومؓ تشریف لائے اور موقع کی نزاکت کا اندازہ نہ کر سکنے کے باعث وہ بھی مجلس میں پہنچ گئے۔ ان کا یہ بے موقع آ جانا حضور ﷺ کو ناگوار گزرا۔ اسی واقعہ کو جو اتفاق سے پیش آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو یہ تعلیم دینے کا ذریعہ بنا لیا کہ آپ ﷺ اپنی توجہ کا اصل مرکز ان صحابہؓ کو بنائیں جو اپنی اصلاح اور تربیت کی طلب میں آپ ﷺ کی مجلس میں آتے ہیں اور ان لوگوں کے درپے زیادہ نہ ہوں جو بے نیاز ہیں۔ (تدبر قرآن)

اس موقع میں یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو کام بیک وقت آ گئے تھے۔ ایک مسلمان کی تعلیم اور اس کی دلجوئی اور دوسرے غیر مسلموں کی ہدایت کے لیے ان کی طرف توجہ۔ قرآن کریم کے اس ارشاد نے یہ واضح کر دیا کہ پہلا کام دوسرے کام پر مقدم ہے۔ دوسرے کام کی وجہ سے پہلے کام میں تاخیر کرنا یا خلل ڈالنا درست نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اصلاح کی فکر، غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کی فکر سے اہم اور مقدم ہے۔ اس میں ایسے علماء کے لیے ایک اہم ہدایت ہے جو غیر مسلموں کو اسلام سے

مانوس کرنے کی خاطر بعض ایسے کام کر بیٹھتے ہیں جن سے مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات یا شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کو اس قرآنی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کی اصلاح کو مقدم رکھنا چاہیے۔ (معارف القرآن)

نوٹ:2

آیت۔15۔ میں سَفَرَةٍ کا لفظ سَافِرٌ کی جمع بھی ہوسکتا ہے جس کے معنی کاتب کے ہیں۔ اس صورت میں اس سے مراد فرشتے، انبیاءؑ اور ان کی وحی لکھنے والے حضرات ہوں گے۔ اور یہ لفظ سَفِیْرٌ بمعنی قاصد کی جمع بھی ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں رسل ملائکہ، انبیاءؑ اور وحی کی کتابت کرنے والے صحابہؓ کے ساتھ علماء اُمت بھی اس میں داخل ہوں گے، کیونکہ وہ بھی رسول اللہ ﷺ اور امت کے درمیان سفیر اور قاصد ہیں۔ (معارف القرآن)

نوٹ:3

آیت۔19۔ میں فَقَدَّرَهٗ کا مطلب یہ ہے کہ انسان ابھی ماں کے پیٹ میں بن رہا ہوتا ہے تو اس کے تقدیر طے کر دی جاتی ہے۔ اس کی جنس کیا ہوگی۔ اس کا رنگ، قد، جسامت وغیرہ کیسی ہوگی۔ اس کی شکل وصورت اور آواز کیسی ہوگی۔ اس کے جسم کی طاقت اور ذہنی صلاحیتیں کیا ہوں گی۔ کس سرزمین، کس خاندان اور کس ماحول میں یہ پیدا ہوگا، پرورش اور تربیت پائے گا۔ اور کتنا وقت اسے زمین میں کام کرنے کے لیے دیا جائے گا۔ اس تقدیر سے یہ بال برابر بھی ہٹ نہیں سکتا اور نہ اس میں ذرہ برابر ردوبدل کرسکتا ہے۔ (تفہیم القرآن)

تقدیر کی مذکورہ وضاحت کے حوالے سے یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ تقدیر کے اٹل ہونے کا تصور اس پہلو سے درست ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی انسان کے دائرہ اختیار کے باہر ہے۔ لیکن یہ تصور درست نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی تقدیر میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا (اعوذ باللہ من ذالک) یا نہیں کرتا۔ وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے، فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے۔ عام قاعدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کی جو تقدیر مقرر کر دی ہے، اس میں وہ تبدیلی نہیں کرتا۔ لیکن جب چاہتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے اور جتنی چاہتا ہے تبدیلی کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تقدیر کو کوئی چیز نہیں بدل سکتی سوائے دعا کے اسی حوالے سے وہ احادیث بھی سمجھی جاسکتی ہیں جن میں عمر کے کم ہوجانے یا زیادہ ہوجانے کا ذکر ہے۔ (مرتب)

نوٹ:4

آیت۔20۔ میں راستہ کو آسان کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہ تمام اسباب اور وسائل فراہم کیے جن سے یہ کام لے سکے۔ ورنہ اس کے جسم اور ذہن کی ساری قوتیں بے کار ثابت ہوتیں اگر خالق نے ان کو استعمال کرنے کے لیے زمین پر یہ سروسامان مہیا نہ کر دیا ہوتا اور یہ امکانات پیدا نہ کر دیئے ہوتے۔ مزید برآں خالق نے اس کو یہ موقع بھی دیا کہ اپنے لیے خیر یا شر، شکر یا کفر، طاعت یا نافرمانی کی جو راہ بھی اختیار کرنا چاہے کر سکے۔ اس نے دونوں راستے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیئے اور ہر راہ اس کے لیے ہموار کر دی کہ جس پر بھی چلنا چاہے چلے۔ (تفہیم القرآن)

خیر کی راہوں میں انسان کی طبعیت کو پسند نہ آنے والی چیزیں اور شر کی راہوں میں من بھاتی چیزیں تو اظہر من الشمس ہیں۔ اور ہر انسان ان راہوں کی اس ظاہری حقیقت کو خوب جانتا ہے۔ لیکن ان راہوں کا انجام اتنا ظاہر نہیں ہے اور ظاہر بین نگاہوں کی پہنچ سے باہر ہے۔ دونوں راہوں کے باطنی حقائق اور ان کے انجام کو ظاہر کرنے اور انسان کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل اور کتب کا سلسلہ قائم کیا جو نبی ﷺ کی بعثت اور نزولِ قرآن سے اپنے تکمیلی مرحلہ تک پہنچ گیا۔ اب انسان کی اُخروی کامیابی کا راز اس میں ہے کہ وہ اپنی طبعیت اور اپنے موڈ کو لگام دے کر، انجام پر نظر رکھتے ہوئے زندگی کے سفر میں پیش آنے والی متبادل راہوں کا انتخاب کرتے ہوئے اپنا سفر مکمل کرے۔ اس انتخاب میں اللہ تعالیٰ کوئی مداخلت نہیں کرتا اور اس نے انسان کو اس ضمن میں مکمل خود مختاری دی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقدیر کی مجبوری

کے باوجود انسان جوابدہ ہے اور جزا وسزا کا مستحق ہے۔ یہ نکتہ جن لوگوں کے سمجھ میں نہیں آتا، وہ پھر چیخ اٹھتے ہیں۔ 1973

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

یہ درست ہے کہ انسان اپنی تقدیر کے فریم ورک کے اندر زندگی کا سفر کرنے کا پابند ہے اور اپنے فریم ورک میں بال برابر تبدیلی کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ اس کی مجبوری کا دائرہ ہے۔ اور اس فریم ورک کے اندر سفر کرتے ہوئے متبادل راہوں کے انتخاب کی اسے مکمل آزادی ہے۔ یہ اس کی خود مختاری کا دائرہ ہے۔ (مرتب)

آیت نمبر (24 تا 42)

ق ض ب

(ض) قَضْبًا لمبے اور پھیلے ہوئے درخت اگنا۔ کاٹنا۔
قَضْبٌ ہر وہ درخت جس کی شاخیں لمبی ہو کر لٹک جائیں۔ سبزی ترکاری۔ زیر مطالعہ آیت۔ 28۔

ء ب ب

(ض) اَبًّا کسی کام کے لیے تیار ہونا۔
اَبٌّ ایسی گھاس جو کٹنے کے لیے تیار ہو۔ مویشی کا چارہ۔ زیر مطالعہ آیت۔ 31۔

ص خ خ

(ن) صَخًّا کرخت آواز کا کان کو بہرا کر دینا۔
صَاخَّةٌ بہرا کر دینے والی چیخ۔ زیر مطالعہ۔ 33۔

ترجمہ

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ	اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾	اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾
پس چاہیے کہ دیکھے انسان	اپنے کھانے کی طرف	بیشک ہم نے ہی برسایا پانی جیسے برساتے ہیں

ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾	فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾	وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾
پھر ہم نے پھاڑا، زمین کو جیسے پھاڑتے ہیں	تو ہم نے اگائے اس میں دانے (اناج)	اور انگور اور ترکاری

وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾	وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾	وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾
اور زیتون اور کھجوریں	اور باغات موٹے تنے والے درختوں کے	اور میوہ اور مویشی کا چارہ

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ ﴿۳۲﴾	فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾
برتنے کا سامان ہوتے ہوئے تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے	پھر جب آئے گی وہ کان پھاڑنے والی چیخ (نفخۂ صور)

6973

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ	مِنْ اَخِيْهِ ۙ﴿۳۴﴾	وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۙ﴿۳۵﴾	وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ؕ﴿۳۶﴾
جس دن بھاگیں گے سارے مرد	اپنے بھائی سے	اور اپنی ماں سے اور اپنے والد سے	اور اپنی ساتھ والی (بیوی) سے اور اپنے بیٹوں سے

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ	يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ	يُّغْنِيْهِ ؕ﴿۳۷﴾	وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۙ﴿۳۸﴾
ہر مرد کے لیے ان میں سے	اُس دن ایک ایسی مصروفیات (فکر) ہوگی جو	کافی ہوگی اس کو	کچھ چہرے اس دن روشن ہونے والے ہیں

ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۚ﴿۳۹﴾	وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ	عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۙ﴿۴۰﴾
ہنسنے والے ہیں خوشی منانے والے ہیں	اور کچھ چہرے ہوں گے اس دن	جن پر گرد و غبار ہوگا

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ؕ﴿۴۱﴾	اُولٰٓئِكَ	هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾
چھا جائے گی ان پر سیاہی	یہ لوگ	ہی ناشکری کرنے والے نافرمانی کرنے والے ہیں

نوٹ: 1

انسان اپنی غذا کے مسئلہ پر ذرا غور کی نگاہ ڈالے جس پر اس کی زندگی کا انحصار ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اس کو پیدا کرتا ہے، پھر ضروریات کی نوعیت کے لحاظ سے کتنی گوناگوں شکلوں میں اس کو پھیلا دیتا ہے۔ اگر وہ اس پر غور کرے گا اور اس کی عقل میں فتور نہیں ہے تو نہایت آسانی سے یہ نکتہ اس کی سمجھ میں آجائے گا کہ ربوبیت کا یہ وسیع نظام تقاضہ کرتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہ ہو اور اس سے پوچھا جائے کہ ان نعمتوں کا حق ادا کیا یا نہیں۔ (تدبر قرآن)

نوٹ: 2

آیت۔26۔کا مطلب یہ ہے کہ ایک گھاس کے تنکے کی کیا طاقت تھی کہ وہ زمین کو چیر کر باہر نکل آتا۔ یہ قدرت کا ہاتھ ہے جو زمین کو پھاڑ کر اس سے طرح طرح کے غلے، پھل، سبزے، ترکاریاں وغیرہ نکالتا ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

زمین کو پھاڑنے سے مراد اس کو اس طرح پھاڑنا ہے کہ جو بیج یا گٹھلیاں وغیرہ انسان اس کے اندر بوئے یا جو کسی اور طریقے سے زمین کے اندر پہنچ جائیں، وہ اپنی کونپلیں نکال سکیں۔ انسان اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ وہ زمین میں ہل چلاتا ہے اور جو بیج خدا نے پیدا کر دیئے ہیں، انہیں وہ زمین میں اتار دیتا ہے۔ اس کے سوا سب کچھ خدا کا کام ہے۔ اسی نے بے شمار قسم کی نباتات کے بیج پیدا کیے ہیں۔ اسی نے ان بیجوں میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ زمین میں پہنچ کر وہ پھوٹیں اور ہر بیج سے اس کی جنس کے نباتات اُگے۔ اور اسی نے زمین میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ پانی سے مل کر وہ ان بیجوں کو کھولے اور ہر جنس کی نباتات کے لیے اس کے مناسب حال غذا بہم پہنچا کر اسے نشوونما دے خدا نے یہ انتظام نہ کیا ہوتا تو کیا کوئی انسان کوئی بھی غذا پا سکتا تھا۔ (تفہیم القرآن)

6973

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ التکویر (81)

آیت نمبر (1 تا 14)

ك د ر

(ن) كَدْرًا گدلا ہونا، میلا ہونا۔

(انفعال) اِنْكِدَارًا کسی چیز کا بکھر کر بجھ جانا۔ بے نور ہو جانا۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

و ح ش

(ض) وَحْشًا انسیت نہ پانا۔ وحشت محسوس کرنا۔

وَحْشٌ ج وُحُوْشٌ۔ وہ جانور جو انسان سے مانوس نہ ہو۔ وحشی جانور۔ زیر مطالعہ آیت۔5۔

و ء د

(ض) وَأْدًا کسی کو زندہ دفن کرنا۔

مَوْءُوْدَةٌ اسم المفعول کے مونث مفعولۃ کا وزن ہے۔ مَوْءُوْدَةٌ کو مَوْءُدَةٌ لکھتے ہیں۔ زندہ دفن کی ہوئی۔ زیر مطالعہ آیت۔8۔

ك ش ط

(ض) كَشْطًا کسی چیز سے اس کا ڈھکنا اتارنا۔ کسی کی کھال اتارنا۔ آیت۔11۔

ترکیب

آیات۔1 تا 13۔ میں تمام جملے اِذَا سے شروع ہو رہے ہیں اس لیے ان میں افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا اور اِذَا کی وجہ سے یہ تمام جملے شرط ہیں، جبکہ آیت۔14۔ میں عَلِمَتْ نَفْسٌ جواب شرط ہے اس لیے عَلِمَتْ (ماضی) کا ترجمہ بھی مستقبل میں ہوگا۔ (آیت۔7) نُفُوْسٌ جمع ہے نَفَسٌ کی جس کے معنی ہیں، ''سانس۔'' زندگی کا مدار سانس پر ہے اس لیے یہ جان کے لیے بھی آتا ہی اور جان والے یعنی شخص کے لیے بھی آتا ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت کے دو طرح ترجمے کیے گئے ہیں۔ اول یہ کہ جانوں کو ان کے جسموں کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا۔ دوم یہ کہ ہم خیال اور ایک جیسے عمل کرنے والے اشخاص کو ایک ساتھ جوڑ دیا جائے گا۔ ترجمہ میں ہم پہلی رائے کو ترجیح دیں گے۔ کیونکہ نَفَسٌ سے اگر جان مراد ہو تو یہ لفظ مؤنث اور اگر شخص مراد ہو تو یہ مذکر استعمال ہوتا ہے۔ اور یہاں زُوِّجَتْ مؤنث کا صیغہ آیا ہے اس لیے پہلی رائے کو ترجیح دی گئی ہے۔

ترجمہ

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱	وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲	وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝۳
جب سورج لپیٹ دیا جائے گا	اور جب تارے بکھر کر بے نور ہو جائیں گے	اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ﴿۴﴾	وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ﴿۵﴾ 6973
اور جب حاملہ اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی	اور جب وحشی جانور اکٹھا کیے جائیں گے
وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴿۶﴾	وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴿۷﴾
اور جب سمندر بھڑکائے جائیں گے	اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑی جائیں گی
وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ﴿۸﴾	بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴿۹﴾
اور جب زندہ دفن کی ہوئی سے پوچھا جائے گا	کس گناہ کے سبب سے وہ قتل کی گئی
وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿۱۰﴾	وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴿۱۱﴾
اور جب اوراق (اعمال نامے) کھولے جائیں گے	اور جب آسمان سے پردہ اتار لیا جائے گا

وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ﴿۱۲﴾	وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿۱۳﴾	عَلِمَتْ نَفْسٌ	مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾
اور جب دوزخ بھڑکائی جائے گی	اور جب جنت نزدیک لائی جائے گی	تو جان لے گی (ہر) ایک جان	اس کو جو اس نے حاضر کیا

نوٹ:1 پچھلی دونوں سورتوں، النّٰزعت اور عبس میں جس حولِ قیامت سے ڈرایا گیا ہے، اس سورہ میں اسی حول قیامت کی پوری تصویر ہے۔ (تدبر قرآن)۔ پہلی آیت میں کُوِّرَتْ کا لفظ سورج کو بے نور کر دیئے جانے کے لیے ایک بے نظیر استعارہ ہے۔ عربی زبان میں تَکْوِیْر کے معنی لپیٹنے کے ہیں۔ سر پر امامہ (صافہ) باندھنے کے لیے تکویر العمامہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ کیونکہ عمامہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور پھر سر کے گرد اسے لپیٹا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس روشنی کو جو سورج سے نکل کر سارے عالم میں پھیلی ہوئی ہے، عمامہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز یہ پھیلا ہوا عمامہ سورج پر لپیٹ دیا جائے گا یعنی اس کی روشنی کا پھیلنا بند ہو جائے گا۔ (تفہیم القرآن)۔ ظاہر ہے کہ جب سورج کی بساط ہی لپیٹ دی جائے گی تو سارا عالم تاریک ہو جائے گا۔ اگرچہ سورج کے چھپنے کا مشاہدہ ہمیں آج بھی ہر روز ہوتا رہتا ہے لیکن اس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ یہ صورت صرف اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ہم اس سے اُوٹ میں ہو جاتے ہیں۔ البتہ جب قیامت برپا ہو گی تو سورج کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس تاریکی کا جب کہ سرے سے سورج ہی تاریک ہو جائے گا۔ (تدبر قرآن)۔

دوسری آیت میں بتایا ہے کہ باہمی کشش ثقل کی وہ بندش جس نے اجرامِ فلکی کو اپنے اپنے مدار پر باندھ رکھا ہے وہ کھل جائے گی اور سب تارے اور سیارے کائنات میں منتشر ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اِنْکِدَار میں کدورت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف منتشر ہی نہیں ہوں گے بلکہ تاریک بھی ہو جائیں گے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2 آیت۔4۔ میں حاملہ اونٹنی کو چھوڑ دینے کی بات عربوں کو قیامت کی سختی کا تصور دلانے کے لیے ایک بہترین طرز بیان ہے۔ موجودہ زمانے کے ٹرک اور بسیں چلنے سے پہلے اہل عرب کے لیے اس اونٹنی سے زیادہ قیمتی مال اور کوئی نہ تھا جو بچہ جننے کے قریب ہو۔ اس حالت میں اس کی بہت زیادہ حفاظت اور دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ ایسی اونٹنیوں سے لوگوں کا غافل ہو جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس وقت کچھ ایسی سخت افتاد پڑے گی کہ انہیں اپنے عزیز ترین مال کی حفاظت کا بھی ہوش نہ رہے گا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3 آیت۔5۔ میں وحشی جانوروں کے اکٹھا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان تو انسان، اس دن کے حول سے وحشی جانوروں پر بھی ایسی دہشت

طاری ہوگی کہ ان کو جہاں بھی پناہ ملنے کی توقع ہوگی وہ سب وہیں اکٹھا ہوجائیں گے اور آپس کی فطری دشمنیاں بھول جائیں گے۔ جنگل میں آگ لگ جائے یا سیلاب آجائے تو جنگلی جانور جس ٹیلے پر پناہ ملے اکٹھے ہوجاتے ہیں اور اس آفت کا حول ان پر ایسا طاری ہوتا ہے کہ بکری، شیر اور بھیڑیے پاس پاس کھڑے ہوتے ہیں لیکن کسی کو ہوش نہیں رہتا کہ ان کا شکار ان کی بغل میں ہے۔ یہی صورتحال خوفناک ترین شکل میں ظہورِ قیامت کے وقت پیش آئے گی۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 4

آیت۔6۔ میں سمندر کو بھڑکائے جانے کے یہ لفظ سُجِّرَتْ استعمال کیا گیا ہے جو تسجیر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ تسجیر عربی زبان میں تندور کے اندر آگ بھڑکانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ قیامت کے روز سمندروں میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ لیکن اگر پانی کی حقیقت نگاہ میں ہو تو اس میں کوئی چیز بھی قابل تعجب نہ رہے گی۔ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہے کہ اس نے آکسیجن اور ہائیڈروجن دو ایسی گیسوں کو باہم ملایا جن میں سے ایک آگ بھڑکانے والی اور دوسری بھڑک اٹھنے والی ہے اور ان دونوں کی ترکیب سے پانی جیسا مادہ پیدا کیا جو آگ بجھانے والا ہے۔ اللہ کی قدرت کا ایک اشارہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ پانی کی اس ترکیب کو بدل ڈالے اور یہ دونوں گیسیں ایک دوسرے سے الگ ہوکر بھڑکنے اور بھڑکانے میں مشغول ہوجائیں جو ان کی اصل بنیادی خاصیت ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 5

جاہلیت عرب میں یہ رسم تھی کہ لڑکی کو اپنے لیے موجب عار سمجھتے تھے اور اس کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اسلام نے یہ رسم بد مٹائی۔

آیات۔8۔9۔ میں ہے کہ ایسی لڑکیوں سے پوچھا جائے گا۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قیامت تو نام ہی یوم الحساب اور یوم الجزاء کا ہے، اس میں تو ہر شخص سے اس کے تمام اعمال کے متعلق پوچھا جائے گا اس جگہ احوال قیامت کے سلسلہ میں زندہ دفن کی ہوئی لڑکی کے معاملے کو اتنی اہمیت کے ساتھ ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے۔ غور کرنے سے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کو خود اس کے ماں باپ نے قتل کیا ہے۔ اس کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اس کی طرف سے دعویٰ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ حشر کے میدان میں جو عدالت الٰہیہ قائم ہوگی اس میں ایسے مظالم کو بھی سامنے لایا جائے گا جس کے ظلم پر نہ کوئی شہادت ہے نہ اس مظلوم کا کوئی پرسانِ حال ہے۔

قتل اولاد گناہ کبیرہ اور ظلم عظیم ہے۔ چار ماہ کے بعد کسی حمل کو گرانا بھی اسی حکم میں ہے کیونکہ چوتھے مہینے میں حمل میں روح پڑ جاتی ہے اور وہ زندہ انسان کے حکم میں ہوتا ہے۔ اور چار ماہ سے پہلے بھی اسقاط حمل، بدون اضطراری حالات کے، حرام ہے مگر پہلی صورت کی نسبت کم ہے کیونکہ اس میں کسی زندہ انسان کا قتل نہیں ہے۔

کوئی ایسی صورت اختیار کرنا جس سے حمل قرار نہ پائے، جیسے آج کل دنیا میں ضبط تولید (فیملی پلاننگ) کے نام سے اس کی مختلف صورتیں رائج ہوگئی ہیں اس کو بھی رسول اللہ ﷺ نے وَأْدٌ خفی فرمایا ہے یعنی خفیہ طور سے بچے کو دفن کر دینا۔ (مسلم، راوی حزامہ بنت وھب)۔ اور بعض دوسری روایات میں جو عزل یعنی ایسی تدبیر کرنا کہ نطفہ رحم میں نہ جائے، اس پر رسول اللہ ﷺ کی طرف سکوت یا عدم ممانعت منقول ہے وہ ضرورت کے مواقع کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ ہمیشہ کے لیے قطع نسل کی صورت نہ بنے۔ آج کل ضبط تولید کے نام سے جو دوائیں یا علاج کیے جاتے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ ہمیشہ کے لیے نسل و اولاد کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے۔ اس کی کسی حال میں اجازت نہیں ہے۔ (معارف القرآن)۔

فیملی پلاننگ کی مہم کے کارکنان عزل والی حدیث کا حوالہ دیتے ہیں لیکن وَأْدٌ خفی والی حدیث کو صاف پی جاتے ہیں۔ ایک مغرب زدہ دانشور صاحب کو میں نے اس دوسری حدیث کا حوالہ دیا تو فرمایا کہ یہ حدیث نہیں ہے کیونکہ یہ عزل والی حدیث کی ضد ہے اور اللہ

کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) متضاد بات نہیں کر سکتے۔ احادیث ڈھائی سو سال کے بعد لکھی گئی ہیں اور یہ دوسری حدیث اس وقت 1973 کے کسی کٹھ ملا قسم کے تابعی نے اپنی طرف سے بڑھائی دی ہے۔ ان کے اس طرزِ عمل سے مجھے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اول یہ کہ وَاُدْ خفی والی حدیث ان کے علم میں تھی۔ دوم یہ کہ وہ اپنی مہم کو کامیاب کرنے کی خواہش سے اس درجہ مغلوب ہو چکے ہیں کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کے دروازے انہوں نے اپنے اوپر بند کر لیے ہیں۔ ورنہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرضی و منشا تلاش کرنے والوں کو ان احادیث کی تطبیق میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

اس بات کو یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سور کو حرام کیا ہے اور ساتھ ہی حالت اضطرار میں دو شرائط کے ساتھ سور کھانے کی رخصت بھی دی ہے۔ پہلی شرط ہے کہ سؤر کھاتے وقت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بغاوت کا جذبہ نہ ہو۔ دوم یہ کہ حد سے تجاوز نہ کرے یعنی اضطرار کو ختم کرنے کے لیے جتنا کھانا ضروری ہو اس سے زیادہ نہ کھائے۔ یہی صورتحال ان دونوں احادیث کی ہے کہ عمومی حکم تو یہی ہے کہ منع حمل کی تدابیر اختیار کرنا بچے کو خفیہ طور پر دفن کرنا ہے اور گناہ ہے۔ البتہ حالت اضطرار میں کسی مخصوص شخص کے لیے رخصت ہو گی لیکن وہ ہو گی انہیں دو شرائط کے ساتھ۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ فیملی پلاننگ کے لیے ایک محکمہ قائم کرنا، وقفہ وقفہ اس کے لیے مہم چلانا، اشتہارات کی بوچھاڑ کرنا، ہر سال اس کا یوم منانا، یہ سب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کھلی بغاوت ہے اور حد سے تجاوز کرنا ہے۔ (مرتب)

آیت نمبر (15 تا 29)

خ ن س

(ن) خَنْسًا پیچھے ہٹنا۔ سکڑنا (لازم) پیچھے کرنا۔ سمیٹنا (متعدی)۔

خَانِسٌ ج خُنَّسٌ۔ پیچھے ہٹنے والا۔ سکڑنے والا۔ پیچھے کرنے والا۔ سمیٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 81/التکویر:15۔

خَنَّاسٌ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ سے۔ بار بار پیچھے ہٹنے والا۔ بار بار سکڑنے والا۔ آیت۔ 114/الناس:4۔

ك ن س

(ن) كَنْوُسًا کسی کا اپنی پناہ گاہ میں پناہ لینا۔ دبک جانا۔

كَانِسٌ ج كُنَّسٌ۔ پناہ لینے والا۔ دبک جانے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 16

ض ن ن

(ض) ضَنًّا بخل کرنا۔

ضَنِيْنٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ بخل کرنے والا۔ بخیل زیر مطالعہ آیت۔ 24۔

ترکیب (آیت۔ 15 تا 18) بِالْخُنَّسِ کے حرف جَرّ بِ پر عطف ہونے کی وجہ سے اَلْجَوَارِ اور اَلْكُنَّسِ حالت جر میں ہیں۔ وَالَّيْلِ اور وَالصُّبْحِ کی واو کو قسمیہ بھی مانا جا سکتا ہے اور عاطفہ بھی مانا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اَلَّيْلِ اور اَلصُّبْحِ کی جَرّ بِ پر عطف ہونے کی وجہ سے مانی جائے گی۔ ہم انہیں واؤ عاطفہ مان کر ترجمہ کریں گے۔ (آیت۔ 19) اِنَّهٗ میں هٗ کی ضمیر قرآن مجید کے لیے ہے۔ (آیت۔ 20۔21) ذِیْ قُوَّةٍ۔ مَكِيْنٍ۔ مُطَاعٍ اور اَمِيْنٍ، یہ سب رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ کی صفت ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہیں اور

یہ صفات بتا رہی ہیں کہ گزشتہ آیت میں رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ سے مراد حضرت جبریلؑ ہیں۔ (آیت۔23) لَقَدْ رَاٰهُ میں فعل رَاٰ میں شامل ضمیر فاعلی هُوَ رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے، جبکہ اس کی ضمیر مفعولی حضرت جبریلؑ کے لیے ہے۔ جبکہ آیت۔25۔ میں هُوَ کی ضمیر قرآن مجید کے لیے ہے۔ (آیت۔28) لِمَنْ بدل ہے گزشتہ آیت میں لِلْعٰلَمِیْنَ کا۔ لیکن یہ بدل عام نہیں بلکہ بدل بعض ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ بدل مخصوصہ ہے یعنی یہ بدل ان لوگوں کے لیے ہے جن کی خصوصیت آگے بیان ہوئی ہے۔ اردو میں بھی بدل بعض کا استعمال عام ہے۔ مثلاً ہم کہتے کہ انکم ٹیکس کے قوانین میں ہونے والی تبدیلیوں کو تمام ٹیکس دہندگان، خاص طور سے تنخواہ دار طبقہ اچھی طرح سمجھ لے۔ اسی طرح سے دونوں آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید ایک یاددہانی ہے تمام جہانوں کے لیے خاص طور سے ان کے لیے جو یہ چاہتے ہیں۔

ترجمہ

فَلَآ اُقْسِمُ	بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾	الْجَوَارِ
پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں	پیچھے ہٹنے والوں (یعنی ستاروں) کی	چلنے والوں (یعنی سیاروں) کی

الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾	وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾	وَالصُّبْحِ	اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾
چھپ جانے والوں (یعنی تاروں) کی	اور رات کی جب وہ گزر جائے	اور صبح کی	جب وہ سانس لے (یعنی روشن ہو)

اِنَّهٗ	لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾	ذِیْ قُوَّةٍ	عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾
بیشک یہ (قرآن)	یقیناً ایک بزرگ رسول (جبریلؑ) کا قول ہے	جو قوت والا ہے	عرش والے کے پاس رتبہ والا ہے

مُّطَاعٍ	ثَمَّ	اَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾	وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾
اس کی اطاعت کی جاتی ہے	وہیں	امانتدار (بھی) ہے	اور تم لوگوں کے ساتھی مجنون نہیں ہیں

وَلَقَدْ رَاٰهُ	بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿۲۳﴾	وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿۲۴﴾
اور وہ یقیناً دیکھ چکے ہیں ان (جبریلؑ) کو	کھلے آسمان کے کنارے پر	اور وہ غیب (بتانے) پر کنجوسی کرنے والے نہیں ہیں

وَمَا هُوَ	بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾	فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾
اور نہیں ہے یہ (قرآن)	کسی مردود شیطان کا قول	تو تم لوگ کہاں (بھٹکنے) جاتے ہو

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ	لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۷﴾	لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ	اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿۲۸﴾
نہیں ہے یہ (قرآن) مگر ایک یاددہانی	تمام جہانوں کے لیے	(خصوصاً) اس کے لیے جو چاہے تم میں سے	کہ وہ سیدھی راہ پر رہے

وَمَا تَشَآءُوْنَ	اِلَّآ اَنْ	يَّشَآءَ اللّٰهُ	رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾
اور تم لوگ کیا چاہو گے	سوائے اس کے کہ (جو)	چاہے گا اللہ	جو تمام جہانوں کا پالنہار ہے

نوٹ: 1 آیات۔15 تا 18۔ میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں وہ جس بات پر کھائی گئی ہے وہ آگے کی آیات میں بیان کی گئی ہیں۔ مطلب اس قسم کا یہ ہے کہ

محمد ﷺ نے تاریکی میں کوئی خواب نہیں دیکھا ہے بلکہ جب تارے چھپ گئے تھے، رات رخصت ہوگئی تھی اور روشن صبح نمودار ہوگئی تھی، اس وقت کھلے آسمان پر انہوں نے خدا کے فرشتے کو دیکھا تھا۔ اس لیے وہ جو کچھ بیان کر رہے ہیں وہ پورے ہوش گوش کے ساتھ دن کی روشنی میں پیش آنے والے تجربے پر مبنی ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

ان قسموں کی مناسبت آئندہ مضمون سے یہ ہے کہ ان ستاروں کا چلنا، ٹھہرنا اور چھپ جانا ایک نمونہ ہے سابقہ انبیاء پر وحی آنے، اور ایک مدت تک ان کے نشان باقی رہنے، پھر منقطع ہو کر غائب ہو جانے کا۔ اور رات کا آنا نمونہ ہے اس تاریک دور کا جو خاتم المرسلین ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے دنیا پر گزرا کہ حق و باطل کی تمیز نہ رہی تھی اور وحی کے آثار بالکل مٹ چکے تھے۔ (یہ دور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کے بعد سے تقریباً چھ سو سال کا عرصہ ہے جب نزول وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ مرتب) اس کے بعد صبح کا دم بھرنا، حضور ﷺ کا اس جہاں میں تشریف لانا اور قرآن کا اترنا ہے کہ ہر چیز کو ہدایت کے نور سے دن کے مانند روشن کر دیا گویا سابقہ انبیاء کا نور ستاروں کی طرح تھا اور اس نور اعظم (یعنی قرآن) کو آفتاب کہنا چاہیے۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ چلنا، لوٹنا اور چھپ جانا، فرشتے کے آنے، واپس جانے اور عالم ملکوت میں چھپنے کے مشابہ ہے۔ اور رات کا گزرنا اور صبح کا آنا، قرآن کے سبب سے ظلمت کفر دور ہو جانے اور نورِ ہدایت کے پوری طرح ظاہر ہو جانے کے مشابہ ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:2

آیات۔20۔21۔ میں حضرت جبریلؑ کی مزید صفات بیان کی گئی ہیں تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن کس محفوظ و مامون اور پاکیزہ ذریعہ سے اترا ہوا کلام ہے۔ مطاع یعنی جو فرشتے ان کی ماتحتی میں ہیں وہ سب بے چوں و چرا ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ سر مو ان کے احکام سے انحراف کر سکیں، ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکیں یا ان کے دیئے ہوئے احکام میں تحریف یا ترمیم کر سکیں۔

ثَمَّ اَمِیْن۔ یہاں ثُمَّ نہیں بلکہ ثَمَّ آیا ہے۔ ان دونوں کے استعمال میں فرق ہے۔ ثَمَّ کسی جگہ کی طرف خاص طور پر اشارے کے لیے بھی آتا ہے اور کسی صفت سے پہلے اس پر اہتمام سے زور دینے کے لیے بھی۔ یہاں یہ صفت امین سے پہلے آیا ہے۔ اس سے مقصود حضرت جبریلؑ کی اس صفت کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا ہے۔ یعنی مذکورہ صفات کے ساتھ ان کی خاص اہمیت رکھنے والی صفت یہ بھی ہے کہ وہ امانتدار ہیں۔ اس صفت کا خاص اہتمام سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی یہی صفت اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول ﷺ کے پاس جو کچھ لاتے ہیں اس میں کسی ملاوٹ یا کسی کمی بیشی کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الانفطار (82)

آیت نمبر (1 تا 8)

پ ع ث ر

(رباعی) بَعْثَرَةً کسی چیز کو الٹنا پلٹنا۔ کریدنا۔ اس میں سے کچھ نکالنے کے لیے۔ بُعْثِرَ ماضی مجہول ہے۔ کریدا جانا۔ ﴿اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ ۝﴾ (100/العٰدِیٰت:9) ''جب کریدا جائے گا اس کو جو قبروں میں ہے۔''

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۙ﴿۱﴾	وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۙ﴿۲﴾	وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۙ﴿۳﴾
جب آسمان پھٹ جائے گا	اور جب ستارے جھڑ جائیں گے	اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے

وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۙ﴿۴﴾	عَلِمَتْ نَفْسٌ	مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ؕ﴿۵﴾
اور جب قبریں ادھیڑ دی جائیں گی	تو جان لے گی ہر ایک جان اس کو	اس نے جو آگے کیا اور جو پیچھے کیا

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ	بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۙ﴿۶﴾	الَّذِىْ خَلَقَكَ
اے انسان کس چیز نے دھوکے میں ڈالا تجھ کو	تیرے کریم رب کے بارے میں	وہ جس نے پیدا کیا تجھ کو

فَسَوّٰىكَ	فَعَدَلَكَ ۙ﴿۷﴾	فِىْۤ اَىِّ صُوْرَةٍ	مَّا	شَآءَ	رَكَّبَكَ ؕ﴿۸﴾
پھر اس نے نوک پلک درست کی تیری	پھر اس نے متناسب کیا تجھ کو	جس صورت میں	جو (جیسا)	اس نے چاہا	اس نے ترتیب دیا تجھ کو

نوٹ:1

ظہور قیامت کے وقت آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا۔ دراصل قیامت کے بعد ایک بالکل نیا عالم نئے قوانین کے تحت ظہور میں آئے گا، اس وجہ سے اس عالم کہن کی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی شکل کیا ہوگی، اس کا صحیح تصور آج نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی یاد دہانی اس لیے فرمائی گئی ہے کہ لوگوں کو جھنجوڑا جائے کہ قیامت کی ہلچل ایسی ہوگی کہ یہ محکم چھت (یعنی آسمان) جس میں تم ڈھونڈے سے بھی کوئی رخنہ نہیں پا سکتے، بالکل رخنہ ہی رخنہ اور شگاف ہی شگاف بن کر رہ جائے گی۔ یہاں اس الجھن میں اپنے دماغ کو مت ڈالیئے کہ یہ آسمان جو ہمیں نظر آتا ہے، یہ محض ایک خلا ہے یا کوئی ٹھوس چیز ہے، بلکہ اس بات پر یقین رکھیں کہ جس طرح آج اس کا مشاہدہ ہم ایک محکم چھت کی شکل میں کر رہے ہیں، اسی طرح قیامت کی ہلچل کے وقت اس میں شگاف ہی شگاف نظر آئیں گے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

سورۂ تکویر میں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں میں آگ بھڑکا دی جائے گی اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں کو پھاڑ دیا جائے گا۔ دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے، اور یہ بات بھی نگاہ میں رکھی جائے کہ قرآن کی رو سے قیامت کے روز ایک ایسا زبردست زلزلہ آئے گا جو کسی علاقہ تک محدود نہیں ہوگا بلکہ پوری زمین بیک وقت ہلا ماری جائے گی، تو سمندروں کے پھٹنے اور ان میں آگ بھڑک اٹھنے کی کیفیت ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ پہلے اس عظیم زلزلے کی وجہ سے سمندروں کی تہ پھٹ جائے گی اور ان کا پانی زمین کے اس اندرونی حصے میں اترنے لگے گا جہاں ہر وقت ایک بے انتہا گرم لاوا کھولتا رہتا ہے۔ پھر اس لاوے تک پہنچ کر پانی اپنے دو ابتدائی اجزاء کی شکل میں تحلیل ہو جائے گا جن میں سے ایک آکسیجن جلانے والی ہے اور دوسری ہائیڈروجن بھڑک اٹھنے والی ہے یوں تحلیل اور آتش افروزی کا ایک ایسا مسلسل ردعمل (Chain Reaction) شروع ہو جائے گا جس سے دنیا کے تمام سمندروں میں آگ لگ جائے گی۔ یہ ہمارا قیاس ہے باقی صحیح علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

جب قیامت کے وہ حالات پیش آ چکیں گے جن کا ذکر شروع سورت میں کیا گیا ہے اس وقت ہر انسان جان لے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ آگے بھیجنے سے مراد اس پر عمل کر لینا ہے اور پیچھے چھوڑنے سے مراد ترکِ عمل ہے۔ تو قیامت کے روز ہر شخص جان لے گا کہ اس نے نیک و بد کیا کیا عمل کر لیے اور نیکی و بدی میں سے کیا چھوڑ دی تھی۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ آگے بھیجے ہوئے اعمال سے مراد وہ عمل

ہوں جو اس نے خود کیے، خواہ نیک ہوں یا بد، اور پیچھے چھوڑے ہوئے سے مراد وہ عمل ہوں جن کی رسم دنیا میں ڈال گئے۔ اگر وہ نیک کام ہیں تو ان کا ثواب اس کو ملتا رہے گا اور برے ہیں تو اس کی برائی اس کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی رہے گی۔ جیسا کہ حدیث میں 6973 ہے کہ جس شخص نے اسلام میں کوئی بھی سنت اور طریقہ جاری کرایا اس کا ثواب ہمیشہ اس کو ملتا رہے گا۔ اور جس نے کوئی بری رسم دنیا میں جاری کیا تو جب تک لوگ اس بُرے کام میں مبتلا ہوں گے اس کا گناہ اس شخص کے لیے بھی لکھا جاتا رہے گا۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 4

آیت۔6۔ کا مطلب یہ ہے کہ وہ رب کریم کیا اس کا حقدار تھا کہ اس کے حلم پر مغرور ہو کر تو نافرمانیاں کرتا رہے اور اس کے لطف و کرم کا جواب کفر و طغیان سے دے۔ اس کا کرم دیکھ کر تو اور زیادہ شرمانا اور حلیم کے غصے سے بہت زیادہ ڈرنا چاہیے تھا۔ بیشک وہ کریم ہے لیکن منتقم اور حکیم بھی ہے۔ پھر یہ دھوکا نہیں تو اور کیا ہے کہ اس کی ایک صفت کو لے کر دوسری صفات سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اس دھوکے میں پڑنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ تیرا وجود خود بتا رہا ہے کہ تو خود نہیں بن گیا ہے، تیرے ماں باپ نے بھی تجھے نہیں بنایا ہے، عناصر کے آپ سے آپ جڑ جانے سے بھی اتفاقاً تو انسان بن کر پیدا نہیں ہو گیا ہے، بلکہ ایک خدائے حکیم و توانا نے تجھے اس مکمل انسانی شکل میں ترتیب دیا ہے۔ تیرے سامنے ہر قسم کے جانور موجود ہیں جن کے مقابلے میں تیری بہترین ساخت اور تیری افضل و اشرف قوتیں صاف نمایاں ہیں۔ عقل کا تقاضہ یہ تھا کہ اس کو دیکھ کر تیرا سر بار احسان سے جھک جاتا اور اس رب کریم کے مقابلے میں تو کبھی نافرمانی کی جرأت نہ کرتا۔ تو خود جب کسی کا افسر ہوتا ہے تو اپنے اس ماتحت کو کمینہ سمجھتا ہے جو تیرے شرافت اور نرم دلی کو کمزوری سمجھ کر تیرے سر پر چڑھ جائے۔ اس لیے تیری اپنی فطرت یہ گواہی دینے کے لیے کافی ہے کہ مالک کا کرم ہرگز اس کا موجب نہ ہونا چاہیے کہ بندہ اس کے مقابلے میں جری ہو جائے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 5

آیت۔8۔ کا مطلب یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ تخلیق سب انسانوں کی ایک خاص وضع اور ہیئت پر ہونے کی وجہ سے سب میں اشتراک ہے، اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ سب ایک ہی شکل و صورت کے ہوتے، مگر حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ نے کروڑوں بلکہ اربوں انسانوں کی شکل و صورت میں ایسے امتیازات پیدا فرما دیئے جو ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہوتے بلکہ صاف اور نمایاں امتیاز رہتا ہے۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (9 تا 19)

ترکیب

(آیت۔10) اِنَّ کا اسم ہونے کی وجہ سے حٰفِظِیْنَ حالت نصب میں ہے اس کی خبر محذوف ہے۔ عَلَیْکُمْ قائم مقام خبر ہے۔ لَحٰفِظِیْنَ پر لام تاکید ہے۔ لام تاکید عموماً اِنَّ کی خبر پر آتا ہے۔ لیکن خبر محذوف ہو تو اِنَّ کے اسم پر لے آتے ہیں۔ (آیت۔ 11) کِرَامًا اور کَاتِبِیْنَ، یہ دونوں حٰفِظِیْنَ کا بدل ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔ (آیت۔13۔14) اَلْاَبْرَارَ اور اَلْفُجَّارَ، یہ دونوں اِنَّ کے اسم ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔ ان کی خبریں محذوف ہیں۔ فِیْ نَعِیْمٍ اور فِیْ جَحِیْمٍ قائم مقام خبریں ہیں۔ جن پر لام تاکید ہے۔

ترجمہ 6973

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۙ﴿۹﴾	وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ﴿۱۰﴾
ہرگز نہیں! بلکہ تم لوگ جھٹلاتے ہو بدلے (جزا وسزا) کو	اور بیشک تم لوگوں پر یقیناً محفوظ کرنے والے (مقرر) ہیں

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾	يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾	اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۚ﴿۱۳﴾
جو معزز ہیں، لکھنے والے ہیں	وہ جانتے ہیں اس کو جو تم لوگ کرتے ہو	بیشک نیک لوگ یقیناً دائمی خوشحالی میں ہیں

وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۚۖ﴿۱۴﴾	يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾
اور بیشک نافرمانی کرنے والے یقیناً جہنم میں ہیں	وہ لوگ کریں گے اس میں بدلے کے دن

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ؕ﴿۱۶﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۙ﴿۱۷﴾
اور وہ لوگ اس (جہنم) سے چھپنے والے نہیں ہیں	اور تو کیا جانے کیا ہے بدلے کا دن

ثُمَّ	مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ؕ﴿۱۸﴾	يَوْمَ لَا تَمْلِكُ	نَفْسٌ لِّنَفْسٍ
پھر (مکرر)	تو کیا جانے کیا ہے بدلے کا دن	جس دن اختیار نہ رکھے گی	کوئی جان کسی جان کے لیے

شَيْئًا ؕ	وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ	لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾
کسی چیز کا	اور سارے معاملات اس دن	اللہ کے لیے ہوں گے

نوٹ: 1

آیت۔10۔12۔کا مطلب یہ ہے کہ اس مغالطہ میں نہ رہنا کہ تمہاری جلوت وخلوت کی ساری باتوں سے کون باخبر ہوسکتا ہے کہ ایک دن ان کا محاسبہ کرنے بیٹھے۔جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ہر ایک کے اوپر اپنے نگراں بیٹھا رکھے ہیں جو تمہارے ہر قول وفعل کو نوٹ کر رہے ہیں۔ساتھ ہی وہ نہایت معزز ہیں۔ان فرشتوں کی صفت کِرَامًا، سے مقصود اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ یہ جس ڈیوٹی پر مامور ہیں اس کو نہایت فرض شناسی، پورے احساس ذمہ داری اور کامل غیر جانبداری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔اور جو کچھ تم کرتے ہو اور جہاں کہیں بھی کرتے ہو، وہ سب ان پر واضح ہوتا ہے۔یہاں صرف افعال کے جاننے کا ذکر ہے لیکن سورہ ق آیت۔18۔میں فرمایا نہیں بولتا ہے وہ کوئی بات مگر ایک مستعد نگراں اس کے پاس موجود ہوتا ہے۔'' سورہ ق میں یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ فرشتے دو ہوتے ہیں اور دائیں بائیں دونوں طرف سے نگرانی کرتے ہیں۔احادیث سے یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ ان میں تقسیم کار ہوتی ہے۔ایک نیکیاں لکھنے پر مامور ہوتا ہے اور دوسرا بدیاں لکھنے پر (تدبر قرآن)۔

ان فرشتوں کا مرتب کردہ ریکارڈ ایک مکمل ریکارڈ ہے جس میں درج ہونے سے کوئی بات رہ نہیں گئی ہے۔اسی کے متعلق سورۂ کہف کی آیت۔49 میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے روز مجرمین یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ان کا جو نامۂ اعمال پیش کیا جارہا ہے اس میں کوئی چھوٹی یا بڑی بات درج ہونے سے رہ نہیں گئی ہے، جو کچھ انہوں نے کیا تھا سب کا سب جوں کا توں ان کے سامنے حاضر ہے۔

(تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6973

سورۃ المطففین (83)

آیت نمبر (1 تا 17)

ط ف ف

(ض) طَفًّا ہاتھ یا پاؤں سے کسی چیز کو اٹھانا۔

(تفعیل) تَطۡفِیۡفًا کسی چیز میں ذرا سی کمی کرنا۔ پیمانہ کو تھوڑا سا کم بھرنا۔ زیر مطالعہ آیت۔1۔

ر ی ن

(ض) رَیۡنًا کسی کا کسی پر غالب آنا۔ چھا جانا۔ زیر مطالعہ آیت۔14۔

ترجمہ

وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ ۙ﴿۱﴾	الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ	یَسۡتَوۡفُوۡنَ ۖ﴿۲﴾
تباہی ہے کمی کرنے والوں کے لیے	وہ لوگ جو جب کبھی ناپ کر لیتے ہیں لوگوں سے	تو پورا لینا چاہتے ہیں

وَاِذَا کَالُوۡہُمۡ	اَوۡ وَّزَنُوۡہُمۡ	یُخۡسِرُوۡنَ ؕ﴿۳﴾	اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ
اور جب کبھی ناپ کر دیتے ہیں ان کو	یا تول کر دیتے ہیں ان کو	تو کمی کرتے ہیں	کیا گمان نہیں کرتے وہ لوگ

اَنَّہُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ۙ﴿۴﴾	لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ۙ﴿۵﴾	یَّوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ	لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ؕ﴿۶﴾
کہ وہ اٹھائے جانے والے ہیں	ایک عظیم دن کے لیے	جس دن کھڑے ہوں گے لوگ	تمام جہانوں کے رب کے سامنے

کَلَّاۤ اِنَّ کِتٰبَ الۡفُجَّارِ	لَفِیۡ سِجِّیۡنٍ ؕ﴿۷﴾	وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا سِجِّیۡنٌ ؕ﴿۸﴾
ہرگز نہیں! بیشک نافرمانی کرنے والوں کی کتاب (نامہ اعمال)	یقیناً سجین میں ہے	اور تو کیا جانے کیا ہے سجین

کِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ ؕ﴿۹﴾	وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ	لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ۙ﴿۱۰﴾	الَّذِیۡنَ یُکَذِّبُوۡنَ
(وہ) ایک لکھی ہوئی کتاب ہے	تباہی ہے اس دن	جھٹلانے والوں کے لیے	وہ لوگ جو جھٹلاتے ہیں

بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ﴿۱۱﴾	وَمَا یُکَذِّبُ بِہٖۤ	اِلَّا کُلُّ مُعۡتَدٍ اَثِیۡمٍ ۙ﴿۱۲﴾
بدلے کے دن کو	اور نہیں جھٹلاتے اس کو	مگر سارے حد سے بڑھنے والے گنہگار

اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِ اٰیٰتُنَا	قَالَ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ؕ﴿۱۳﴾	بَلۡ ۜ رَانَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ
جب کبھی پڑھ کر سنائی جاتی ہے اس کو ہماری آیتیں	تو وہ کہتا ہے پہلے لوگوں کے افسانے ہیں	ہرگز نہیں! بلکہ چھا گیا ان کے دلوں پر

مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾	کَلَّاۤ اِنَّہُمۡ عَنۡ رَّبِّہِمۡ	یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ؕ﴿۱۵﴾
وہ جو یہ لوگ کماتے تھے	ہرگز نہیں! بیشک یہ لوگ اپنے رب سے	اس دن یقیناً روکے ہوئے ہوں گے

ثُمَّ اِنَّهُمْ	لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾	ثُمَّ يُقَالُ	هٰذَا الَّذِيْ	كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۶۹﴾
پھر بیشک یہ لوگ	یقیناً گرنے والے ہیں جہنم میں	پھر ان سے کہا جائے گا	یہ وہ ہے	تم لوگ جس کو جھٹلایا کرتے تھے

نوٹ: 1

اس سورت کے انداز بیان اور مضامین سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے جب اہل مکہ کے ذہن میں آخرت کا عقیدہ بٹھانے کے لیے پے در پے سورتیں نازل ہو رہی تھیں۔ بعض مفسرین نے اس کو مدنی قرار دیا ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ دراصل ابن عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینے تشریف لائے تو یہاں کے لوگوں میں کم ناپنے اور تولنے کا مرض پھیلا ہوا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ نازل کی اور لوگ بہت اچھی طرح ناپنے تولنے لگے۔ لیکن جیسا کہ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کا یہ عام طریقہ تھا کہ ایک آیت جس معاملہ میں چسپاں ہوتی ہو اس کے متعلق وہ یوں کہا کرتے تھے کہ یہ فلاں معاملہ میں نازل ہوئی۔ اس لیے ابن عباسؓ کی روایت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے لوگوں میں یہ بری عادت پھیلی ہوئی پائی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سورت ان کو سنائی اور اس سے ان کے معاملات درست ہو گئے۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶، ص ۸۷۲)

نوٹ: 2

مُطَفِّفِيْن کا لفظ تَطْفِيْف سے مشتق ہے۔ عربی میں طَفِيْف چھوٹی اور حقیر چیز کے لیے بولتے ہیں اور تطفیف کا لفظ اصطلاحاً ناپ تول میں چوری چھپے کمی کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ کام کرنے والا ناپ کر یا تول کر چیز دیتے ہوئے کوئی بڑی مقدار نہیں اڑاتا بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھا کر ہر خریدار کے حصے سے تھوڑا تھوڑا اڑاتا رہتا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

قرآن وحدیث میں ناپ تول میں کمی کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ کیونکہ عام طور پر معاملات کا لین دین انہی دو طریقوں سے ہوتا ہے اور انہی کے ذریعہ کہا جا سکتا ہے کہ حقدار کا حق ادا ہوا یا نہیں۔ لیکن اس سے مقصود ہر ایک حقدار کا حق پورا پورا دینا ہے اور اس میں کمی کرنا حرام ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ صرف ناپ تول کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر وہ چیز جس سے حق پورا کرنا یا نہ کرنا جانچا جاتا ہے، اس کا یہی حکم ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز کے رکوع سجدے وغیرہ پورے نہیں کرتا بلکہ جلدی جلدی نماز ختم کر ڈالتا ہے۔ تو اس سے فرمایا کہ تو نے اللہ کے حق میں تطفیف کر دی۔ حضرت عمرؓ کے اس قول کو نقل کر کے امام مالکؒ نے فرمایا کہ حق پورا دینا یا کم کرنا ہر چیز میں ہے، یہاں تک کہ نماز، وضو، طہارت وغیرہ میں بھی اور اسی طرح دوسرے حقوق اللہ اور عبادات میں کمی کوتاہی کرنے والا تطفیف کرنے کا مجرم ہے۔ اسی طرح حقوق العباد میں جو شخص مقررہ حق سے کم کرتا ہے وہ بھی تطفیف کے حکم میں ہے۔ ملازم نے جتنے وقت کی خدمت کا معاہدہ کیا ہے اس میں سے وقت چرانا اور چوری کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ وقت کے اندر جس طرح محنت کرنے کا عرف میں معمول ہے اس میں سستی کرنا بھی تطفیف ہے۔ اپنی ملازمت کے فرائض میں کمی کرنے کو کوئی گناہ بھی نہیں سمجھتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب قوم تطفیف کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کا رزق قطع کر دیتا ہے۔ حدیث میں جو رزق قطع کر دینے کا ارشاد ہے اس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اس کو رزق سے بالکل محروم کر دیا جائے۔ اور یہ صورت بھی قطع رزق میں داخل ہے کہ رزق موجود ہوتے ہوئے وہ اس کو کھا نہ سکے یا استعمال نہ کر سکے جیسے بہت سے بیماریوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس زمانے میں بہت عام ہے۔ اسی طرح قحط کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اشیاء ضرورت مفقود ہو جائیں اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موجود ہونے کے باوجود ان کی گرانی اتنی بڑھ جائے کہ خریداری مشکل ہو جائے۔ جیسا کہ آج کل اس کا مشاہدہ اکثر چیزوں میں ہو رہا ہے۔ اس سے وہ شبہات رفع ہو جاتے ہیں جو حدیث کے الفاظ کے متعلق ظاہر حالات کے اعتبار سے ہو سکتے ہیں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:3 معاشرے کی بے شمار خرابیوں میں سے ایک خرابی کو بطور مثال لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ آخرت سے غفلت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب تک لوگوں کو یہ احساس نہ ہو کہ خدا کے سامنے پیش ہونا ہے اور کوڑی کوڑی کا حساب دینا ہے، اس وقت تک یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے معاملات میں کامل راستبازی اختیار کر سکیں۔ کوئی شخص دیانتداری کو اچھی پالیسی سمجھ کر بعض چھوٹے معاملات میں دیانت برت بھی لے، تو ایسے مواقع پر وہ کبھی دیانت نہیں برت سکتا جہاں بے ایمانی ایک مفید پالیسی ثابت ہوتی ہو۔ آدمی کے اندر سچی اور مستقل دیانتداری اگر پیدا ہو سکتی ہے تو صرف آخرت پر یقین ہی سے ہو سکتی ہے، کیونکہ اس صورت میں دیانت ایک ''پالیسی'' نہیں بلکہ ''فریضہ'' قرار پاتی ہے اور آدمی کے اس پر قائم رہنے یا نہ رہنے کا انحصار دنیا میں مفید ہونے یا غیر مفید ہونے پر نہیں رہتا۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶۔ ص ۸۷۲۔ ۹۷۲)

نوٹ:4 آیت۔ 7۔ میں لفظ سِجِّیْنٍ آیا ہے جو سجن سے مشتق ہے جس کے معنی تنگ جگہ میں قید کرنے کے ہیں۔ اور احادیث و آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سجین ایک خاص مقام کا نام ہے اور کفار و فجار کی ارواح کا مقام یہی ہے اور اسی مقام پر ان کے نامۂ اعمال رہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے اعمال نامہ اس جگہ محفوظ کر دیئے جاتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ کوئی ایسی جامع کتاب ہو جس میں تمام کفار و فجار کے اعمال لکھ دیئے جاتے ہوں۔ اس کے آگے کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ کے الفاظ آئے ہیں ان کے متعلق امام بغوی اور ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ جملہ مقام سجین کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے جو کِتٰبُ الفجار آیا ہے اس کا بیان ہے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:5 آیت۔ 14۔ میں رَانَ کا لفظ رین سے مشتق ہے جس کے معنی زنگ اور میل کچیل کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے گناہوں کا زنگ لگ گیا ہے اور جس طرح زنگ لوہے کو کھا کر مٹی بنا دیتا ہے اسی طرح ان کے گناہوں کے زنگ نے ان کے دل کی اس صلاحیت کو ختم کر دیا جس سے بھلے برے کی تمیز ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر اس نے توبہ کر لی تو یہ سیاہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور دل اپنی اصل حالت میں منور ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس نے توبہ نہ کی بلکہ اپنے گناہوں میں زیادتی کرتا چلا گیا تو یہ سیاہی اس کے سارے قلب پر چھا جاتی ہے۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (18 تا 36)

ترجمہ

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ	لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿١٨﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ
ہرگز نہیں! بیشک نیکی کرنے والوں کی کتاب (اعمال نامہ)	یقیناً بلندیوں میں ہے	اور تو کیا جانے

مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿١٩﴾	كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٢٠﴾	يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢١﴾
کیا ہیں (وہ) بلندیاں	(وہ) ایک لکھی ہوئی کتاب ہے	موجود ہوتے ہیں اس پر قربت دیئے ہوئے (فرشتے)

اِنَّ الْاَبْرَارَ	لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿٢٢﴾	عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿٢٣﴾	تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ
بیشک نیکی کرنے والے	یقیناً دائمی خوشحالی میں ہوں گے	تختوں پر (بیٹھے) دیکھتے ہوئے	تو پہچانے گا ان کے چہروں میں

نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿٢٤﴾	يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿٢٥﴾	خِتٰمُهٗ مِسْكٌ	وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ
دائمی خوشحالی کی تروتازگی کو	وہ پلائے جائیں گے سربمہر کی ہوئی خالص (شراب)	جس کی مہر مشک ہوگی	اور اس میں پس چاہیے کہ جان کھپائیں

الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾	وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾	عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾
جان کھپانے والے	اور اس (رحیق) کی ملاوٹ تسنیم سے ہوگی	(یعنی) ایک ایسا چشمہ ہے پئیں گے جس سے قربت دیئے ہوئے

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا	كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾	وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ
بیشک وہ لوگ جنہوں نے جُرم کیا	وہ ان سے جو ایمان لائے ہنسی ٹھٹھا کرتے تھے	اور جب گزرتے ان کے پاس سے

يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾	وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ	انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾
تو باہم ایک دوسرے کو آنکھ مارتے	اور جب لوٹتے ہیں اپنے گھر والوں کی طرف	تو لوٹتے ہیں اکڑ باز ہوتے ہوئے

وَاِذَا رَاَوْهُمْ	قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾
اور جب وہ (مجرم) لوگ دیکھتے ہیں ان (اہل ایمان) کو	تو کہتے ہیں بیشک یہ لوگ یقیناً بھٹکنے والے ہیں

وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ	حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾
حالانکہ وہ (مجرم) لوگ نہیں بھیجے گئے ان (اہل ایمان) پر	نگہبانی کرنے والے ہوتے ہوئے

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	مِنَ الْكُفَّارِ	يَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾
تو آج کے دن وہ لوگ جو ایمان لائے	انکار کرنے والوں سے	ٹھٹھا کریں گے

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾	هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ	مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾
تختوں پر (بیٹھے) دیکھتے ہوئے	(تو) کیا بدلہ دے دیا گیا منکروں کو	وہ (اس کا) جو وہ کرتے تھے

نوٹ: 1

تنافس کے معنی ہے کہ چند آدمیوں کا کسی خاص مرغوب ومحبوب چیز کو حاصل کرنے کے لیے جھپٹنا اور دوڑنا تاکہ دوسروں سے پہلے وہ اس کو حاصل کرلیں۔ یہاں جنت کی نعمتوں کا ذکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے غفلت شعار انسان کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ آج تم لوگ جن چیزوں کو مرغوب ومطلوب سمجھ کر ان کو حاصل کرنے میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو، وہ ناقص اور فانی نعمتیں اس قابل نہیں کہ ان کو مقصود زندگی سمجھ کر ان کے لیے مسابقت کرو۔ بلکہ ان میں تو قناعت وایثار سے کام لے کر یہ سمجھ لو یہ چند روزہ راحت کا سامان ہاتھ سے نکل بھی گیا تو کچھ بڑے صدمے کی بات نہیں، یہ ایسا خسارہ نہیں جس کی تلافی نہ ہو سکے۔ البتہ تنافس اور مسابقت کرنے کی چیز یہ جنت کی نعمتیں ہیں جو ہر حیثیت سے مکمل بھی ہیں اور دائمی بھی۔ (معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6973

سورۃ الانشقاق (84)

آیت نمبر (1 تا 9)

ك	د	ح

(ف) كَدْحًا کسی کام میں بہت محنت کرنا۔ کسی چیز کے لیے تگ ودو کرنا۔
كَادِحٌ اسم الفاعل ہے۔ تگ ودو کرنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔6۔

ترجمہ

اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ ۙ﴿۱﴾	وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّهَا
جب آسمان پھٹ جائے گا	اور وہ کان دھرے گا اپنے رب (کے حکم) کے لیے

وَ حُقَّتۡ ۙ﴿۲﴾	وَ اِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ ۙ﴿۳﴾	وَ اَلۡقَتۡ مَا فِیۡهَا
اس حال میں کہ وہ اس لائق کیا گیا	اور جب زمین دراز کی جائے گی	اور وہ ڈال دے گی وہ جو اس میں ہے

وَ تَخَلَّتۡ ۙ﴿۴﴾	وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّهَا	وَ حُقَّتۡ ۵
اور خود خالی ہو جائے گی	اور وہ کان دھرے گی اپنے رب (کے حکم) کے لیے	اس حال میں کہ وہ اس لائق کی گئی

یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ	اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ	كَدۡحًا
اے انسان	یقیناً تو تگ ودو کرنے والا ہے اپنے رب کی طرف	جیسا تگ ودو کرنے کا حق ہے

فَمُلٰقِیۡهِ ۚ﴿۶﴾	فَاَمَّا مَنۡ	اُوۡتِیَ كِتٰبَهٗ	بِیَمِیۡنِهٖ ۙ﴿۷﴾
پھر ملاقات کرنے والا ہے اس سے	پس وہ جو ہے جس کو	دی گئی اس کی کتاب	اس کے داہنے ہاتھ میں

فَسَوۡفَ یُحَاسَبُ	حِسَابًا یَّسِیۡرًا ۙ﴿۸﴾	وَّ یَنۡقَلِبُ اِلٰۤی اَهۡلِهٖ	مَسۡرُوۡرًا ؕ﴿۹﴾
تو جلد ہی اس سے حساب لیا جائے گا	ایک ہلکا سا حساب	اور وہ لوٹے گا اپنے گھر والوں کی طرف	خوش کیا ہوا ہوتے ہوئے

نوٹ: 1

زمین کے پھیلا دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ سمندر اور دریا پاٹ دیئے جائیں گے، پہاڑ ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیئے جائیں گے اور زمین کی ساری اونچ نیچ برابر کر کے اسے ایک ہموار میدان بنا دیا جائے گا۔ سورہ طٰہٰ میں اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ایک چٹیل میدان بنا دے اجس میں تم کوئی بل اور سلوٹ نہ پاؤ گے۔ (آیات۔106۔107)۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ زمین ایک دستر خوان کی طرح پھیلا کر بچھا دی جائے گی۔ پھر انسان کے لیے اس پر صرف قدم رکھنے کی جگہ ہوگی۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے یہ حقیقت نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اس دن تمام انسانوں کو جو روز آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے ہوں گے، بیک وقت زندہ کر کے عدالت الٰہی میں پیش کیا جائے گا۔ اتنی بڑی آبادی کو جمع کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ سمندر، دریا، پہاڑ، جنگل، گھاٹیاں اور پست و بلند علاقے سب کے سب ہموار کر کے کرۂ زمین کو ایک میدان بنا دیا جائے تا کہ اس پر ساری نوع انسانی کے افراد کھڑے ہونے کی جگہ پا سکیں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

كَدْحٌ کے معنے کسی کام میں پوری جدو جہد اور اپنی توانائی صرف کرنے کے ہیں اور اِلٰی رَبِّكَ سے مراد اِلٰی لِقَاءِ رَبِّكَ ہے یعنی انسان کی ہر سعی اور جدو جہد کی انتہا اس کے رب کی ملاقات کی طرف ہونے والی ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو خطاب فرما کر اسے غور و فکر کے لیے ایک ایسی راہ دکھائی ہے کہ جس میں کچھ بھی عقل و شعور ہو تو وہ اپنی جدو جہد کا رخ صحیح سمت کی طرف پھیر سکتا ہے جو اس کو دنیا اور دین، دونوں میں سلامتی اور عافیت کی ضمانت دے۔

پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ انسان نیک ہو یا بد، مومن ہو یا کافر، وہ اپنی فطرت سے اس کا عادی ہے کہ کسی نہ کسی چیز کو اپنا مقصود بنا کر اس کو حاصل کرنے کے لیے جدو جہد کرے اور مشقت برداشت کرے۔ ایک نیک انسان اپنی ضروریات زندگی کی تحصیل میں جائز طریقوں کو اختیار کرتا ہے اور ان میں اپنی محنت و توانائی صرف کرتا ہے۔ ایک بدکار انسان بھی اپنے مقاصد کسی محنت اور جدو جہد کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا۔ چور، ڈاکو اور دھوکہ فریب سے لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کو دیکھو کسی کیسی ذہنی اور جسمانی مشقت برداشت کرتے ہیں جب ان کو ان کا مقصود حاصل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ انسان اگر غور کرے تو آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اس کی حرکات ہوں یا سکنات، وہ سب ایک سفر کی منزلیں ہیں جسے وہ غیر شعوری طور پر طے کر رہا ہے۔ اس سفر کی انتہا موت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری۔ اور یہ انتہا ایسی حقیقت ہے کہ جس کا کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان کی ہر جدو جہد کا موت پر ختم ہونا یقینی ہے۔ تیسری بات یہ بتلائی کہ موت کے بعد اپنے رب کے سامنے حاضری کے وقت تمام حرکات و اعمال اور جدو جہد کا حساب ہونا از روئے عقل و انصاف ضروری ہے تاکہ نیک و بد کا انجام الگ الگ معلوم ہو سکے کیونکہ دنیا میں اس کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ ایک نیک آدمی پورا مہینہ محنت مزدوری کر کے اپنا رزق اور جو ضروریات حاصل کرتا ہے، چور ڈاکو اس کو ایک رات میں حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی حساب اور جزا و سزا کا وقت نہ آئے تو دونوں برابر ہو گئے جو عقل و انصاف کے خلاف ہے۔

آخر میں فرمایا فَمُلٰقِيْهِ۔ اس کی ضمیر كَدْحٌ کے لیے بھی ہو سکتی ہے ایسی صورت میں معنی ہوں گے کہ جو بھی جدو جہد انسان یہاں کر رہا ہے اُن سے وہ اپنے رب کے پاس پہنچ کر مل لے گا۔ اور اس کے اچھے یا بُرے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مُلٰقِيْهِ کی ضمیر رب کے لیے ہو۔ تو معنی ہوں گے کہ ہر انسان آخرت میں اپنے رب سے ملنے والا ہے اور اپنے کیے کا حساب دینے والا ہے۔ اس کے آگے نیک و بد انسانوں کے الگ الگ انجام کا ذکر ہے۔

اس سارے مجموعہ پر انسان اگر غور کرے کہ ضروریات زندگی اور مرغوبات نفس کو حاصل تو نیک و بد دونوں ہی کر لیتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح دنیا کی زندگی دونوں کی گزر جاتی ہے مگر ان دونوں کے انجام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک کے نتیجہ میں کبھی نہ ختم ہونے والی راحت ہی راحت ہے اور دوسرے کے نتیجہ میں کبھی نہ ختم ہونے والی مصیبت اور عذاب ہے۔ پھر کیوں نہ انسان اس انجام کو آج ہی سوچ سمجھ کر اپنی کوشش اور عمل کا رخ اس طرف پھیر دے جو دنیا میں بھی اس کی ضرورتوں کو پورا کر دے اور آخرت کی دائمی نعمت بھی مل جائے۔

(معارف القرآن)۔

السلام وعلیکم رحمۃ اللہ وبرکاۃ

اللہ تعالیٰ ہم سب کی یہ سعی قبول فرمائے اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بنائے۔ جس جس نے بھی اس کار خیر میں مال، جان اور صلاحیتوں کو لگایا اللہ قبول و منظور فرمائے

انجمن خدام القرآن فیصل آباد میں اس کے فوٹو کاپی بھی دستیاب ہیں اور محترم ڈاکٹر جہاں زیب صاحب کے اس کتاب میں اضافہ جات کے ساتھ مطالعہ قرآن حکیم کے نام سے دستیاب ہیں

رابطہ کے لئے: info@khuddam-ul-quran.com ,www.khuddam-ul-quran.com

03217805614,0412437618,0412437781

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

2004

سورۃ الانشقاق (84)

آیت نمبر (10 تا 25)

و س ق

(ض) وَسۡقًا کسی چیز کے متفرق اجزا کو اکٹھا کرنا۔ جمع کرنا۔ زیر مطالعہ آیت۔17۔

(افتعال) اِتِّسَاقًا کسی چیز کے متفرق اجزا کا اکٹھا ہونا۔ جمع ہونا، اس طرح کہ وہ چیز پوری ہو جائے۔ کامل ہو جائے۔ زیر مطالعہ آیت۔18۔

ترجمہ

وَ اَمَّا مَنۡ	اُوۡتِیَ کِتٰبَہٗ	وَرَآءَ ظَہۡرِہٖ ۙ﴿۱۰﴾	فَسَوۡفَ یَدۡعُوۡا ثُبُوۡرًا ۙ﴿۱۱﴾
اور وہ جو ہے جس کو	دی گئی اس کی کتاب	اس کی پیٹھ کے پیچھے سے	تو جلد ہی وہ پکارے گا ہلاک ہونے کو
وَّ یَصۡلٰی سَعِیۡرًا ؕ﴿۱۲﴾	اِنَّہٗ کَانَ فِیۡۤ اَہۡلِہٖ	مَسۡرُوۡرًا ؕ﴿۱۳﴾	اِنَّہٗ ظَنَّ
اور وہ گرے گا آگ میں	بیشک وہ تھا اپنے گھر والوں میں	خوش وخرم	بیشک اس نے گمان کیا
اَنۡ لَّنۡ یَّحُوۡرَ ۚ﴿۱۴﴾	بَلٰۤی ۚ اِنَّ رَبَّہٗ	کَانَ بِہٖ بَصِیۡرًا ؕ﴿۱۵﴾	
کہ وہ ہرگز واپس نہیں ہوگا	کیوں نہیں یقیناً اس کا رب	اس کو ہر حال میں دیکھنے والا تھا	
فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ﴿۱۶﴾	وَ الَّیۡلِ وَ مَا وَسَقَ ۙ﴿۱۷﴾		
پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں شفق کی	اور رات کی اور اس کی جو اس نے اکٹھا کیا		
وَ الۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ﴿۱۸﴾	لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ؕ﴿۱۹﴾	فَمَا لَہُمۡ	
اور چاند کی جب وہ کامل ہوا	تم لوگ لازماً چڑھو گے ایک منزل پر ایک منزل سے	تو ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے	
لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۲۰﴾	وَ اِذَا قُرِئَ عَلَیۡہِمُ الۡقُرۡاٰنُ	لَا یَسۡجُدُوۡنَ ۩﴿۲۱﴾	
(کہ) یہ لوگ ایمان نہیں لاتے	اور جب پڑھ کر سنایا جاتا ہے ان کو قرآن	تو یہ لوگ سجدہ نہیں کرتے (السجدہ ۱۳)	
بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُکَذِّبُوۡنَ ۬ۚ﴿۲۲﴾	وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ	بِمَا یُوۡعُوۡنَ ۬ۖ﴿۲۳﴾	
بلکہ جنہوں نے انکار کیا وہ جھٹلاتے ہیں	اور اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہے	اس کو جو یہ محفوظ کرتے ہیں	
فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۙ﴿۲۴﴾	اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا		
تو آپؐ بشارت دیں ان کو ایک دردناک عذاب کی	سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے		
وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	لَہُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ﴿۲۵﴾		
اور عمل کیے نیکیوں کے	ان کے لیے ایک ایسا اجر ہے جو غیر منقطع ہے		

نوٹ: 1

آیات۔16 تا18۔ میں حق تعالیٰ نے چار چیزوں کی قسم کھا کر (یعنی شہادت کے طور پر پیش کر کے۔ مرتب) انسان کو بھی اس چیز کی طرف متوجہ کیا ہے جس کا ذکر اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ میں آچکا ہے۔ یہ چاروں چیزیں جن کی قسم کھائی ہے اس مضمون کی شاہد ہیں جو جواب قسم لَتَرْكَبُنَّ طَبَاقًا عَنْ طَبَقٍ میں آنے والا ہے کہ انسان کو ایک حال پر قرار نہیں ہے۔ اس کے حالات اور درجات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ پہلی چیز شفق ہے یعنی وہ سرخی جو آفتاب غروب ہونے کے بعد افق مغرب میں ہوتی ہے۔ یہ رات کی ابتداء ہے جو انسانی احوال میں ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے کہ روشنی جارہی ہے اور تاریکی کا سیلاب آرہا ہے۔ دوسری رات کی قسم ہے جو انقلاب کی تکمیل کرتی ہے۔ تیسری قسم ان چیزوں کی ہے جن کو ارات اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ یعنی وہ چیزیں جو دن کی روشنی میں منتشر پھیلی رہتی ہیں، رات کے وقت وہ سب سمٹ کر اپنے اپنے ٹھکانوں میں جمع ہو جاتی ہیں اور انسان، چرند و پرند، سب اپنے اپنے گھروں اور گھونسلوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ کاروبار کے پھیلے ہوئے سامان کو سمیٹ کر یکجا کر دیا جاتا ہے۔ یہ عظیم انقلاب خود انسان اور اس کے متعلقات میں ہے۔ (یعنی اسی طرح انسان بھی اپنے ''وطن'' یعنی جنت سے نکل کر اس دنیا میں منتشر پھرتا رہتا ہے۔ پھر کچھ عرصے بعد اس کو اس کے وطن کی طرف واپس سمیٹ لیا جاتا ہے۔ مرتب)۔ چوتھی قسم جس چیز کی کھائی گئی وہ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ہے۔ اس میں چاند کے مختلف اطوار کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے ایک نہایت خفیف قوس کی شکل میں ہوتا ہے۔ پھر اس کی روشنی روزانہ کچھ ترقی کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بدر کامل ہو جاتا ہے۔ مسلسل اور پیہم انقلاباتِ احوال پر شہادت دینے والی چار چیزوں کی قسم کھا کر حق تعالیٰ نے فرمایا نے فرمایا۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ۔ یعنی انسان اپنی تخلیق کی ابتدا سے انتہا تک کسی بھی وقت ایک حال پر نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے وجود پر تدریجی انقلابات آتے رہتے ہیں۔

طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ کی تفسیر حضرت جابر بن عبداللہؓ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے۔ یہ طویل حدیث قرطبیؒ نے اور ابن کثیرؒ نے مفصل نقل کی ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ انسان نطفہ سے منجمد خون بنا۔ پھر اس سے ایک مضغۂ گوشت بنا۔ پھر اس میں ہڈیاں پیدا ہوئیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا اور اعضاء کی تکمیل ہوئی۔ پھر اس میں روح لا کر ڈالی گئی اور وہ ایک زندہ انسان بنا جس کی غذا بطن مادر کے اندر رحم کا گندا خون تھا۔ نو مہینے کے بعد اللہ نے اس کے دنیا میں آنے کا راستہ آسان کر دیا اور گندی غذا کی جگہ ماں کا دودھ ملنے لگا۔ دنیا کی وسیع فضا اور ہوا دیکھی، بڑھنے اور پھلنے پھولنے لگا۔ دو برس کے اندر چلنے پھرنے اور بولنے کی قوت بھی حرکت میں آئی۔ ماں کا دودھ چھوٹ کر اس سے زیادہ لذیذ اور طرح طرح کی غذائیں ملیں، کھیل کود اور لہو ولعب اس کے دن رات کا مشغلہ بنا۔ کچھ ہوش وشعور بڑھا تو تعلیم وتربیت کے شکنجے میں کسا گیا۔ جوان ہوا تو جوانی کی خواہشات نے ان کی جگہ لے لی اور ایک نیا عالم شروع ہوا۔ نکاح، شادی، اولاد اور خانہ داری کے مشاغل دن رات کا مشغلہ بن گئے۔ آخر یہ دور بھی ختم ہونے لگا۔ قویٰ میں ضعف پیدا ہوا، بیماریاں آئے دن رہنے لگیں، بڑھاپا آ گیا اور اس جہاں کی آخری منزل یعنی قبر تک پہنچنے کے سامان ہونے لگے۔ یہ سب چیزیں تو سب کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ کسی کو ان سے انکار کرنے کی مجال نہیں۔ مگر حقیقت سے ناآشنا انسان سمجھتا ہے کہ یہ موت اور قبر اس کی آخری منزل ہے اور آگے کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو خالق کائنات ہے اور علیم وخبیر ہے، اس نے آگے آنے والے مراحل کو اپنے انبیاء کے ذریعہ انسان تک پہنچایا کہ قبر تیری آخری منزل نہیں بلکہ یہ صرف ایک انتظار گاہ (ویٹنگ روم) ہے۔ آگے اس سے بھی بڑا ایک جہان آنے والا ہے۔ اس میں ایک بڑے حساب کتاب کے بعد انسان کی آخری منزل مقرر ہو جائے گی جو یا دائمی راحت ہوگی یا پھر دائمی عذاب کی۔ اور اس آخری منزل پر ہی پہنچ کر انسان انقلابات کے چکر سے نکلے گا۔

ان آیات میں انسان کو اس کی تخلیق اور دنیا میں اس کو پیش آنے والے حالات وانقلابات سامنے کر کے یہ ہدایت دی کہ عقلمند انسان کا کام یہ ہے کہ دنیا میں اپنے آپ کو مسافر سمجھے اور اپنے وطن اصلی کے لیے سامان تیار کرنے اور بھیجنے کی فکر کو ہی دنیا کا سب سے بڑا مقصد بنائے۔ پھر فرمایا کہ ان تمام روشن ہدایات کے باجود بہت سے لوگ اپنی غفلت سے باز نہیں آتے۔ ایسے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اس کے سامنے جھکتے ہیں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

حق تو یہ تھا کہ جب قرآن ان کو ایسی عظیم حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے تو اس کو سننے کے بعد اس کی عظمت کے اعتراف میں اپنے رب کے آگے سجدہ میں گر پڑتے لیکن اس کے برعکس وہ اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہاں اہل عرب اور اہل مصر کی یہ روایت پیش نظر رہے کہ جب وہ کسی بات کی عظمت اور صداقت کا جوش وجذبہ کے ساتھ اعتراف کرنا چاہتے تو اس کو دیکھتے یا سنتے ہی سجدے میں گر پڑتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے فرعون نے جن ساحروں کو اکٹھا کیا تھا انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت اور ان کے معجزات کی عظمت کا اعتراف اسی طرح کیا تھا۔ عرب کے مشہور شاعر لبید کے قصیدے کے ایک شعر پر بھی اس وقت کے مشہور شعراء عرب نے سجدہ کیا جس کی بنا پر اس کا قصیدہ خانۂ کعبہ پر آویزاں کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ قرآن اپنی بلاغت وصداقت میں ان چیزوں سے بدرجہا بلند ہے لیکن جو لوگ اس کی قدر و قیمت سے ناآشنا تھے (اور ہیں) وہ اللہ کو سجدہ کرنے کے بجائے اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ (تدبر قرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البروج (85)

آیت نمبر (1 تا 10)

ترکیب

(آیت۔4) یہ ہم بتا چکے ہیں کہ فعل ماضی میں دعا کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:72، نوٹ۔2) یہاں قُتِلَ ماضی مجہول کا بھی دونوں طرح ترجمہ ہوسکتا ہے۔ ہم دعائیہ ترجمہ کریں گے۔ (آیت۔5) اَلنَّارِ کی جر بتا رہی ہے کہ اس سے پہلے اس کا مضاف اَصۡحٰبُ محذوف ہے۔ یہ مرکب اضافی اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ کا بدل ہے، جبکہ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ صفت ہے اَلنَّارِ کی ہے۔ (آیت۔6) عَلَیۡهَا میں هَا کی ضمیر اُخۡدُوۡدِ کے لیے بھی ہوسکتی ہے۔ اور اَلنَّارِ کے لیے بھی۔ (آیت۔7) وَهُمۡ عَلٰی میں واو حالیہ ہے۔

ترجمہ

وَالسَّمَآءِ	ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ۙ﴿۱﴾	وَالۡیَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ۙ﴿۲﴾	وَشَاهِدٍ
قسم ہے آسمان کی	جو (سیاروں کی) منزلوں والا ہے	اور قسم ہے وعدہ کیے ہوئے دن کی	اور قسم ہے حاضر ہونے والے کی

وَّمَشۡهُوۡدٍ ؕ﴿۳﴾	قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ﴿۴﴾	النَّارِ	ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ﴿۵﴾
اور قسم ہے معائنہ کیے جانے والے کی	مارے جائیں خندقوں والے	اُس آگ (والے) جو	ایندھن والی ہے

اِذۡ هُمۡ عَلَیۡهَا	قُعُوۡدٌ ۙ﴿۶﴾	وَّهُمۡ	عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ	بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ
جب وہ لوگ ان (خندقوں) پر	بیٹھنے والے تھے	اس حال میں کہ وہ	اس پر جو وہ لوگ کرتے تھے	ایمان لانے والوں کے ساتھ

شُهُوْدٌ ۝۷	وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ	اِلَّآ اَنْ	يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ	الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۸
حاضر رہنے والے ہوتے تھے	اوران لوگوں نے سزانہیں دی ان کو	سوائے اس (بات) کے کہ	وہ لوگ ایمان لائے اللہ پر	جو بالا دست ہے حمد کیا ہوا ہے

الَّذِيْ لَهٗ	مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ	وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	شَهِيْدٌ ۝۹
وہ جس کے لیے ہی	زمین اور آسمانوں کی بادشاہت ہے	اور اللہ ہر چیز پر	موجود رہنے والا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا	الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ	ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا
یقیناً جن لوگوں نے مشکل میں ڈالا	ایمان لانے والوں کو اور ایمان لانے والیوں کو	پھر توبہ (بھی) نہیں کی

فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ	وَلَهُمْ	عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝۱۰
تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے	اور ان کے لیے ہی	شعلے کا عذاب ہے

نوٹ: 1

اس آیت۔1۔میں بروج سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک بڑے بڑے ستارے ہیں۔حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے۔بعض مفسرین نے بروج سے مراد قصور یعنی محلات لیے ہیں اور اس سے مراد وہ مقامات ہیں جو آسمان میں پہرے داروں اور نگراں فرشتوں کے لیے مقرر ہیں۔بعض متاخرین (بعد میں آنے والے) نے اس سے مراد وہ بروج بتلائے ہیں جو فلاسفہ کی اصطلاح ہے، جس میں کل آسمان کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کو ایک برج کہا جاتا ہے۔ان کا خیال یہ ہے کہ ثابت ستارے انہی برجوں میں اپنی اپنی جگہ مقیم ہیں۔اور سیارے حرکت فلک کے ساتھ متحرک ہوتے ہیں۔اور ان برجوں میں سیاروں کا نزول ہوتا ہے۔مگر یہ سراسر غلط ہے۔قرآن کریم سیاروں کو آسمانوں میں مرکوز نہیں قرار دیتا بلکہ سیارے کو اپنی ذاتی حرکت سے متحرک قرار دیتا ہے۔جیسا کہ سورۂ یٰسین میں ہے وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (اور وہ سب کے سب فلک میں تیرتے ہیں) فلک سے مراد یہاں آسمان نہیں بلکہ سیارے کا مدار ہے جس میں وہ حرکت کرتا ہے۔(معارف القرآن)

نوٹ: 2

اصحاب الاخدود سے کون مراد ہیں؟ مفسرین نے کئی واقعات نقل کیے ہیں۔لیکن صحیح مسلم، جامع ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں جو قصہ مذکور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے زمانے میں کوئی کافر بادشاہ تھا۔اس کے ہاں ایک ساحر رہتا تھا۔جب اس کی موت کا وقت قریب ہوا تو اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ایک ہوشیار اور ہونہار لڑکا مجھے دیا جائے تو میں اپنا علم اس کو سکھا دوں تا کہ میرے بعد یہ علم مٹ نہ جائے۔چنانچہ ایک لڑکا تجویز کیا گیا جو روزانہ ساحر کے پاس جا کر اس کا علم سیکھتا تھا۔راستہ میں ایک عیسائی راہب رہتا تھا جو اس وقت کے دین حق پہ تھا۔لڑکا اس کے پاس بھی آنے جانے لگا۔اور خفیہ طور پر راہب کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔اور اس کے فیض صحبت سے ولایت و کرامت کے درجے کو پہنچا۔ایک روز لڑکے نے دیکھا کہ کسی بڑے جانور (شیر وغیرہ) نے راستہ روک رکھا ہے جس کی وجہ سے مخلوق پریشان ہے۔اس نے ایک پتھر ہاتھ میں لے کر دعا کی کہ اے اللہ اگر راہب کا دین سچا ہے تو یہ جانور میرے ہاتھ سے مارا جائے۔یہ کہہ کر پتھر پھینکا جس سے اس جانور کا کام تمام ہو گیا۔لوگوں میں شور ہوا کہ اس لڑکے کو عجیب علم آتا ہے۔کسی اندھے نے سن کر درخوست کی کہ میری آنکھیں اچھی کر دو۔لڑکے نے کہا کہ اچھی کرنے والا میں نہیں۔وہ اللہ ہے۔اگر تو اس پر ایمان لے آئے تو میں دعا کروں۔امید ہے وہ تجھے بینا کر دے گا۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔یہ خبریں بادشاہ کو پہنچیں۔اس نے برہم ہو کر لڑکے کو مع راہب اور اندھے کے طلب کر لیا۔اور کچھ بحث کے بعد راہب اور اندھے کو قتل کر دیا۔لڑکے کے لیے حکم دیا کہ اس کو اونچے پہاڑ پر سے گرا کر ہلاک کر دیا جائے۔مگر خدا کی قدرت سے جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا واپس آ گیا۔پھر بادشاہ نے اسے دریا میں غرق کرنے کا حکم دیا۔وہاں بھی یہی ہوا کہ لڑکا بچ کر آ گیا اور جو گئے تھے وہ دریا میں ڈوب گئے۔آخر لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ میں خود اپنے مرنے کی ترکیب بتاتا ہوں۔آپ سب لوگوں کو ایک میدان میں جمع کریں۔ان

کے سامنے مجھ کو سولی پر لٹکائیں۔ اور یہ لفظ کہہ کر مجھے تیر ماریں ''بسم اللہ رب الغلام'' بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا اپنے رب کے نام پر قربان ہو گیا۔ یہ عجیب واقعہ دیکھ کر لوگوں کی زبان سے ایک نعرہ بلند ہوا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْغُلَامِ۔ لوگوں نے بادشاہ سے کہا کہ جس چیز کی روک تھام کر رہے تھے وہی پیش آئی۔ پہلے تو کئی ایک دو مسلمان ہوتا تھا لیکن اب خلق کثیر نے اسلام قبول کر لیا۔ بادشاہ نے غصے میں آ کر بڑی بڑی خندقیں کھدوائیں اور ان کو آگ سے بھروا کر اعلان کیا کہ جو شخص اسلام سے نہ پھرے گا اس کو ان خندقوں میں جھونک دیا جائے گا۔ لوگ آگ میں ڈالے جا رہے تھے لیکن اسلام سے نہیں ہٹتے تھے۔ بادشاہ اور اس کے وزیر و مشیر خندقوں کے آس پاس بیٹھے ہوئے مسلمانوں کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

یہ بادشاہ جس کا ذکر اس قصہ میں ہے ملک یمن کا بادشاہ تھا جس کا نام حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یوسف ذونواس تھا۔ اس کا زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے ستر سال پہلے کا زمانہ تھا۔ اور یہ لڑکا جس کو ساحر کے پاس اس فن سیکھنے کے لیے بادشاہ نے مامور کیا تھا، اس کا نام عبداللہ بن تامر تھا۔ محمد بن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ یہ لڑکا جس جگہ مدفون تھا وہ جگہ کسی ضرورت سے حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں کھودی گئی تو اس میں عبداللہ بن تامر کی لاش صحیح سالم اس طرح برآمد ہوئی کہ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کا ہاتھ اس جگہ پر رکھا ہوا تھا، جہاں تیر لگا تھا۔ کسی نے ان کا ہاتھ اس جگہ سے ہٹایا تو زخم سے خون جاری ہو گیا۔ پھر ویسے ہی رکھ دیا تو بند ہو گیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس پر لکھا ہوا تھا اَللّٰہُ رَبِّیْ۔ (ابن کثیر)۔ ابن ابی حاتم کے حوالے سے ابن کثیرؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آگ کی خندق کا واقعہ دنیا میں ایک ہی نہیں، بلکہ بہت ملکوں اور زمانوں میں ہوئے ہیں۔ پھر ابن ابی حاتم نے ان میں سے تین کا خصوصیت سے ذکر کیا کہ ایک خندق یمن میں تھی، دوسری شام میں اور تیسری فارس میں تھی۔ مگر قرآن کریم نے جس خندق کا ذکر اس سورت میں کیا ہے وہ ملک یمن کی خندق ہے کیونکہ یہی عرب کے ملک میں تھی۔ (معارف القرآن، ص ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ سے ماخوذ)

آیت نمبر (11 تا 22)

ترکیب

(آیت۔ 11) اَلْفَوْزُ الْکَبِیْرُ مرکب توصیفی ہے۔ لیکن یہ ذٰلِکَ کا مُشَارٌ اِلَیْہِ نہیں ہے، بلکہ یہ اس کی خبر معرفہ ہے اور اس سے پہلے ضمیر فاصل ھُوَ محذوف ہے۔ پورا جملہ اس طرح ہے ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْکَبِیْرُ۔ (آیت۔ 15) اَلْمَجِیْدُ کی رفع بتا رہی ہے کہ نہ تو یہ اَلْعَرْشِ کی صفت ہے اور نہ ہی ذُوْ کا مضاف الیہ ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں یہ حالت جر میں اَلْمَجِیْدِ آتا ہے۔ اس کی رفع سے معلوم ہوا کہ یہ وَھُوَ الْغَفُوْرُ کے مبتدا ھُوَ پر عطف ہے یا یوں کہہ لیں کہ اس سے پہلے اس کا مبتدا ھُوَ محذوف ہے۔ (آیت۔ 16) فَعَّالٌ سے پہلے بھی اس کا مبتدا ھُوَ محذوف ہے۔ (آیت۔ 17) حَدِیْثُ کا مضاف الیہ اَلْجُنُوْدِ ہے، لیکن یہ آگے فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ کا مضاف نہیں ہو سکتا کیونکہ مضاف پر لام تعریف نہیں آتا۔ نیز یہ کہ فِرْعَوْنَ اور ثَمُوْدَ دونوں غیر منصرف ہیں۔ اس لیے ان کی یہ حالت نصب بھی ہو سکتی ہے اور حالت جر بھی۔ لیکن یہاں ان کے نصب میں ہونے کی کوئی وجہ یا قرینہ یا قیاس موجود نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں یہ دونوں حالت جر میں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں بھی حَدِیْثُ کا مضاف الیہ ہیں۔ اس طرح یہ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ کا بدل بعض ہیں۔

ترجمہ 2004

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا	وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	لَهُمۡ جَنّٰتٌ	تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا
بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے	اور انہوں نے عمل کیے نیکیوں کے	ان کے لیے ہی ایسے باغات ہیں	بہتی ہیں جن کے نیچے سے

الۡاَنۡهٰرُ ؕ	ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡكَبِیۡرُ ؕ﴿۱۱﴾	اِنَّ بَطۡشَ رَبِّكَ	لَشَدِیۡدٌ ؕ﴿۱۲﴾
نہریں	یہ ہی سب سے بڑی کامیابی ہے	بیشک آپؐ کے رب کی گرفت	یقیناً بڑی سخت ہے

اِنَّهٗ هُوَ	یُبۡدِئُ	وَیُعِیۡدُ ۚ﴿۱۳﴾	وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ	الۡوَدُوۡدُ ۙ﴿۱۴﴾
حقیقت تو یہ ہے کہ	وہ (ہی) ابتدا کرتا ہے	اور وہ (ہی) لوٹائے گا	اور وہ ہی بے انتہا بخشنے والا	انتہائی خیر خواہ ہے

ذُو الۡعَرۡشِ	الۡمَجِیۡدُ ۙ﴿۱۵﴾	فَعَّالٌ	لِّمَا	یُرِیۡدُ ؕ﴿۱۶﴾	هَلۡ اَتٰىكَ
جو عرش کا مالک ہے	وہ ہی عظیم الشان ہے	وہ کر گزرنے والا ہے	اس کا جس کا	وہ ارادہ کرتا ہے	کیا پہنچی آپؐ کے پاس

حَدِیۡثُ الۡجُنُوۡدِ ۙ﴿۱۷﴾	فِرۡعَوۡنَ وَثَمُوۡدَ ؕ﴿۱۸﴾	بَلِ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا	فِیۡ تَكۡذِیۡبٍ ۙ﴿۱۹﴾
لشکروں کی بات	(جیسے) فرعون اور ثمود کی (بات)	بلکہ جنہوں نے انکار کیا وہ لوگ	جھٹلانے میں (پڑے ہوئے) ہیں

وَّاللّٰهُ	مِنۡ وَّرَآئِهِمۡ	مُّحِیۡطٌ ۚ﴿۲۰﴾	بَلۡ هُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِیۡدٌ ۙ﴿۲۱﴾
درآنحالیکہ اللہ	ان کے پیچھے سے (ان کو)	گھیرنے والا ہے	بلکہ وہ ایک ایسا عظیم الشان قرآن ہے جو

فِیۡ لَوۡحٍ	مَّحۡفُوۡظٍ ﴿۲۲﴾ ع
ایک ایسی تختی میں (لکھا ہوا) ہے جو	محفوظ کی ہوئی ہے

نوٹ: 1 اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کے بعد سابقہ آیات میں کافروں کو جو دھمکیاں دی گئی ہیں، ان کو مزید موکد اور مدلل کرنے کے لیے آیات۔12 تا16۔ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کچھ مزید صفات کی یاددہانی کرائی ہے۔ اور ان دھمکیوں کو حقیقی ثابت کرنے کے لیے آیات۔17۔18۔ میں تاریخی حقائق کی طرف اشارہ فرما دیا۔ پھر ان میں سے قوم ثمود اور فرعون کا ذکر خاص اہتمام سے فرمایا ہے۔ قریش کے لیڈروں پر ان دونوں قوموں کی عظمت وشوکت کی بڑی دھاک تھی۔ ان کی طرف اشارہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھ لو، جب خدا نے ان کو پکڑا تو چشم زدن میں وہ صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ (تدبر قرآن، ص ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ سے ماخوذ)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الطارق (86)

آیت نمبر (1 تا 17)

د	ف	ق

(ن) دُفُوۡقًا پانی کا اُبل کر گرنا۔ اچھل کر بہنا۔

دَافِقٌ اسم الفاعل ہے۔اچھل کر بہنے والا۔زیر مطالعہ آیت۔6۔ 2004

ھ ز ل

(ن۔س) هَزْلًا لاغر و کمزور ہونا۔

(ض) هَزْلًا مذاق ٹھٹھا کرنا۔بے نتیجہ یا لاحاصل بات کرنا۔

هَزْلٌ اسم صفت بھی ہے۔کمزور۔لاحاصل۔بے نتیجہ۔(جب یہ قول کی صفت کے طور پر آئے تو کمزور بات کا مطلب ہے ایسی بات جس کی کوئی سند یا دلیل نہ ہو اور لاحاصل بات کا مطلب ہے ایسی بات جس کا اچھا یا برا کوئی بھی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو۔(زیر مطالعہ آیت۔14)

ترکیب

(آیت۔4) اس آیت میں اِنْ کو اِنْ مخففہ بھی مانا گیا ہے اور اِنْ نافیہ بھی۔جو لوگ اسے اِنْ مخففہ مانتے ہیں وہ لَمَّا کو لَمَا (میم بغیر تشدید کے پڑھتے ہیں) اور لام کو اِنَّ کی خبر پر آنے والا لام تاکید مانتے ہیں اور مَا کو زائدہ مانتے ہیں۔اور جو لوگ اسے اِنْ نافیہ مانتے ہیں وہ لَمَّا کو اِلَّا کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ہم اِنْ نافیہ کے طور پر ترجمہ کریں گے۔(آیت۔8) اِنَّهٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جبکہ رَجْعِهٖ میں ہٖ کی ضمیر اَلْاِنْسَانُ کے لیے ہے۔(آیت۔13۔14) اِنَّهٗ میں هٗ اور مَا هُوَ میں هُوَ، یہ دونوں ضمیریں قرآن مجید کے لیے ہیں۔فَصْلٌ اور اَلْهَزْلِ، یہ دونوں قولٌ کی صفت ہیں۔اَلْهَزْلِ سے پہلے اَلْقَوْلِ محذوف ہے۔یعنی پورا جملہ یوں ہے وَمَا هُوَ بِالْقَوْلِ الْهَزْلِ۔لَقَوْلٌ فَصْلٌ مرکب توصیفی بن کر اِنَّ کی خبر ہے جبکہ (بِالْقَوْلِ) الْهَزْلِ مرکب توصیفی پھر مرکب جاری بن کر مَا نافیہ کی خبر ہے۔اور یہ دونوں خبریں قرآن کے متعلق ہیں۔(آیت۔17) مَهِّلْ باب تفعیل کا فعل امر ہے جس میں کام کو تدریجاً اور تسلسل سے کرنے کا مفہوم ہوتا ہے۔اس لیے اس کا مطلب ہے تُو ڈھیل دیتا رہ۔جبکہ باب افعال میں تدریج اور تسلسل کا مفہوم نہیں ہوتا۔اس لیے اس کے فعل امر اَمْهِلْ کا مطلب ہے تُو مہلت دے۔

ترجمہ

وَالسَّمَآءِ	وَالطَّارِقِ ۝۱	وَمَآ اَدْرٰىكَ	مَا الطَّارِقُ ۝۲
قسم ہے آسمان کی	اور قسم ہے رات میں آنے والے کی	اور کیا سمجھا تو نے	کیا ہے رات میں آنے والا

النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝۳	اِنْ كُلُّ نَفْسٍ	لَّمَّا	عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝۴	فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ
وہ چمکنے والا تارا ہے	نہیں ہے کوئی بھی جان	مگر نہ ہو	(کہ) اس پر ہے کوئی نگرانی کرنے والا	پس چاہیے کہ غور کرے انسان

مِمَّ خُلِقَ ۝۵	خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝۶	يَّخْرُجُ	مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝۷
کس چیز سے اس کو پیدا کیا گیا	وہ پیدا کیا گیا اچھل کر بہنے والے پانی سے	جو نکلتا ہے	پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے

اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ	لَقَادِرٌ ۝۸	يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝۹	فَمَا لَهٗ	مِنْ قُوَّةٍ
بیشک وہ اس کی واپسی پر	یقیناً قدرت رکھنے والا ہے	جس دن جانچا جائے گا بھیدوں کو	تو نہیں ہوگی اس کے لیے	کوئی بھی قوت

وَّلَا نَاصِرٍ ۝۱۰	وَالسَّمَآءِ	ذَاتِ الرَّجْعِ ۝۱۱	وَالْاَرْضِ	ذَاتِ الصَّدْعِ ۝۱۲
اور نہ کوئی بھی مدد کرنے والا	قسم ہے آسمان کی	جو بارش والا ہے	اور قسم ہے زمین کی	جو دراڑ والی ہے

اِنَّهٗ	لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾	وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾	اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ	كَيْدًا ﴿۱۵﴾
بیشک یہ (قرآن)	یقیناً ایک فیصلہ کن بات ہے	اور یہ لاحاصل (بات) نہیں ہے	بیشک یہ لوگ چالبازی کرتے ہیں	جیسے چالبازی کرنے کا حق ہے

وَّاَكِيْدُ	كَيْدًا ﴿۱۶﴾	فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ	اَمْهِلْهُمْ	رُوَيْدًا ﴿۱۷﴾
اور میں خفیہ تدبیر کروں گا	جیسے تدبیر کرتے ہیں	تو آپؐ ڈھیل دیتے رہیں کافروں کو	(یعنی) آپؐ مہلت دیں ان کو	غیر محسوس طریقہ سے

نوٹ:1

آیت۔4۔ میں حافظ سے مراد فرشتے ہیں جو ہر آدمی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس کو بلاؤں سے بچاتے ہیں اور اس کے عمل لکھتے ہیں۔ اس کے لیے ستاروں کی قسم کھانے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ جس نے آسمان پر ستاروں کی حفاظت کے لیے سامان کیے ہیں، اس کو زمین پر تمہاری اور تمہارے اعمال کی حفاظت کرنا کیا دشوار ہے۔ نیز جس طرح آسمان پر ستارے ہر وقت محفوظ ہیں مگر ان کا ظہور شب میں ہوتا ہے، اسی طرح سارے اعمال نامۂ اعمال میں اس وقت بھی محفوظ ہیں مگر ان کا ظہور قیامت میں ہوگا۔ اس لیئے انسان کو قیامت کی فکر کرنا چاہیے اور اگر وہ اس کی بعید از قیاس سمجھتا ہے تو اس کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے بنا ہے۔ نطفہ سے انسان بنا دینا زیادہ عجیب ہے بہ نسبت دوبارہ بنانے کے۔ جب یہ عجیب بات اللہ کے حکم سے واقع ہو رہی ہے تو جائز نہیں کہ اس سے کم عجیب بات کے وقوع کا انکار کیا جائے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر مومن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تین سو ساٹھ فرشتے اس کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں جو انسان کے ہر ہر عضو کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان میں سے سات فرشتے صرف انسان کی آنکھ کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں۔ یہ فرشتے انسان سے ہر ایسی لا و مصیبت جو اس کے لیے مقدر نہیں، اس طرح دور کرتے ہیں جیسے شہد کے برتن پر آنے والی مکھیوں کو پنکھے وغیرہ سے دور کیا جاتا ہے۔ (معارف القرآن)

نوٹ:2

آیات۔13۔14۔ کا مطلب یہ کہ یہ قرآن اور جو کچھ وہ قیامت کے متعلق بیان کرتا ہے، کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں ہے بلکہ حق و باطل کا دو ٹوک فیصلہ ہے۔ اس سے پہلے آیات۔ 11۔12۔ کی قسم کو اس بات سے یہ مناسبت ہوئی کہ قرآن آسمان سے آتا ہے اور جس میں قابلیت (یعنی حق کی طلب۔ مرتب) ہو اسے مالا مال کر دیتا ہے جیسے بارش آسمان سے آتی ہے اور عمدہ زمین کو فیضیاب کرتی ہے۔ نیز قیامت میں ایک غیبی بارش ہوگی جس سے مردے زندہ ہو جائیں گے جیسے یہاں بارش سے مردہ زمین سرسبز ہو کر لہلہانے لگتی ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:3

آیت۔17۔ میں کافروں کو مہلت دینے کی وجہ سے مفسرین نے یہ بتائی ہے کہ یہ لوگ اللہ سے بچ کر کہیں جا تو سکتے نہیں، اس لیے ان کو مہلت دو تا کہ یہ لوگ جو کرنا چاہتے ہیں وہ کر لیں اور ان پر اتمام حجت ہو جائے۔ آخر کار اللہ نے ان کو پکڑنا تو ہے ہی، لیکن میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی کافروں کو ڈھیل دیتے رہنے کی ہدایت کو جب ہم عمومیت پر رکھ کر سوچتے ہیں تو اس ہدایت میں ہمیں اپنی رہنمائی کے کچھ اور پہلو بھی سمجھ میں آتے ہیں۔

اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر عقیدے اور مذہب کے مجرمین، اور ہر نوعیت کے مجرمین کو تا حیات مہلت ملی ہوئی ہے، اِلاَّ مَا شَاءَ اللّٰہ یہ بات اصولی طور پر بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کمرۂ امتحان میں طالب علم جب اپنا پرچہ حل کر رہے ہوتے ہیں تو کوئی طالب علم خواہ کتنا بھی غلط جواب لکھ رہا ہو، اس پر کوئی نہ روک ٹوک ہوتی ہے نہ کوئی گرفت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت ختم ہونے کی گھنٹی بجنے کے بعد جب اس سے کاپی لے لی جائے گی تب دیکھا جائے گا کہ اس نے کیا صحیح لکھا ہے اور کیا غلط۔ پھر اسی لحاظ سے اس کو نمبر ملیں گے۔

اس لیے گھنٹی بجنے تک ہر طالب علم کو مہلت ملی ہوئی ہے اور اسے آزادی (ڈھیل) بھی حاصل ہے کہ جو چاہے جواب لکھے۔ اس مہلت اور ڈھیل کا ایک مثبت پہلو بھی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ غلط جواب لکھتے ہوئے طالب علم کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور بھولا ہوا سبق یاد آ جاتا ہے تو وہ غلط جواب کاٹ کر اس کو اس کی جگہ صحیح جواب لکھ دیتا ہے۔ یہ سہولت اسے اس لیے حاصل ہوئی کہ گھنٹی بجنے سے پہلے پہلے اس پر کوئی روک ٹوک اور گرفت نہیں تھی۔

اسی طرح یہ دنیا ہماری زندگی کا کمرۂ امتحان ہے۔ موت کی گھنٹی بجنے تک ہماری مہلت ہے اور کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنے کی آزادی (ڈھیل) بھی ہم کو حاصل ہے۔ ہم کو یہ ڈھیل بھی حاصل ہے کہ جب چاہیں اپنا کوئی فیصلہ منسوخ کر کے اس کی جگہ کوئی نیا فیصلہ کر لیں۔ اس مہلت اور ڈھیل کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر خود اپنی اصلاح کرنے کا جو میکنزم رکھا ہے، اسے کام کرنے کا پورا پورا موقع ملے۔

البتہ ایک فرق ہے۔ طالب علم کے کمرۂ امتحان میں اس کے کچھ لکھنے یا نہ لکھنے کے فیصلے میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں ہوتی۔ لیکن زندگی کے اس کمرۂ امتحان میں انسان پر کوئی مشکل، کوئی مصیبت آتی رہتی ہے جو کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس طرح مداخلت ہوئی لیکن مہلت اور ڈھیل کی طرح یہ مداخلت بھی انسان کے حق میں مفید ہے۔ انسان کے اندر اپنی اصلاح کرنے کے میکنزم کی بیٹری کبھی اتنی ڈاؤن ہو جاتی ہے کہ وہ سلف اسٹارٹ نہیں رہتی، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق اس بیٹری میں ابھی اتنی جان باقی ہوتی ہے کہ وہ دھکا اسٹارٹ ہو سکتی ہے، اُس وقت کسی مشکل یا کسی مصیبت کی شکل میں دھکا لگایا جاتا ہے تاکہ انسان اگر چاہے تو اس کی مدد سے اپنی اصلاح کرنے کی بیٹری کو اسٹارٹ کر لے۔ کچھ لوگ اس دھکے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کچھ لوگ اس موقع کو بھی ضائع کر دیتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے دھکوں سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد اہل ایمان میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ یہاں مجرمین کی بات ہو رہی ہے اس لیے انہیں کی مشکلات اور مصائب کو یہاں دھکا کہا گیا ہے۔ صالحین، صدیقین اور انبیاء کرام کی مشکلات اور مصائب کی حکمتیں اور مصلحتیں کچھ اور ہیں جن کی وضاحت کا یہ موقعہ نہیں ہے۔

اس ڈھیل دینے اور مہلت دینے کی ہدایت میں ان لوگوں کے لیے بڑی اہم رہنمائی ہے جو کسی کی تربیت کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، جیسے والدین، اساتذہ، افسران، وغیرہ۔ اس رہنمائی کے اہم مدارج کو سورۂ تغابن کی آیت۔14۔ میں مزید کھولا گیا ہے۔ وہاں پر قرآن کے الفاظ یہ ہیں۔ وَاِنْ تَعْفُوْا (اور اگر تم لوگ ڈھیل دو) وَتَصْفَحُوْا (اور دیکھی اَن دیکھی کر جاؤ) وَتَغْفِرُوْا (اور معاف کرو) فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ ان دونوں مقامات پر غور کرنے سے ہمیں قرآن مجید کا وہ فارمولا مل جاتا ہے جو انسانوں کو عموماً اور اہل ایمان کو خصوصاً اپنے جونیئرز کی تربیت کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اس فارمولے کی وضاحت ''جینے کا سلیقہ'' حصہ سوم کے صفحہ 74 تا 86 پر کی گئی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں پر اس کا خلاصہ دینا بھی ممکن نہیں ہے۔ البتہ اس میں دی گئی مثال کو ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس سے فارمولا کسی حد تک واضح ہو جائے گا۔

ہم ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے جب ہمیں سینما دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ والد مرحوم سے اجازت مانگی تو نہیں ملی۔ ہم نے والدہ مرحومہ اور دیگر لوگوں سے سفارش کروائی، رونا دھونا بھی کیا، اسکول کا ہوم ورک کرنے کی ہڑتال کی، دو تین وقت کی بھوک ہڑتال بھی کی۔ یہ سب کچھ کرنے کی ہمیں اجازت ملی یعنی ان حرکتوں پر نہ تو ہماری پٹائی ہوئی اور نہ ڈانٹ پڑی لیکن سینما دیکھنے کی اجازت پھر بھی نہیں ملی۔

چنانچہ ہم نے چوری چھپے سینما دیکھنے کا فیصلہ کرلیا لیکن اس میں کچھ قباحتوں سے سابقہ پڑا۔ پہلی قباحت یہ تھی کہ اس طرح شوق پورا کرنا ناممکن تھا کیونکہ ہماری خواہش تھی کہ شہر میں جو بھی پکچر لگے وہ سب دیکھی جائے، لیکن اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ جب کسی پکچر کی بہت تعریف سنتے تھے تب اسے دیکھنے کا پروگرام بناتے تھے۔ شام کو کھیلنے کا جو وقت تھا، اس سے پہلے گھر سے نکلنے کے لیے اور مغرب سے پہلے واپس نہ آنے کے لیے کوئی بہانا گھڑنا پڑتا تھا۔ سینما ہال کے باہر اور اندھر دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کوئی جاننے والا دیکھ نہ لے، وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال اس طرح چوری چھپے پکچر دیکھ کر جب ہم بخیریت گھر واپس آجاتے تھے تو سکھ کا سانس لیتے تھے۔

کچھ عرصہ میں ایک نئی فکر لاحق ہوگئی کہ پتہ نہیں ہماری اس چوری کا والد صاحب کو علم ہے کہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر واپس آکر جو ہم سکھ کا سانس لیتے تھے وہ رخصت ہوا۔ اب رات اس ادھیڑ بن میں گزرتی تھی کہ اگر والا صاحب کو پتہ ہے تو وہ اجازت ہی کیوں نہیں دے دیتے۔ اگر نہیں معلوم اور کبھی معلوم ہو گیا تو پھر کیا ہوگا۔ جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ تو گناہ بے لذت ہے۔ پکچر دیکھ کر گناہ بھی کرتے ہیں اور واپس آکر پریشانی بھی مول لیتے ہیں۔ چنانچہ فیصلہ کرلیا کہ اب پکچر نہیں دیکھیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملازمت کے سلسلہ میں جب دوسرے شہروں میں تنہا رہنے کا موقع ملا، اس وقت تک سینما دیکھنے کا شوق مرجھا چکا تھا۔ احباب کے اصرار پر کبھی کبھار چلے جاتے تھے لیکن کچھ عرصہ بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا ہے۔

اس رام کہانی کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ دیکھی اَن دیکھی کر جانے کا اثر ہوتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اتنی جلدی نہ ہو اور اتنا واضح نہ ہو۔ اس لیے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے اور اس ہدایت کو اثر کرنے کا موقع دینا چاہیے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الاعلیٰ (78)

آیت نمبر (1 تا 19)

ترکیب

(آیت۔1) اَلۡاَعۡلَی پر رفع، نصب، جر ظاہر نہیں ہوتی۔ اس لیے گرامر کے لحاظ سے یہ ممکن ہے کہ اس کو حالت نصب میں مانا جائے تو یہ اسم کی صفت ہوگا اور اگر حالت جر میں مانیں تو یہ رَبِّ کی صفت ہوگا۔ لیکن مضمون کے لحاظ سے مناسب یہی ہے کہ اس کو رَبِّ کی صفت مانا جائے۔ (آیت۔2۔3) خَلَقَ۔ سَوّٰی۔ قَدَّرَ۔ ھَدٰی۔ اِن افعال کے مفعول محذوف ہیں۔ اس لیے مفہوم میں وسعت پیدا ہوئی اور یہاں ساری مخلوق مراد ہے، جس میں فرشتے، جن وانس، حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ سب شامل ہو گئے۔ (حافظ احمد یار صاحب)۔ (آیت۔8) یَسَّرَ، باب تفعیل، میں جس چیز کو آسان کرتے ہیں وہ مفعول بنفسہٖ آتا ہے اور جس کے لیے آسان کرتے ہیں اس پر لام کا صلہ آتا ہے۔ یہاں نُیَسِّرُ کا مفعول ضمیر مفعول لَکَ ہے۔ ترجمہ اسی لحاظ سے ہوگا۔ یُسۡرٰی صفت ہے۔ اس کا موصوف یہاں محذوف ہے۔ (آیت۔9) ذِکۡرٰی فاعل ہے اور مؤنث ہے اس لیے اس کا فعل نَفَعَتۡ واحد مؤنث ہے۔ (آیت۔11) یَتَجَنَّبُ کی ضمیر مفعولی ھَا۔ اَلذِّکۡرٰی کے لیے ہے۔

ترجمہ

سَبِّحِ	اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ۙ﴿۱﴾	الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۙ﴿۲﴾	وَالَّذِیۡ
آپ تسبیح کریں	اپنے اعلیٰ رب کے نام کی	وہ، جس نے پیدا کیا پھر اس نے نوک پلک درست کی (اس کی)	اور وہ جس نے

قَدَّرَ	فَهَدٰى ۝٣	وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝٤	فَجَعَلَهٗ	غُثَآءً اَحْوٰى ۝٥
قدر و قیمت اور قدرت طے کی (اس کی)	پھر اس نے راہ سجھائی (اس کو)	وہ جس نے نکالا چارا	پھر اس نے کر دیا اس کو	سیاہ کوڑا

سَنُقْرِئُكَ	فَلَا تَنْسٰٓى ۝٦	اِلَّا مَا	شَآءَ اللّٰهُ ؕ	اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ
ہم پڑھائیں گے آپ کو	تو آپ نہیں بھولیں گے	سوائے اس کے جو	چاہا اللہ نے	بیشک وہ جانتا ہے نمایاں کرنے کو

وَمَا يَخْفٰى ۝٧	وَنُيَسِّرُكَ	لِلْيُسْرٰى ۝٨	فَذَكِّرْ	اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝٩
اور اس کو جو پوشیدہ ہوتا ہے	اور ہم آسان کریں گے (پہنچائیں گے) آپ کو	اُس آسان (طریقت) تک	تو آپ نصیحت کریں	اگر نفع دے یہ بڑی نصیحت

سَيَذَّكَّرُ مَنْ	يَّخْشٰى ۝١٠	وَيَتَجَنَّبُهَا	الْاَشْقَى ۝١١	الَّذِيْ يَصْلَى
نصیحت حاصل کرے گا (اس سے) وہ، جو	ڈرتا ہے	اور اجتناب کرے گا اس سے	بڑا بد بخت	وہ، جو گرے گا

النَّارَ الْكُبْرٰى ۝١٢	ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا	وَلَا يَحْيٰى ؕ ۝١٣	قَدْ اَفْلَحَ مَنْ	تَزَكّٰى ۝١٤
بڑی آگ میں	پھر نہ وہ مرے گا اس میں	اور نہ جیے گا	اس نے مراد پالی ہے جس نے	پاکیزگی حاصل کی

وَذَكَرَ	اسْمَ رَبِّهٖ	فَصَلّٰى ؕ ۝١٥	بَلْ تُؤْثِرُوْنَ	الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝١٦ ۖ	وَالْاٰخِرَةُ
اور اس نے یاد رکھا	اپنے رب کے نام کو	پھر نماز پڑھی	بلکہ تم لوگ ترجیح دیتے ہو	اس دنیوی زندگی کو	اس حال میں کہ آخرت

خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ ۝١٧	اِنَّ هٰذَا	لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝١٨ ۙ	صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝١٩ ع
بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے	بیشک یہ (بات)	یقیناً پہلے صحیفوں میں ہے	ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں

نوٹ: 1

لفظ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ان تمام باتوں سے پاک اور برتر قرار دینا جو اس کی اعلیٰ شان کے منافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور ہی تمام علم و معرفت اور قوت و اعتماد کا سرچشمہ ہے۔ اگر اس میں کوئی خلل پیدا ہو جائے تو انسان صحیح معرفت کی شاہراہ سے ہٹ جاتا ہے۔ اور شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ تسبیح کی سب سے اعلیٰ شکل تو نماز ہے لیکن جس طرح سانس انسان کی مادی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی یاد اس کی روحانی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے۔ اس لیے صرف نماز کے اوقات ہی میں نہیں بلکہ زندگی کی دوسری سرگرمیوں کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل کو آباد رکھنا چاہیے تاکہ شیطان کو اس پر غلبہ پانے کا موقع نہ ملے (تدبر قرآن)

آگے آیات۔ 2 تا 5 میں رَبِّ اَعْلٰی کی صفات کا ذکر ہے جو تخلیق کائنات میں اس کی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ کے مشاہدہ سے متعلق ہیں۔ خلق کے معنی محض صنعت گری کے نہیں بلکہ عدم سے وجود میں لانا بھی ہے۔ دوسری صفت فَسَوّٰی ہے۔ برابر کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز کو جو وجود عطاء فرمایا ہے اس میں اس کی جسامت، شکل وصورت اور اعضاء وغیرہ کی وضع قطع میں ایک خاص تناسب ملحوظ رکھا ہے۔ تیسری چیز سلسلہ میں فرمائی قَدَّرَ، جس کے معنی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور خاص تجویز کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی چیزوں کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا بلکہ ہر چیز کو کسی خاص کام کے لیے پیدا کیا اور اس کے مناسب اس کو وسائل دیئے اور اسی کام میں اس کو لگا دیا۔ غور کیا جائے تو یہ بات کسی خاص جنس یا نوع مخلوق کے لیے مخصوص نہیں۔ ساری کائنات کی مخلوقات ایسی ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے خاص خاص کاموں کے

لیے بنایا ہے اور ہر چیز اپنے رب کی مقرر کردہ ڈیوٹی میں لگی ہوئی ہے۔ چوتھی چیز فرمائی فَهَدٰى ۔یعنی خالق کائنات نے ہر چیز کو جس کام کے لیے پیدا فرمایا اس کو اس کی ہدایت بھی فرمادی کہ وہ کس طرح اس کام کو انجام دے۔ یہ ہدایت تمام کائنات کی مخلوقات کو شامل ہے۔ کیونکہ ایک خاص قسم کی عقل وشعور اللہ تعالیٰ نے ان سب کو دیا ہے، گو وہ انسان کے عقل وشعور سے کم ہو۔

انسان کو حق تعالیٰ نے عقل وشعور سب سے زیادہ عطا فرمایا ہے۔ اور زمین میں پیدا ہونے والی اشیاء انسان کی خدمت اور اس کے نفع کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ مگر ان سے فائدہ اٹھانا مختلف قسم کے منافع حاصل کرنا اور مختلف چیزوں کو جوڑ کر ایک نئی چیز پیدا کر لینا، بڑے علم وہنر کا تقاضہ کرتا ہے۔ قدرت نے انسان کے اندر فطری طور پر عقل وفہم ودیعت کر رکھا ہے۔ اور یہ علم وہنر فلاسفہ کی تحقیقات اور کالجوں کی تعلیمات پر موقوف نہیں، بلکہ دنیا کی ابتدا سے اَن پڑھ جاہل یہ سب کام کرتے ہیں۔ یہی فطری سائنس ہے جو حق تعالیٰ نے انسان کو فطرتاً بخشی ہے۔ پھر فنی اور علمی تحقیقات کے ذریعہ اس میں ترقی کرنے کی استعداد بھی اسی قدرت ربانی کا عطیہ ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ سائنس کسی چیز کو پیدا نہیں کرتی، بلکہ قدرت کی پیدا کردہ اشیاء کا استعمال سکھاتی ہے۔ اس استعمال کا ادنیٰ درجہ تو حق تعالیٰ نے انسان کو فطرۃً سکھا دیا۔ آگے اس میں فنی تحقیقات اور ترقی کا بڑا وسیع میدان رکھا ہے اور انسان کی فطرت میں اس کو سمجھنے کی استعداد وصلاحیت رکھی ہے جس کے مظاہر اس سائنسی دور میں نت نئے سامنے آرہے ہیں اور معلوم نہیں آگے اس سے زیادہ کیا کیا سامنے آئے گا۔ غور کرو تو یہ سب قرآن کے ایک لفظ فَهَدٰى کی شرح ہے (معارف القرآن)

نوٹ:2

آیت نمبر۔6۔ کے یہ الفاظ کہ ''ہم تمہیں پڑھوا دیں گے پھر تم نہیں بھولو گے'' یہ بتاتے ہیں کہ یہ سورہ اس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ ﷺ کو ابھی وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق نہیں ہوئی تھی اور نزول وحی کے وقت آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں اس کے الفاظ بھول نہ جائیں۔ اس آیت کے ساتھ سورۂ طٰہٰ کی آیت 114۔ اور سورۂ قیامہ کی آیات۔16 تا19۔ کو ملا کر دیکھا جائے تو واقعات کی ترتیب معلوم ہوتی ہے کہ سب سے پہلے اس سورہ میں حضورؐ کو اطمینان دلا دیا گیا کہ ہم یہ کلام آپ کو پڑھوا دیں گے اور آپؐ اسے نہ بھولیں گے۔ پھر ایک مدت کے بعد جب سورہ قیامہ نازل ہو رہی تھی تو حضور ﷺ بے اختیار وحی کے الفاظ کو دہرانے لگے۔ اس وقت فرمایا گیا کہ وحی کو جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کو یاد کرا دینا، پڑھوا دینا پھر اس کا مطلب سمجھا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ آخری مرتبہ سورۂ طٰہٰ کے نزول کے موقعہ پر آپؐ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ یہ 113۔ آیتیں جو متواتر نازل ہو رہی ہیں ان میں سے کچھ میرے حافظے سے نکل نہ جائے اور آپؐ ان کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے اس پر فرمایا گیا کہ قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کریں جب تک آپؐ کی طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ اس کے بعد پھر کبھی اس کی نوبت نہیں آئی۔ (تفہیم القرآن۔ ج6۔ص۔308)

آگے فرمایا گیا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ۔ اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پورے قرآن کا لفظ بلفظ آپؐ کے حافظے میں محفوظ ہو جانا آپؐ کی اپنی قوت کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ اللہ کے فضل اور اس کی توفیق کا نتیجہ ہے، ورنہ اللہ چاہے تو اسے بھلا سکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی وقتی طور پر آپؐ کو نسیان لاحق ہو جانا اور آپؐ کا کسی آیت یا لفظ کو کسی وقت بھول جانا اس وعدے سے مستثنیٰ ہے۔ وعدہ جس بات کا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپؐ مستقل طور پر قرآن کے کسی لفظ کو نہیں بھول جائیں گے۔ اس مفہوم کی تائید بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے رسول اللہؐ قرأت کے دوران میں ایک آیت چھوڑ گئے۔ نماز کے بعد حضرت اُبی بن کعبؓ نے پوچھا کہ کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں میں بھول گیا تھا۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

آیت۔8۔کالفظی ترجمہ یہ ہے کہ ہم آپؐ کوطریقہ یُسْرٰی کے لیے آسان کردیں گے۔اس مقام کا تقاضہ یہ تھا کہ فرمایا جاتا ہے کہ ہم اس طریقہ اور شریعت کو آپؐ کے لیے آسان کردیں گے لیکن قرآن کریم نے اس کو چھوڑ کر یہ فرمایا کہ ہم آپؐ کو اس طریقہ کے لیے آسان کردیں گے۔اس میں یہ بتادینا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو طبعی طور پر اور مادی طور پر ایسا بنادیں گے کہ شریعت آپ کی طبعیت بن جائے اور آپؐ شریعت کے سانچے میں ڈھل جائیں۔(معارف القرآن)

عام طور پر مفسرین نے ان دو فقروں (آیات۔8۔9) کو الگ الگ سمجھا ہے۔لیکن ہمارے نزدیک فَذَكِّرْ کا لفظ دونوں فقروں کو باہم مربوط کرتا ہے۔اور بعد کے فقروں کا مضمون پہلے فقرے کے مضمون پر مرتب ہوتا ہے۔اس لیے ہم اس ارشاد الٰہی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اے نبیؐ ہم تبلیغ دین کے معاملہ میں آپؐ کو کسی مشکل میں ڈالنا چاہتے کہ تم بہروں کو سناؤ اور اندھوں کو راہ دکھاؤ بلکہ ایک آسان طریقہ تمہارے لیے میسر کیے دیتے ہیں اور وہ یہ نصیحت کرو جہاں تمہیں یہ محسوس ہو کہ کوئی اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے۔اب رہی یہ بات کہ کون فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے،تو ظاہر ہے کہ اس کا پتہ تبلیغ عام ہی سے چل سکتا ہے۔اس لیے عام تبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے مگر اس سے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ ان لوگوں کو تلاش کرو جو اس سے فائدہ اٹھا کر راہ راست اختیار کرنا چاہیں۔انہی کی تعلیم و تربیت پر توجہ صرف کرنا چاہیے۔

نوٹ:4

آیت۔13۔کا مطلب ہے کہ نہ اسے موت ہی آئے گی کہ عذاب سے چھوٹ جائے اور نہ جینے کی طرح جیئے گا کہ زندگی کا کوئی لطف اسے حاصل ہو۔یہ سزا ان لوگوں کے لیے ہے جو سرے سے اللہ اور اس کے رسول کی نصیحت کو قبول نہ کریں اور مرتے دم تک کفر و شرک یا دہریت پر قائم رہیں۔رہے وہ لوگ جو دل میں ایمان رکھتے ہوں مگر اپنے برے اعمال کی بنا پر جہنم میں ڈالے جائیں تو ان کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ جب وہ اپنی سزا بھگت لیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں موت دے گا۔پھر ان کے حق میں شفاعت قبول کی جائے گی اور ان کی جلی ہوئی لاشیں جنت کی نہروں پر لا کر ڈالی جائیں گی اور اہل جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی ڈالو اس پانی سے وہ اس طرح جی اٹھیں گے جیسے نباتات پانی پڑنے سے اُگ آتی ہیں۔(تفہیم القرآن)

نوٹ:5

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے دوسرے متعدد نبیوں کے صحیفے اسفارِ تورات کی شکل میں موجود ہیں۔ان میں اگرچہ بہت سی تحریفیں ہو چکی ہیں اور ان کی حیثیت تاریخ کی کتابوں سے زیادہ نہیں ہے،تاہم ان سب میں توحید اور قیامت کی تعلیم نہایت واضح اور مؤثر الفاظ میں اتنی کثرت سے موجود ہے کہ جس صحیفے کو بھی پڑھیے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو جو تعلیم دی تھی،اگرچہ وہ صحیفے کی شکل میں نہیں تھی بلکہ زبانی تعلیم و تلقین کی صورت میں تھی۔ان کی ذریت کی ایک شاخ یعنی بنی اسرائیل نے اس کو اپنے صحیفوں میں بشکل تحریر محفوظ کیا اور ان کے انبیاؑ اپنے اپنے دور میں برابر اس کی یاددہانی کرتے رہے،جس کی ناقابل تردید شہادت آج بھی ان کے صحیفوں میں موجود ہے۔اور قرآن نے بھی جابجا اس کا حوالہ دیا ہے۔آپؑ کی ذریت کی دوسری شاخ بنی۔اسمٰعیل نے اس کو تحریری شکل میں محفوظ نہیں کیا۔انہوں نے روایات کی صورت میں اس کو کچھ مدت تک باقی رکھا پھر اس پر رفتہ رفتہ ذہول کا پردہ پڑ گیا۔پھر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے اس کی تجدید اور تکمیل ہوئی۔(تدبر قرآن)

2004

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الغاشیۃ (88)

آیت نمبر (1 تا 16)

ترکیب

(آیت۔2۔3) وُجُوۡہٌ حالانکہ نکرہ ہے لیکن یہاں یہ مبتدا ہے۔ مفہوم کی ادائیگی کے تقاضے کے تحت اس کو معرفہ کے بجائے نکرہ لایا گیا ہے۔ خَاشِعَةٌ کی خبر ہے۔ آگے عَامِلَةٌ اور نَاصِبَةٌ کو بھی اگر اس کی خبر مانیں تو مفہوم بنتا ہے کہ کچھ چہرے اس دن عاجزی کرنے والے ہیں، عمل کرنے والے ہیں، محنت کرنے والے ہیں یہ مفہوم خلاف واقعہ ہے۔ اور اگر عَامِلَةٌ اور نَاصِبَةٌ کو وُجُوۡہٌ کی صفت مانیں تو پھر مفہوم بنتا ہے کہ کچھ عمل کرنے والے محنت کرنے والے چہرے اس دن عاجزی کرنے والے ہیں۔ اور یہی مفہوم حضرت عمرؓ سے منقول ہے۔ (دیکھیں معارف القرآن)۔ (آیت۔4۔5) تَصۡلٰی اور تُسۡقٰی واحد مؤنث کے صیغے ہیں۔ وُجُوۡہٌ جمع مکسر ہے، اس لیے لفظی رعایت کے تحت واحد مؤنث صیغے آئے ہیں۔ تُسۡقٰی، ثلاثی مجرد اور باب افعال، دونوں کا مجہول ہوسکتا ہے کیونکہ دونوں کے مضارع مجہول ہم شکل ہوجاتے ہیں۔ اگر ثلاثی مجرد سے مانیں تو مطلب ہوگا، ان کو پلایا جائے گا۔ اگر باب افعال سے مانیں تو مطلب ہوگا انہیں پینے کو دیا جائے گا۔ (آیت۔6) وُجُوۡہٌ کی لفظی رعایت کے تحت لَیۡسَ لَھَا آنا چاہیے تھا لیکن یہاں معنوی رعایت کی گئی ہے اس لیے لَھُمۡ آیا ہے۔ (آیت۔11) لَاغِیَةً اسم الفاعل کے وزن پر صفت ہے۔ اس کا موصوف محذوف ہے جو کَلِمَةً ہوسکتا ہے۔ (آیت۔12 تا 16) اِن آیات میں عَیۡنٌ جَارِیَةٌ۔ سُرُرٌ مَّرۡفُوۡعَةٌ۔ اَکۡوَابٌ مَّوۡضُوۡعَةٌ۔ نَمَارِقُ مَصۡفُوۡفَةٌ۔ زَرَابِیُّ مَبۡثُوۡثَةٌ۔ یہ سب مبتدا مؤخر نکرہ ہیں اور ان کی خبریں محذوف ہیں۔ آیت۔12۔13۔ میں متعلق خبر فِیۡھَا آیا ہے۔ آگے اس کو محذوف کردیا گیا ہے۔

ترجمہ

هَلۡ اَتٰىكَ	حَدِیۡثُ الۡغَاشِیَةِ ۘ﴿۱﴾	وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ	خَاشِعَةٌ ۙ﴿۲﴾
کیا پہنچی آپؐ کے پاس	اُس چھا جانے والی (قیامت) کی بات	کچھ چہرے (کچھ لوگ) اُس دن	عاجزی کرنے والے ہیں

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۙ﴿۳﴾	تَصۡلٰی نَارًا حَامِیَةً ۙ﴿۴﴾	تُسۡقٰی	مِنۡ عَیۡنٍ اٰنِیَةٍ ؕ﴿۵﴾
جو عمل کرنے والے محنت کرنے والے تھے	وہ گریں گے ایک دہکنے والی آگ میں	انھیں پینے کو دیا جائے گا	ایک انتہائی (گرم) چشمے سے

لَیۡسَ لَهُمۡ طَعَامٌ	اِلَّا مِنۡ ضَرِیۡعٍ ۙ﴿۶﴾	لَّا یُسۡمِنُ	وَلَا یُغۡنِیۡ	مِنۡ جُوۡعٍ ؕ﴿۷﴾
نہیں ہوگا ان کے لیے کوئی کھانا	مگر ایک خاردار درخت سے	وہ موٹا نہیں کرے گا	اور نہ وہ بے نیاز کرے گا	بھوک سے

وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ	نَّاعِمَةٌ ۙ﴿۸﴾	لِّسَعۡیِهَا	رَاضِیَةٌ ۙ﴿۹﴾
کچھ چہرے (لوگ) اُس دن	تروتازہ ہونے والے ہیں	اپنی کوشش (کے نتیجے) سے	راضی ہونے والے ہیں

فِیۡ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ۙ﴿۱۰﴾	لَّا تَسۡمَعُ فِیۡهَا	لَاغِیَةً ؕ﴿۱۱﴾	فِیۡهَا عَیۡنٌ جَارِیَةٌ ؕ﴿۱۲﴾
(وہ لوگ ہوں گے) ایک اعلیٰ باغ میں	وہ نہیں سنیں گے اس میں	کوئی لایعنی (بات)	اس میں جاری ہونے والے چشمے میں

فِیۡهَا سُرُرٌ مَّرۡفُوۡعَةٌ ۙ﴿۱۳﴾	وَّاَکۡوَابٌ مَّوۡضُوۡعَةٌ ۙ﴿۱۴﴾	وَّنَمَارِقُ مَصۡفُوۡفَةٌ ۙ﴿۱۵﴾	وَّزَرَابِیُّ مَبۡثُوۡثَةٌ ؕ﴿۱۶﴾
اس میں بلند کیے ہوئے تخت ہیں	اور چنے ہوئے جام ہیں	اور قطار بنائے ہوئے قالین ہیں	اور بکھیرے ہوئے گاؤ تکیے ہیں

نوٹ:1

پہلی آیت میں سوال ہے کیا آپ ﷺ کو پہنچی۔اس انداز میں جو سوال ہوتا ہے وہ جواب طلب کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ کسی چیز کی ہیبت یا اس کی عظمت کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔آگے وُجُوْہٌ سے مراد اگرچہ افراد ہیں لیکن ان کو تعبیر وُجُوْہٌ سے اس لیے کیا ہے کہ ان کی اندرونی کیفیات کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔اور کیفیات کا اظہار سب سے زیادہ نمایاں طریقہ پر چہروں ہی سے ہوتا ہے۔(تدبر قرآن)

نوٹ:2

آیت۔2۔3 میں کافروں کے چہرے کا ایک حال یہ بتایا ہے کہ وہ خاشعہ ہوں گے۔خشوع کے معنے جھکنے اور ذلیل ہونے کے ہیں۔نماز میں خشوع کا یہی مطلب ہے کہ اللہ کے سامنے جھکنے اور ذلت وپستی کے آثار اپنے وجود پر طاری کرے۔جن لوگوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع اختیار نہیں کیا،ان کو اس کی سزا قیامت میں یہ ملے گی کہ وہاں ان کے چہروں پر ذلت اور رسوائی چھائی ہوئی ہوگی۔ان کے چہروں کا دوسرا اور تیسرا حال یہ بیان فرمایا کہ عاملہ اور ناصبہ ہوں گے کفار ومجرمین کا یہ حال کہ وہ عمل اور محنت سے تھکے اور درماندہ ہوں گے،ظاہر ہے کہ ان کی دنیا کا ہے۔کیونکہ آخرت میں کوئی اور محنت نہیں ہے۔اسی لیے قرطبی وغیرہ مفسرین نے اس کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ خاشعہ کا حال تو آخرت میں ہوگا،جبکہ عاملہ اور ناصبہ کے دونوں حال ان لوگوں کے دنیا ہی میں ہوتے ہیں۔بہت سے کفار اور فجار مشرکانہ عبادت اور باطل طریقوں سے مجاہدہ اور ریاضت دنیا میں کرتے رہتے ہیں۔ہندوؤں کے جوگی اور نصاریٰ کے راہب وغیرہ کے علاوہ بہت سے ایسے بھی ہیں جو اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی کی رضا جوئی کے لیے دنیا میں عبادت وریاضت کرتے ہیں اور اس میں محنت شاقہ برداشت کرتے ہیں مگر وہ عبادات مشرکانہ اور باطل طریقہ پر ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی اجر وثواب نہیں رکھتی۔(عبدالدینار اور عبدالدرہم قسم کے لوگ بھی عبادت میں نہیں بلکہ دنیا میں اپنی روزی کمانے کے لیے اللہ پر توکل اور قناعت کرنے والوں سے کئی گنا زیادہ محنت ومشقت کرتے ہیں،چاہے نماز پڑھتے ہوں،چاہے روزے رکھتے ہوں۔اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ ان کے نماز روزے انھیں خاشعہ سے بچالیں گے،لیکن عاملہ ناصبہ کی سزا تو نقد ہے۔یہ لوگ دنیا تو خوب کماتے ہیں لیکن دنیا کے حقیقی لطف وسرور سے بلعموم محروم چلے جاتے ہیں۔اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ۔مرتب)۔

حضرت حسن بصریؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ جب ملک شام میں تشریف لے گئے تو ایک نصرانی راہب ان کے پاس آیا جو اپنے مذہب کی عبادت وریاضت میں لگا ہوا تھا۔محنت سے اس کا چہرہ بگڑا ہوا،بدن خشک اور لباس خستہ تھا۔جب حضرت عمرؓ نے اس کو دیکھا تو آپ رو پڑے۔لوگوں نے سبب پوچھا تو آپؓ نے فرمایا کہ مجھے اس کے حال پر رحم آگیا کہ اس بیچارے نے رضائے الٰہی کے لیے بڑی محنت کی مگر وہ اس کو نہیں پاسکا۔اور حضرت عمرؓ نے یہی آیات۔2۔3۔تلاوت فرمائیں۔(معارف القرآن)

نوٹ:3

قرآن مجید میں کہیں فرمایا گیا ہے کہ جہنم کے لوگوں کو زقوم کھانے کے لیے دیا جائے گا۔کہیں ارشاد ہوا ہے کہ ان کے لیے غسلین کے سوا کوئی کھانا نہیں ہوگا۔اور یہاں فرمایا جارہا ہے کہ انھیں خاردار سوکھی گھاس کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ان بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ان کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جہنم کے بہت سے درجے ہوں گے جن میں مختلف قسم کے مجرمین اپنے جرائم کے لحاظ سے ڈالے جائیں گے اور مختلف قسم کے عذاب ان کو دیئے جائیں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ زقوم کھانے سے بچنا چاہیں گے تو غسلین ان کو ملے گا اس سے بھی بچنا چاہیں گے تو خاردار گھاس کے سوا کچھ نہ پائیں گے۔(تفہیم القرآن)

نوٹ:4

اہل دوزخ کے متعلق قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ دوزخ کے باڑے میں پہنچتے ہی وہ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے کہ فلاں نے ہم کو گمراہ کیا۔وہ گمراہ نہ کرتا تو ہم ہدایت پر ہوتے۔لیڈروں اور ان کی پیروی کرنے والوں میں تو تکار ہوگی۔اپنے اپنے پیروں اور لیڈروں کے لیے وہ لوگ دونے عذاب کا مطالبہ کریں گے۔لیڈر جواب دیں گے کہ تم نے خود اپنی شامت بلائی کہ جان بوجھ کر ہماری پیروی

کی۔اس کے برعکس اہل جنت کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہونے کے بعد ایک فتح مند ٹیم کی طرح ایک دوسرے کا خیر مقدم تحیت و سلام سے کریں گے۔آپس میں مبارکہ سلامت کے تبادلے ہوں گے۔نہایت خوشگوار موڈ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھیں گے اور ان کی مجلس محبت واخلاص کی عطر بیزیوں سے معمور ہوگی۔(تدبر قرآن)

آیت نمبر (17 تا 26)

س ط ح

(ف) سَطَحًا بچھانا۔ہموار کرنا۔زیر مطالعہ آیت۔20۔

ترکیب

(آیات۔17۔تا20) میں تمام افعال واحد مونث آئے ہیں۔اس کی وجہ سمجھ لیں۔اَلْاِبِلِ اسم جنس ہے جس میں تمام اونٹ اور اونٹنیاں شامل ہیں۔اس طرح یہ اسم جمع کے حکم میں ہے جس کے لیے فعل واحد مذکر یا واحد مونث، دونوں میں سے کسی طرح لانا جائز ہوتا ہے۔(دیکھیں آسان عربی گرامر، حصہ دوم، پیراگراف: ۴:۳۱) اَلسَّمَآءِ اور اَلْاَرْضِ، دونوں مؤنث سماعی ہیں، جبکہ اَلْجِبَالِ غیر عاقل کی جمع مکسر ہے اَلسَّمَآءِ اور اَلْجِبَالِ پر لام جنس ہے جبکہ اَلْاَرْضِ پر لام تعریف ہے۔(آیت۔23) اِلَّا سے استثناء کا تعلق سابقہ آیت میں مُصَيْطِرٍ سے نہیں ہے بلکہ اس سے بھی پہلے کی آیت میں فَذَكِّرْ سے ہے۔مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ نصیحت کرتے رہیں سوائے اس کے جو منہ موڑے اور انکار کرے، کیونکہ آپ نصیحت کرنے والے ہیں، داروغہ نہیں ہیں۔

ترجمہ

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ	كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾	وَاِلَى السَّمَآءِ	كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾
تو کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اونٹوں کی طرف	(کہ) کیسا اس کو بنایا گیا	اور آسمانوں کی طرف	(کہ) کیسا ان کو بلند کیا گیا

وَاِلَى الْجِبَالِ	كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾	وَاِلَى الْاَرْضِ	كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾
اور پہاڑوں کی طرف	(کہ) کیسا ان کو گاڑا کیا	اور اس زمین کی طرف	(کہ) کیسا اس کو بچھایا گیا

فَذَكِّرْ ﴿۲۱﴾	اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۲﴾	لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۳﴾
تو آپ نصیحت کرتے رہیں	آپ تو بس نصیحت کرنے والے ہیں	اُن پر کوئی داروغہ نہیں ہیں

اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ﴿۲۴﴾	فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ
(اس لیے نصیحت کرتے ہیں) سوائے اس کے جس نے منہ موڑا اور (سننے سے ہی) انکار کیا	تو ان کو عذاب دے گا اللہ

الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾	اِنَّ اِلَيْنَآ	اِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾	ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا	حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾
وہ بڑا (دوزخ کا) عذاب	یقیناً ہماری طرف ہی	ان کی واپسی ہے	پھر یقیناً ہم پر ہی ہے	ان سے حساب لینا

نوٹ: 1

آیات۔17 تا20 کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ آخرت کی باتیں سن کر کہتے ہیں کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوسکتا ہے تو کیا اپنے گردوپیش کی دنیا پر نظر ڈال کر انہوں نے کبھی نہ سوچا کہ یہ اونٹ کیسے بن گئے۔آسمان کیسے بلند ہوگیا۔پہاڑ کیسے قائم ہوگئے، زمین کیسے بچھ گئی۔یہ ساری چیزیں اگر بن سکتی ہیں اور بنی بنائی ان کے سامنے موجود ہیں تو آخرت میں ایک دوسری دنیا کیوں نہیں بن سکتی۔جنت اور دوزخ کیوں نہیں ہو سکتیں۔(تفہیم القرآن)

کائنات کی بے شمار چیزوں میں سے ان چار چیزوں کی تخصیص بقول ابن کثیرؒ اس لیے ہے کہ عرب کے لوگ اکثر جنگلوں میں چلتے پھرتے تھے۔اس وقت ان کے سامنے یہی چار چیزیں ہوتی تھیں۔سواری میں اونٹ،اوپر آسمان، نیچے زمین اوراردگرد پہاڑ۔اس لیے ان ہی علامات میں غور کرنے کے لیے ارشاد ہوا۔(ترجمہ شیخ الہندؒ)

ان میں سے دونشانیاں،اونٹ اورزمین،ربوبیت کے پہلو سے اور دونشانیاں،آسمان اور پہاڑ،خالق کی قدرت وحکمت کے پہلو سے زیادہ نمایاں ہیں۔خالق کی انہی صفات پر قیامت اور جزاء وسزا کے پورے پہلو کی بنیاد ہے۔(تدبر قرآن)

نوٹ:2

جانوروں میں اونٹ کی کچھ ایسی خصوصیات بھی ہیں جو غور کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت وقدرت کا آئینہ بن سکتی ہیں۔اول تو عرب میں ڈیل ڈول کے اعتبار سے سب سے بڑا جانور اونٹ ہی ہے،ہاتھی وہاں ہوتا نہیں۔دوسرے اللہ تعالیٰ نے اس عظیم جانور کو ایسا بنا دیا کہ عرب کے بدو اور مفلس آدمی بھی اتنے بڑے جانور کو پالنے اور رکھنے میں کوئی مشکل محسوس نہ کریں، کیونکہ اس کو چھوڑ دیں تو یہ اپنا پیٹ خود بھر لیتا ہے۔ اونچے درختوں کے پتے توڑنے کی زحمت بھی آپ کو نہیں کرنا پڑتی یہ خود درختوں کی شاخیں کھا کر گزارہ کر لیتا ہے۔اس کی خوراک ہاتھی اور دوسرے جانوروں کی طرح نہیں جو بہت مہنگی پڑتی ہے۔عرب میں پانی ایک بہت کمیاب چیز ہے، ہر جگہ ہر وقت نہیں ملتا۔قدرت نے اس کے پیٹ میں ایک ریزرو ٹنکی ایسی لگا دی ہے کہ سات آٹھ روز کا پانی وہ اس ٹنکی میں محفوظ کر لیتا ہے اور تدریجی رفتار سے وہ اپنی پانی کی ضرورت کو پورا کرتا رہتا ہے۔اتنے اونچے جانور پر سوار ہونے کے لیے سیڑھی لگانی پڑتی مگر قدرت نے اس کے پاؤں کو تین تہہ میں تقسیم کر دیا یعنی ہر پاؤں میں دو گھٹنے بنا دیئے، جسے وہ طے کر کے بیٹھ جاتا ہے تو اس پر چڑھنا اور اترنا آسان ہو جاتا ہے۔محنت کش اتنا کہ سب جانوروں سے زیادہ بوجھ اٹھا لیتا ہے۔عرب کے میدانوں میں دھوپ کی وجہ سے دن کا سفر سخت مشکل ہے۔قدرت نے اس کو رات بھر چلنے کا عادی بنا دیا۔مسکین طبع ایسا ہے کہ ایک بچی اس کی مہار پکڑ کر جہاں چاہے لے جائے۔اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات میں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت بالغہ کا سبق دیتی ہیں۔(معارف القرآن)

یہ واحد جانور ہے کہ اس کو بیٹھا کر اس کی پیٹھ پر بوجھ لادیں، پھر اس کو کھڑا کریں تو یہ بوجھ سمیت اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔کسی دوسرے جانور میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ پیٹھ پر بوجھ لاد کر بیٹھے سے اٹھ کھڑا ہو۔کہتے ہیں کہ کسی شخص نے اپنی ایک دانا بزرگ کو بتایا کہ میں نے ایک ایسا جانور دیکھا ہے جو بوجھ لاد کر اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے۔تو بزرگ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو اس کی گردن ضرور لمبی ہوگی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اونٹ کی گردن بوجھ اٹھانے کے لیے لیور کا کام دیتی ہے۔(حافظ احمد یار صاحب)

نوٹ:3

اب آیت۔21۔اور اس سے آگے نبی ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ جو لوگ آپ ﷺ کے انذار کو جھٹلا رہے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں جھٹلا رہے ہیں کہ اس انذار کے حق میں دلائل نہیں ہیں۔دلائل تو آسمان سے لے کر زمین تک چپہ چپہ پر ہیں لیکن ان سے فائدہ ہی اٹھاتے ہیں کہ جن کے اندر خشیت ہوتی ہے۔رہے وہ لوگ جن کے دلوں پر قساوت چھا چکی ہے وہ ان نشانیوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔اس لیے آپ ﷺ ان کے ردوقبول سے بے نیاز ہو کر اپنی تذکیر و تبلیغ ہی ہے۔آپ ﷺ پر یہ ذمہ داری نہیں ہے آپ ان کے دلوں میں ایمان اتار ہی دیں۔ اللہ نے آپ کو یاددہانی کرنے والا بنا کر بھیجا ہے،ان کے ایمان نہ لانے کی پرسش آپ ﷺ سے ہو(تدبر قرآن)

2004

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الفجر (89)

آیت نمبر (1 تا 14)

ترکیب

(آیت۔2) لَیَالٍ دراصل لَیَالِیٌ ہے جو قاعدہ کے مطابق تبدیل ہو کر لَیَالٍ لکھی جاتی ہے۔ (آیت۔4) یَسۡرِ مادہ ''ی س ر'' سے نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ اس کا ماضی ہوتا تو یَسَرَ یا یَسُرَ ہوتا یَیۡسِرُ یا یَیۡسُرُ ہوتا، کیونکہ یہ باب ضَرَبَ اور کَرُمَ دونوں سے آتا ہے۔ یہاں یَسۡرِ میں سین پر علامت سکون اور را کی کسرہ بتا رہی ہے کہ یہ مادہ ''س ری'' کا مضارع یَسۡرِیُ ہے، جس کی یا گری ہوئی ہے۔(آیت۔7) قبیلہ عاد دو تھے۔عادِ اولیٰ کا دوسرا نام اِرَمُ (غیر منصرف) ہے۔ یہاں یہ عَادٍ کے بدل کے طور پر آیا ہے اس لیے اِرَمَ حالت جَر میں ہے۔ذَاتِ الۡعِمَادِ اِرَمَ کی صفت ہے اس لیے ذَاتِ حالت جر میں آیا ہے۔اور عَادٍ ایک قبیلہ ہے اس لیے ذَاتِ مؤنث کا صیغہ آیا۔(آیت۔8) لَمۡ یُخۡلَقۡ کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے مِثۡلُهَا میں مِثۡلُ حالت رفع میں آیا ہے۔(آیات۔9۔10) ثَمُوۡدَ اور فِرۡعَوۡنَ، یہ دونوں لِعَادٍ کی بِ پر عطف ہونے کی وجہ سے حالت جَرّ میں ہیں۔(آیت۔11) اَلَّذِیۡنَ جمع کا صیغہ بتا رہا ہے کہ یہ عاد، ثمود اور فرعون تینوں کے لیے ہے۔

ترجمہ

وَالۡفَجۡرِ ۙ﴿۱﴾	وَلَیَالٍ عَشۡرٍ ۙ﴿۲﴾	وَّالشَّفۡعِ	وَالۡوَتۡرِ ۙ﴿۳﴾	وَالَّیۡلِ	اِذَا یَسۡرِ ۚ﴿۴﴾
قسم ہے فجر کی	اور قسم ہے دس راتوں کی	اور قسم ہے جفت کی	اور قسم ہے طاق کی	اور قسم ہے رات کی	جب وہ چلتی (ڈھلتی) ہے

هَلۡ فِیۡ ذٰلِكَ قَسَمٌ	لِّذِیۡ حِجۡرٍ ؕ﴿۵﴾	اَلَمۡ تَرَ	كَیۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ	بِعَادٍ ۙ﴿۶﴾
کیا اس میں کوئی قسم ہے	کسی عقل والے کیلیے	کیا آپؐ نے دیکھا نہیں	(کہ) کیسا کیا آپؐ کے رب نے	عاد کے ساتھ

اِرَمَ	ذَاتِ الۡعِمَادِ ۙ﴿۷﴾	الَّتِیۡ لَمۡ یُخۡلَقۡ	مِثۡلُهَا	فِی الۡبِلَادِ ۙ﴿۸﴾
(یعنی عادِ) ارم کے ساتھ	جو ستونوں والے تھے	وہ، پیدا نہیں کیا گیا	جن کے جیسا	سارے شہروں میں

وَثَمُوۡدَ	الَّذِیۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ	بِالۡوَادِ ۙ﴿۹﴾	وَفِرۡعَوۡنَ	ذِی الۡاَوۡتَادِ ۙ﴿۱۰﴾
اور ثمود کے ساتھ	جنہوں نے تراشیں چٹانیں	اس وادی میں	اور فرعون کے ساتھ	جو میخوں والا تھا

الَّذِیۡنَ طَغَوۡا	فِی الۡبِلَادِ ۙ﴿۱۱﴾	فَاَكۡثَرُوۡا فِیۡهَا	الۡفَسَادَ ۙ﴿۱۲﴾	فَصَبَّ عَلَیۡهِمۡ
وہ لوگ جنہوں نے سرکشی کی	شہروں میں	پھر انہوں نے کثرت دی اُن میں	فساد کو	تو برسایا ان پر

رَبُّكَ سَوۡطَ عَذَابٍ ؕ﴿۱۳﴾	اِنَّ رَبَّكَ	لَبِالۡمِرۡصَادِ ؕ﴿۱۴﴾
آپؐ کے رب نے ایک عذاب کا کوڑا	بیشک آپ کا رب	یقیناً گھات میں ہے

نوٹ: 1

یہاں پانچ چیزوں کی قسم کھا کر اس مضمون کی تاکید کی گئی ہے جو آگے اِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ میں بیان ہوا ہے، یعنی اس دنیا میں تم جو کچھ کر رہے ہو اس پر جزاء و سزا ہونا لازمی اور یقینی ہے۔تمہارا رب تمہارے سب اعمال کی نگرانی میں ہے۔

وہ پانچ چیزیں جن کی قسم کھائی ہے، ان میں پہلی چیز فجر یعنی صبح صادق ہے۔ ہوسکتا ہے اس سے مراد ہر روز کی صبح ہو، کیوں کہ وہ عالم میں ایک انقلاب عظیم لاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ حضرت علیؓ، ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ سے یہی معنی منقول ہے۔ بعض مفسرین نے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ یعنی یوم النحر (خون بہانے کا دن) کی صبح کو اس کی مراد قرار دیا ہے۔ مجاہدؒ و عکرمہؒ کا یہی قول ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی ایک روایت میں یہ قول منقول ہے۔ اس یوم النحر کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دن کے ساتھ ایک رات لگائی ہے جو اسلامی اصول کے مطابق دن سے پہلے ہوتی ہے۔ صرف یوم النحر ایک ایسا دن ہے کہ اس کے ساتھ کوئی رات نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یوم النحر سے پہلے جو رات ہے وہ یوم النحر کی نہیں بلکہ شرعاً یوم العرفہ ہی کی رات قرار دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حج کرنے والا عرفہ کے دن میدان عرفات میں نہ پہنچ سکا لیکن رات کو صبح صادق سے پہلے کسی وقت بھی عرفات میں پہنچ گیا تو اس کا وقوف معتبر اور حج صحیح ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ روز عرفہ کی دو راتیں ہیں اور یوم النحر کی کوئی رات نہیں۔ اس طرح یوم النحر کی صبح ایک خاص شان رکھتی ہے۔

دوسری قسم دس راتوں کی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ، مجاہدؒ، سُدّیؒ، ضحاکؒ، کلبیؒ، ائمہ تفسیر کے نزدیک ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں اس سے مراد ہیں۔ کیونکہ حدیث میں ان کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ دس راتیں وہ ہی ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے قصے میں آئی ہیں۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ کے لیے بھی یہی دس راتیں ذی الحجہ کی مقرر کی گئی تھیں۔

وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۔ قران کریم کے الفاظ سے یہ متعین نہیں کہ اس جفت اور طاق سے کیا مراد ہے۔ اس لیے اس میں ائمہ تفسیر کے بے شمار اقوال ہیں۔ ایک مرفوع حدیث میں جسے ابوزبیر نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے، یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ کے متعلق فرمایا کہ فجر سے مراد صبح اور عشر سے مراد عشرۂ نحر ہے۔ اور فرمایا کہ وتر سے مراد روز عرفہ اور شفع سے مراد یوم النحر ہے۔ قرطبیؒ نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ اسناد کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے بہ نسبت دوسری حدیث کے جس میں شفع اور وتر نماز کا ذکر ہے۔ اسی لیے حضرت ابن عباسؓ، عکرمہؒ، نحاسؒ نے اسی کو اختیار کیا کہ شفع سے مراد یوم النحر اور وتر سے مراد یوم عرفہ ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۔ يَسْرِ یٔ کی معنے رات کو چلنے کے ہیں۔ یہاں خود رات کو کہا گیا کہ جب وہ چلنے لگے یعنی ختم ہونے لگے۔ یہ پانچ قسمیں ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی دعوت دینے کے لیے فرمایا کہ کیا عقل والے آدمی کے لیے یہ قسمیں کافی ہیں یا نہیں۔ (معارف القرآن ج8۔ص738 تا740 سے ماخوذ)

نوٹ:2

یہاں جو قسمیں کھائی گئی ہیں وہ دعوے پر شہادت کے لیے کھائی گئی ہیں کہ اس کائنات کا مدبر حقیقی اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی باگ ہے۔ وہی جب چاہتا ہے ایک چیز کو نمودار کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اس کو اوجھل کر دیتا ہے۔ وہ جس کو جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک دیتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اپنی مقرر کردہ حد سے آگے بڑھے یا اس کے اختیار میں مداخلت کر سکے (تدبر قرآن۔ج9۔ص346)

ان اضداد سے پہلی دلیل تو قرآن نے توحید پر قائم کی ہے۔ (جیسا کہ اوپر وضاحت کی گئی)۔ اور قرآن نے اس سے دوسری دلیل قیامت پر قائم فرمائی ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں یوں ہے کہ اس دنیا میں اس کے خالق نے ہر چیز جوڑے جوڑے پیدا کی ہے۔ اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنی غایت کو پہنچتی ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی حکم اس دنیا پر بھی لگ سکتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ آخرت کو نہ ملایئے تو اس کے اندر ایک ایسا خلارہ جاتا ہے جو آخرت کو مانے بغیر کسی طرح نہیں بھرتا۔ اس میں نیکی اور بدی، عدل اور ظلم میں ہر وقت جو کشمکش برپا ہے اس

کا فطری مطالبہ یہ ہے کہ ایک ایسا روز انصاف آئے جس میں اس کا خالق لوگوں کا محاسبہ کرے۔ پھر اچھے بندوں کو صلہ دے اور بروں کو ان کے کیفرِ کردار کو پہنچا دے۔ تیسری حقیقت یہ واضح فرمائی ہے کہ جس طرح انسان کے مادی وجود کے لیے دن کی روشنی اور حرارت کے ساتھ رات کی تاریکی اور خنکی بھی ضروری ہے، اسی طرح اس کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو تنگی اور فراخی، صحت اور مرض کی آزمائشوں سے گزارا جائے، تاکہ اس کے صبر اور شکر کی تربیت ہو اور وہ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کا مقام حاصل کرنے کا اہل بنے۔ چوتھی حقیقت یہ واضح فرمائی کہ کسی کو، خواہ وہ کتنا ہی زور اور اثر رکھنے والا ہو، خدا کی ڈھیل سے اس گھمنڈ میں نہیں پڑنا چاہیے کہ وہ اس کی گرفت سے باہر ہے۔ جب سورج اور چاند، رات اور دن اس کے کنٹرول سے باہر نہیں تو انسان کی کیا حقیقت ہے کہ وہ خود کو اس کے اقتدار سے باہر سمجھے۔ (تدبر قرآن۔ ج9۔ ص351 تا353)

نوٹ: 3 جزا و سزا پر شب و روز کے نظام سے استدلال کرنے کے بعد آیات۔ 6 تا 14۔ میں انسانی تاریخ سے استدلال کیا گیا ہے۔ تاریخ کی چند معروف قوموں کے طرزِ عمل اور ان کے انجام کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کائنات کسی اندھے بہرے قانون فطرت (Law of Nature) پر نہیں چل رہی ہے بلکہ ایک خدائے حکیم اس کو چلا رہا ہے۔ اس خدا کی خدائی میں صرف ایک وہی قانون کارفرما نہیں ہے جسے تم قانون فطرت کہتے ہو۔ بلکہ ایک قانون اخلاق بھی کارفرما ہے جس کا لازمی تقاضا مکافاتِ عمل اور جزاء و سزا ہے۔ اس قانون کی کارفرمائی کے آثار خود اس دنیا میں بھی بار بار ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ یہاں جن قوموں نے بھی آخرت سے بے فکر ہو کر اپنی زندگی کا نظام چلایا وہ آخر کار مفسد بن کر رہے اور اس کائنات کے رب نے آخر کار عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ انسانی تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ دو باتوں کی واضح شہادت دے رہا ہے۔ ایک یہ کہ آخرت کا انکار ہر قوم کو بگاڑنے اور بالآخر تباہی میں دھکیلنے کا موجب ہوا ہے۔ اس لیے آخرت فی الواقع ایک حقیقت ہے جس سے ٹکرانے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو حقیقت سے ٹکرانے کا ہوا کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جزائے اعمال کسی وقت مکمل طور پر بھی واقع ہونے والی ہے۔ کیونکہ فساد کی آخری حد پر پہنچ کر عذاب کا کوڑا جن لوگوں پر برسا، ان سے پہلے صدیوں تک بہت سے لوگ اس فساد کے بیج بو کر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان پر کوئی عذاب نہیں آیا تھا۔ خدا کے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی وقت ان سب کی بھی باز پرس ہو اور وہ بھی سزا پائیں۔ (تفہیم القرآن)

آیت نمبر (15 تا 30)

ج	م	م

(ن۔ض) جَمْعًا کسی چیز کا کثرت سے جمع ہونا۔ (لازم)
جَمًّا کسی چیز کو کثرت سے جمع کرنا۔ (متعدی)، زیر مطالعہ آیت۔ 20۔

ترکیب (آیت۔ 15۔ 16) اِذَا میں غیر معین وقت کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کو مزید غیر معین کرنے کے لیے اس کے ساتھ مَا کا اضافہ کیا گیا ہے۔ (دیکھیں آیت۔ 2/ البقرۃ: 11، نوٹ۔ 1۔ آیت۔ 2/ البقرۃ: 26، نوٹ۔)۔ (آیت۔ 19۔ 20) تَاْكُلُوْنَ کا مفعول مطلق اَكْلًا ہے اور لَمًّا حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ اسی طرح سے تُحِبُّوْنَ، جو باب افعال سے ہے اس کا مفعول مطلق ثلاثی مجرد سے حُبًّا آیا ہے، جبکہ جَمًّا حال ہے۔ (آیت۔ 22) جَاءَ کا فاعل رَبُّكَ بھی ہے اور اَلْمَلَكُ بھی۔ لیکن صَفًّا صَفًّا صرف اَلْمَلَكُ کا حال ہے اور اس پر لام جنس ہے۔ (آیت۔ 25۔ 26) لَا يُعَذِّبُ اور لَا يُوْثِقُ کا فاعل اَحَدٌ ہے۔ عَذَابَهٗ اور وَثَاقَهٗ کی ضمیریں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ (آیت۔ 28)۔ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً یہ دونوں حال ہیں۔

ترجمہ

2004

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ	اِذَا مَا	ابْتَلٰىهُ	رَبُّهٗ	فَاَكْرَمَهٗ
پس وہ جو ہے انسان	(تو) جب کبھی بھی	آزمائش میں ڈالتا ہے اس کو	اس کا رب	تو وہ عزت دیتا ہے اس کو

وَنَعَّمَهٗ ۙ	فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ	اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾	وَاَمَّآ	اِذَا مَا
اور وہ بتدریج نعمت دیتا ہے اس کو	تو وہ (انسان) کہتا ہے میرے رب نے	مہربانی کی مجھ پر	اور وہ جو ہے	(کہ) جب کبھی بھی

ابْتَلٰىهُ	فَقَدَرَ عَلَيْهِ	رِزْقَهٗ ۙ	فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ
وہ آزمائش میں ڈالتا ہے اس کو	تو وہ اندازہ (تنگی) کرتا ہے اس پر	اس کے رزق کا	تو وہ کہتا ہے میرے رب نے

اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾	كَلَّا بَلْ	لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾
اہانت کی میری	ہرگز نہیں، بلکہ (بات یہ ہے کہ)	تم لوگ مہربانی نہیں کرتے یتیم پر

وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ	عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾	وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ
اور تم لوگ ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے	مسکین کے کھانا (کھلانے) پر	اور تم لوگ کھاتے ہو میت کا مال

اَكْلًا	لَّمًّا ﴿۱۹﴾	وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ	حُبًّا	جَمًّا ﴿۲۰﴾
جیسے کھاتے ہیں	سمیٹتے ہوئے	اور تم لوگ محبت کرتے ہو مال سے	جیسا محبت کرنے کا حق ہے	کثرت سے جمع کرتے ہوئے

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ	دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾	وَّجَآءَ رَبُّكَ	وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾
ہرگز نہیں، جب ہموار کی جائے گی زمین	کوٹ کوٹ کر	اور آئے گا آپ کا رب	اور سارے فرشتے قطار در قطار

وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ	يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ	وَ	اَنّٰى لَهُ
اور (نزدیک) لائی جائے گی اس دن جہنم	(تب) اس دن یاد کرے گا انسان	اس حال میں (کہ)	کہاں ہوگی اس کے لیے

الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾	يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ	لِحَيَاتِيْ ﴿۲۴﴾
وہ بڑی نصیحت	(پھر) وہ کہے گا اے کاش میں نے آگے بھیجا ہوتا	اپنی زندگی کے لیے

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ	عَذَابَهٗٓ	اَحَدٌ ﴿۲۵﴾	وَّلَا يُوْثِقُ
تو اس دن عذاب نہیں دے (سکے) گا	اس (اللہ) کے عذاب (جیسا)	کوئی ایک بھی	اور نہیں جکڑے گا

وَثَاقَهٗٓ	اَحَدٌ ﴿۲۶﴾	يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾	ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ
اس کا (سا) جکڑنا	کوئی ایک بھی	(پھر کہا جائے گا) اے مطمئن ہونے والی جان	تو واپس چل اپنے رب کی طرف

رَاضِيَةً	مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾	فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾	وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾
راضی ہوتے ہوئے (اپنے رب سے)	پسندیدہ ہوتے ہوئے (اپنے رب کی)	پھر تو داخل (شامل) ہو جا میرے بندوں میں	اور تو داخل ہو جا میری جنت میں

نوٹ: 1 آیات۔15۔16 میں انسان سے مراد اصل میں تو کافر انسان ہے۔ مگر مفہوم عام کے اعتبار سے وہ مسلمان بھی اس خطاب میں شریک ہے جو اس جیسے خیال میں مبتلا ہو۔ اور وہ خیال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اس کے رزق میں وسعت سے نوازے تو شیطان اس کو دو باطل خیالات

میں مبتلا کرتا ہے۔ اول یہ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ میری ذاتی صلاحیت، عقل وفہم اور محنت کا نتیجہ ہے جو مجھے ملنا ہی چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ان چیزوں کے اصل ہونے سے وہ سمجھ بیٹھے میں اللہ کے نزدیک بھی مقبول ہوں۔ اسی طرح سے جب کسی انسان پر رزق میں تنگی آئے تو اس کو اللہ کے نزدیک مردود ہونے کی دلیل سمجھے۔ ایسے خیالات کفار ومشرکین میں تو ہوتے ہی ہیں، مگر افسوس ہے کہ آج کل بہت سے مسلمان بھی اس گمراہی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ (معارف القرآن)

اس دنیا میں انسان کو تنگی کی حالت پیش آئے یا فراخی کی، یہ دونوں ہی بطور امتحان پیش آتی ہیں۔ کسی کو فراخی بخشنے سے مقصود اس کے شکر کو جانچنا ہوتا ہے کہ نعمتیں پاکر وہ مغرور بن جاتا ہے یا اپنے رب کا شکرگزار اور اُس کے بندوں کا خدمت گزار بنتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا رزق تنگ کرتا ہے تو اس سے مقصود اس کے صبر کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کے فیصلے پر قانع ومطمئن اور اپنے کردار میں پختہ ثابت ہوتا ہے یا حوصلہ ہار دیتا ہے۔ انسان کے صبر وشکر کی پختگی ہی پر اس کے تمام دین کی پختگی کا انحصار ہے، اس لیے ان دونوں چیزوں کا امتحان برابر ہوتا رہتا ہے۔ جس نے اپنے اندر یہ دونوں صفات پیدا کرلیں، اس کو نفس مطمئنہ کی دولت حاصل ہوگئی اور اسی کو اللہ تعالیٰ کے ہاں رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کی بادشاہی حاصل ہوگی۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:2

آیت۔24۔ میں الفاظ ہیں جَاءَ رَبُّكَ۔ ان کا لفظ ترجمہ ہے ''تیرا رب آئے گا۔'' لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کو ایک تمثیلی انداز بیان ہی سمجھنا ہوگا۔ جس سے یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور اس کی سلطانی کے آثار اس طرح ظاہر ہوں گے جیسے دنیا میں کسی بادشاہ کے تمام لشکروں کی آمد سے وہ رعب طاری نہیں ہوتا جو بادشاہ کے خود دربار میں آجانے سے طاری ہوتا ہے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

آیات۔25۔26 کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دن مجرموں کو ایسی سخت سزا دے گا اور ایسی سخت قید میں رکھے گا کہ کسی دوسرے کی طرف سے اس طرح کی سختی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ ''اس روز نہ مارے گا اس کو سامارنا کوئی، نہ آگ نہ دوزخ کے مؤکل، نہ سانپ بچھو، جو دوزخ میں ہوں گے۔ کیونکہ ان کا مارنا اور دکھ دینا عذاب جسمانی ہے۔ اور حق تعالیٰ کا عذاب اس طور سے ہوگا کہ مجرم کی روح کو حسرت اور ندامت میں گرفتار کردے گا، جو عذاب روحانی ہے، اور ظاہر ہے کہ عذاب روحانی کو عذاب جسمانی سے کیا نسبت۔ نیز نہ باندھے گا اس کا سا باندھنا کوئی۔ کیونکہ دوزخ کے پیادے ہر چند کو دوزخیوں کے گلے میں طوق ڈالیں گے، زنجیروں سے جکڑیں گے اور دوزخ کے دروازے بند کرکے اوپر سے سرپوش رکھ دیں گے لیکن ان کی عقل اور خیال کو بند نہ کرسکیں گے۔ اور عقل وخیال کی عادت ہے کہ بہت سی باتوں کی طرف التفات کرتا ہے اور ان میں سے بعض باتیں دوسری باتوں کے لیے حجاب ہوجاتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ عقل وخیال کو ادھر ادھر جانے سے روک دے گا اور بالکل ہمہ تن دکھ درد ہی کی طرف متوجہ رکھے گا۔ تو ایسی قید بدنی قید سے ہزاروں درجے سخت ہے۔

(ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:4

نفس مطمئن سے مراد انسان ہے جس نے کسی شک وشبہ کے بغیر پورے اطمینان اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اللہ وحدہٗ لاشریک کو اپنا رب اور انبیاء کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین قرار دیا ہے۔ جو عقیدہ اور جو حکم بھی اللہ اور اس کے رسول سے ملا اسے سراسر حق مانا۔ جس چیز سے بھی اللہ کے دین نے منع کیا اسے بادل ناخواستہ نہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ چھوڑا کہ فی الواقع وہ بُری چیز ہے۔ حق پرستی کی راہ میں جس قربانی کی بھی ضرورت پیش کردی۔ جن مشکلات، تکالیف اور مصائب سے بھی اس راہ میں سابقہ پڑا، انہیں پورے سکون قلب کے ساتھ برداشت کیا اور

دوسرے راستوں پر چلنے والوں کو اس دنیا میں جو فوائد منافع اور لذتیں حاصل ہوتی ہیں ان سے محروم رہ جانے پر اسے کوئی حسرت لاحق نہیں ہوئی، بلکہ وہ اس بات پر پوری طرح مطمئن رہا کہ دین حق کی پیروی نے اسے ان گندگیوں سے محفوظ رکھا ہے۔ (تفہیم القران)۔

2004

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البلد (90)

آیت نمبر (1 تا 20)

ك	ب	د

(س) كَبَدًا درد جگر میں مبتلا ہونا۔ تکلیف برداشت کرنا۔

كَبَدٌ اسم ذات ہے۔ سختی، مشقت، زیر مطالعہ آیت۔4۔

ش	ف	هـ

(ف) شَفْهًا ہونٹ پر مارنا۔

شَفَةٌ اسم ذات ہے۔ ہونٹ۔ تثنیہ شَفَتَانِ۔ شَفَتَيْنِ۔ جمع شِفَاهٌ اور شَفَهَاتٌ۔ (یہ دراصل شَفَهَةٌ ہے۔ اہل زبان اس کی ھا گرا کر شَفَةٌ بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جمع میں اس کی ھا واپس آجاتی ہے)۔ زیر مطالعہ آیت۔9

ن	ج	د

(ن) نُجُوْدًا ظاہر ہونا واضح ہونا۔

نَجْدٌ اسم ذات ہے۔ بلند راستہ۔ واضح راستہ۔ زیر مطالعہ آیت۔10۔

س	غ	ب

(س) سَغَبًا وَمَسْغَبَةٌ بھوکا ہونا۔ زیر مطالعہ آیت۔14۔

ء	ص	د

x x ثلاثی مجرد سے فعل نہیں آتا۔

(افعال) اِيْصَادَ دروازہ یا ڈھکن بند کرنا۔

مُؤْصَدٌ اسم المفعول ہے۔ بند کیا ہوا۔ سر بمہر کیا ہوا۔ زیر مطالعہ آیت۔20

ترکیب (آیت۔5 (يَحْسَبُ میں شامل هُوَ کی ضمیر فاعلی اَلْاِنْسَانَ کے لیے ہے۔ (آیت۔13) فَكُّ رَقَبَةٍ مرکب اضافی ہے اور خبر ہے۔ اس کا مبتدا هِيَ محذوف ہے (آیات۔14۔16) اِطْعَامٌ مصدر ہے۔ اس نے فعل کا کام کیا ہے اور يَتِيْمًا اور مِسْكِيْنًا کو نصب دی ہے۔ (دیکھیں آیت۔3/آل عمران:54، نوٹ۔1)۔ نَارٌ نکرہ مخصوصہ ہے اور مُؤْصَدَةٌ اس کی خصوصیت ہے۔

ترجمہ

2004

لَآ اُقۡسِمُ	بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۱﴾	وَاَنۡتَ حِلٌّۢ	بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۲﴾
نہیں میں قسم کھاتا ہوں	اس شہر کی	اور آپ کو حلال (سمجھا) (کفار مکہ نے)	اس شہر میں

وَوَالِدٍ	وَّمَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾	لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ	فِىۡ كَبَدٍ ؕ﴿۴﴾
اور قسم ہے جننے والے کی	اور اس کی جو اس نے جنا	بیشک ہم نے پیدا کیا ہے انسان کو	ایک مشقت میں

اَيَحۡسَبُ	اَنۡ لَّنۡ يَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ	اَحَدٌ ۘ﴿۵﴾	يَقُوۡلُ اَهۡلَكۡتُ	مَالًا لُّبَدًا ؕ﴿۶﴾
کیا وہ (انسان) سمجھتا ہے	کہ ہرگز قابو نہیں پائے گا اس پر	کوئی ایک بھی	وہ کہتا ہے میں نے ہلاک کیا (خرچ کیا)	ڈھیروں ڈھیر مال

اَيَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ يَرَهٗۤ	اَحَدٌ ؕ﴿۷﴾	اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ	عَيۡنَيۡنِ ۙ﴿۸﴾
کیا وہ سمجھتا ہے کہ دیکھا ہی نہیں اس کو (کماتے خرچ کرتے)	کسی ایک نے بھی	کیا ہم نے نہیں بنائیں اس کے لیے	دو آنکھیں

وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِ ۙ﴿۹﴾	وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ۚ﴿۱۰﴾	فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ ۖ﴿۱۱﴾	وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ؕ﴿۱۲﴾
اور ایک زبان اور دو ہونٹ	اور ہم نے سمجھا دیئے اس کو دونوں راستے	پس وہ نہیں گھسا اُس گھاٹی میں	اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ گھاٹی

فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ﴿۱۳﴾	اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِىۡ يَوۡمٍ	ذِىۡ مَسۡغَبَةٍ ۙ﴿۱۴﴾	يَّتِيۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ۙ﴿۱۵﴾	اَوۡ مِسۡكِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ؕ﴿۱۶﴾
(وہ) کسی گردن کا چھڑانا ہے	یا کھلانا ہے کسی ایسے دن میں جو	بھوک والا ہو	کسی ایک یتیم کو جو قربت والا ہو	یا کسی ایسے مسکین کو جو محتاجی والا ہو

ثُمَّ كَانَ	مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا	وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ	وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ ؕ﴿۱۷﴾	اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ ؕ﴿۱۸﴾
پھر وہ ہو (بھی)	ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے	اور باہم تاکید کی ثابت قدم رہنے کی	اور باہم تاکید کی رحم دل ہونے کی	وہ لوگ داہنی طرف والے

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِنَا	هُمۡ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡئَمَةِ ؕ﴿۱۹﴾	عَلَيۡهِمۡ نَارٌ	مُّؤۡصَدَةٌ ﴿۲۰﴾
اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا	وہ بائیں طرف والے ہیں	ان پر ایک ایسی آگ ہے جو	اوپر سے بند کی ہوئی ہے

نوٹ: 1

اس سورہ میں ایک بہت بڑے مضمون کی چند مختصر جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اور یہ قرآن کا کمال اعجاز ہے کہ ایک پورا نظریۂ حیات، جسے مشکل سے ایک ضخیم کتاب میں بیان کیا جا سکتا تھا، اسے اس چھوٹی سی سورہ کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں نہایت مؤثر طریقہ سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کا موضوع دنیا میں انسان کی، اور انسان کے لیے دنیا کی صحیح حیثیت سمجھانا اور یہ بتانا ہے کہ خدا نے انسان کے لیے سعادت اور شقاوت (نیک بختی اور بدبختی) کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیئے ہیں، ان کے دیکھنے اور ان پر چلنے کے وسائل بھی اسے فراہم کر دیئے ہیں۔ اب یہ انسان کی اپنی کوشش اور محنت پر موقوف ہے کہ وہ سعادت کی راہ پر چل کر اچھے انجام کو پہنچتا ہے یا شقاوت کی راہ اختیار کر کے برے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

آیت۔ 2۔ میں لفظ حِلٌّ میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حلول سے مشتق ہو، جس کے معنے کسی شئے کے اندر سمانے اور رہنے اور اترنے کے آتے ہیں۔ اس اعتبار سے حِلٌّ کے معنے اترنے اور رہنے کے ہوں گے اور مراد آیت کی یہ ہوگی کہ شہر مکہ خود بھی محترم ہے اور آپ ﷺ بھی اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس لیے شہر کی عظمت و حرمت دوہری ہوگئی۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ حِلٌّ مصدر حِلَّت سے مشتق ہو جس کے معنے کسی چیز کی حلال ہونے کے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ ﷺ کو کفار مکہ نے حلال سمجھ رکھا ہے۔ جس

مقدس مقام پر کسی جانور کا قتل بھی جائز نہیں ہے، اور ان لوگوں کا بھی یہی عقیدہ ہے، وہاں ان لوگوں نے اللہ کے رسول ﷺ کا قتل حلال سمجھ لیا ہے۔ دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ ﷺ کے لیے حرمِ مکہ میں قتالِ کفار حلال ہونے والا ہے جیسا کہ فتح مکہ میں ایک روز کے لیے کفار کا قتل حلال کر دیا گیا تھا۔ مظہری میں تینوں احتمال مذکور ہیں۔

آیت۔ 3۔ میں والد سے مراد حضرت آدمؑ ہیں اور مَا وَلَدَ سے ان کی اولاد مراد ہے جو ابتدائے دنیا سے قیامت تک ہو گی۔ آگے جواب قسم مذکور ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے ایسا پیدا کیا گیا ہے کہ اوّل عمر سے آخر تک محنتوں اور مشقتوں میں رہتا ہے۔ اس قسم اور جواب قسم میں انسان کو اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہاری یہ خواہش کہ دنیا میں ہمیشہ راحت ہی راحت ملے اور کسی تکلیف سے سابقہ نہ پڑے، ایک خیال خام ہے جو کبھی حاصل نہیں ہو گا۔ ہر شخص کو دنیا میں محنت و مشقت اور رنج و مصیبت ضروری پیش آنی ہیں۔ اور جب ان کو پیش آنا ہی ہے تو عقلمند کا کام یہ ہے کہ اس چیز کے لیے مشقت جھیلے جو ہمیشہ اس کے کام آئے اور دائمی راحت کا سامان ہے۔ اور یہ صرف ایمان اور طاعت حق میں منحصر ہے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔ 6۔ میں یہ نہیں کہا کہ میں نے ڈھیر سا مال خرچ کر دیا، بلکہ اَهْلَكْتُ کہا ہے جس کے معنی ہیں کہ میں نے ڈھیر سا مال ہلاک کر دیا یعنی لٹا دیا یا اڑا دیا۔ اور یہ مال اڑا دینا کس مد میں تھا۔ کسی حقیقی نیکی کے کام میں نہیں، جیسا کہ آگے کی آیات سے خود بخود ظاہر ہو رہا ہے بلکہ اپنی دولت مندی کی نمائش اور فخر کے اظہار میں تھا۔ شادی اور غمی کی رسموں میں سینکڑوں آدمیوں کی دعوت کرنا، جوئے میں دولت ہار دینا، جوا جیت جانے پر اونٹ پر اونٹ کاٹنا اور یار دوستوں کو خراب کھلانا، میلوں میں بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ جانا اور دوسرے سرداروں سے بڑھ کر شان و شوکت کا مظاہرہ کرنا۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے نمائشی اخراجات تھے جنہیں جاہلیت میں آدمی کی فیاضی کی علامت اور اس کی بڑائی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ انہی پر اس کی تعریفوں کے ڈنکے بجتے تھے اور وہ خود بھی ان پر اپنا فخر جتاتے تھے۔

لیکن یہ فخر جتانے والا یہ نہیں سمجھتا کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو دیکھ رہا ہے کہ اس نے کن ذرائع سے یہ دولت حاصل کی، کن کاموں میں اسے کھپایا اور کن اغراض و مقاصد کے لیے اس نے یہ سارے کام کیے۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ خدا کے ہاں اس فضول خرچی، اس شہرت طلبی اور اس تفاخر کی کوئی قدر ہو گی۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:4

آیات۔ 8۔9۔ کا مطلب یہ ہے کہ کیا ہم نے اسے علم و عقل کے ذرائع نہیں دیئے۔ دو آنکھوں سے مراد گائے اور بھینس کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں ہیں جنہیں کھول کر آدمی دیکھے تو اسے ہر طرف وہ نشانات نظر آئیں جو حقیقت کا پتہ دیتے ہیں۔ اور صحیح و غلط کا فرق سمجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مراد محض بولنے کے آلات نہیں ہیں بلکہ نفس ناطقہ جو ان آلات کی پشت پر سوچنے سمجھنے کا کام کرتا ہے۔ پھر انسان ان سے اظہارِ مافی الضمیر کا کام لیتا ہے۔

پھر آیت۔ 10۔ میں فرمایا کہ ہم نے محض عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے انسان کو چھوڑ نہیں دیا کہ وہ اپنا راستہ خود تلاش کرے۔ بلکہ اس کی رہنمائی بھی کی۔ اس کے سامنے بھلائی اور برائی، نیکی اور بدی، دونوں کے راستے نمایاں کر کے رکھ دیئے تا کہ وہ سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اختیار کر لے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ دھر میں فرمائی گئی ہے کہ ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تا کہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا۔ خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:5

آیت۔ 11۔ میں اَلْعَقَبَةَ آیا ہے۔ عقبہ پہاڑ کی بڑی چٹان کو بھی کہتے ہیں اور دو پہاڑوں کے درمیانی راستے یعنی گھاٹی کو

بھی۔دشمن سے نجات حاصل کرنے میں یہ عقبہ انسان کی مدد کرتا ہے کہ پہاڑ کے اوپر چڑھ کر دشمن سے اپنے آپ کو بچالے یا پھر گھاٹی میں داخل ہو کر کہیں نکل جائے۔اس جگہ طاعات وعبادات کو عقبہ سے تعبیر فرمایا ہے جس طرح عقبہ دشمن سے نجات دلانے کا سبب ہوتا ہے اسی طرح اعمال صالحہ آخرت کے عذاب سے نجات کا ذریعہ بنتے ہیں۔پھر ان اعمال صالحہ میں پہلے فرمایا کسی غلام (یا مقروض) کو آزاد کرنا۔یہ بہت بڑی عبادت ہے اور ایک انسان کی زندگی کو سنوار دینا ہے۔دوسری چیز بیان فرمائی بھوکے کو کھانا کھلانا۔کسی کو بھی کھانا کھلایا جائے وہ ثواب سے خالی نہیں ہے،لیکن جب کسی ایسے یتیم کو کھلایا جائے جس کے ساتھ رشتہ داری بھی ہے تو اس میں دوہرا ثواب ہو گیا۔ایک بھوکے کا پیٹ بھرنا دوسرے صلہ رحمی کا حق ادا کرنا۔اگر یتیم رشتہ دار نہ ہو تو ایسا مسکین ہو جو محتاج ہو۔(معارف القرآن)

نوٹ:6

آیت۔17۔کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ اوصاف کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ آدمی مومن بھی ہو۔کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل نہ تو عمل صالح ہے اور نہ وہ اللہ کے ہاں مقبول ہو سکتا ہے۔قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اس کی تصریح کی گئی ہے کہ نیکی وہی قابل قبول اور ذریعہ نجات ہے جو ایمان کے ساتھ ہو۔مثلاً سورۂ نساء کی آیت۔124۔میں فرمایا کہ جو نیک اعمال کرے،خواہ وہ مرد ہو یا عورت،اور (اس حال میں کہ) ہو وہ مومن،تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔سورۂ نحل کی آیت۔97۔میں فرمایا کہ جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت،اور (اس حال میں کہ) ہو وہ مومن،تو ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ایسے لوگوں کو ان کا اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق عطا کریں گے۔جو شخص بھی قرآن پاک کا مطالعہ کرے گا وہ یہ دیکھے گا کہ اس کتاب میں جہاں بھی عمل صالح کے اجر کا ذکر ہے وہاں لازماً اس کے ساتھ ایمان کی شرط لگی ہوئی ہے۔ایمان کے بغیر عمل کو قرآن میں کہیں بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں قرار دیا گیا اور نہ اس پر کسی اجر کی امید دلائی گئی۔
(تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الشمس (91)

آیت نمبر (1 تا 15)

ط ح ی

(ض) طَحٰىهَا کسی چیز کو پھیلانا۔زیر مطالعہ آیت۔6۔

ل ھ م

(س) لَهَمَا کسی چیز کو ایک ہی مرتبہ میں نگل جانا۔ہڑپ کر جانا۔

(افعال) اِلۡهَامًا نگلوانا۔کسی کے دل میں کوئی بات القا کر دینا۔(لیکن یہ لفظ ایسی بات کے القا کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے جو اللہ تعالیٰ یا ملاء اعلیٰ کی جانب سے دل میں ڈالی جاتی ہے۔مفردات) زیر مطالعہ آیت۔8۔

ترکیب

آیات۔5 تا 7 میں مَا کا لفظ آیا ہے۔اس کو مصدریہ بھی مانا گیا ہے اور موصولہ بھی۔عام قاعدہ یہ ہے کہ ذوی عقول کے لیے مَنۡ موصولہ آتا ہے اور غیر ذوی عقول کے لیے مَا آتا ہے۔لیکن عربی میں کبھی کبھی مَا بھی ذوی عقول کے لیے آجاتا ہے۔یعنی کبھی مَا بھی مَنۡ کے معنی میں آجاتا

ہے۔اس لحاظ سے دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔ہم مَا مصدر یہ مان کر ترجمہ کریں گے۔(آیت۔6) طَحَا کا مادہ ''طح و'' بھی ہے اور ''طح ی'' بھی۔ناقص وادی میں یہ دوسرے معانی کے ساتھ پھیلنا (لازم) اور پھیلانا (متعدی) دونوں معانی میں آتا ہے۔جبکہ یائی میں یہ صرف پھیلانا (متعدی) کے معنی دیتا ہے۔اس طرح اس آیت میں طَحَا کو وادی بھی مان سکتے تھے اور یائی بھی۔لیکن قرآن مجید کی کتابت پر جب غور کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ ھَا سے پہلے ایک دندانہ بنا ہوا ہے۔یہ اس بات کی علامت ہے کہ کاتبانِ وحی نے اس کو یائی مان کر لکھا تھا۔کیونکہ اگر وادی مان کر لکھتے تو یہ طَحٰھَا (دندانے کے بغیر) لکھا ہوتا۔طَحٰھَا لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ھا کی ضمیر طَحَا (وادی) پر نہیں بلکہ طَحٰی (یائی) پر لگائی ہے۔(آیت۔8) جوابِ قسم نہیں ہے بلکہ یہ سابقہ آیت میں قسم وَنَفْسٍ کا جز ہے۔ان قسموں کا جوابِ قسم آگے آیات۔9۔10۔میں آیا ہے۔دَسّٰھَا۔یہ اگر مادہ ''دسس'' کے ثلاثی مجرد سے ہوتا تو یہ دَسَّھَا ہوتا۔نہ سین پر کھڑا زبر ہوتا اور نہ اس کے آگے یا کا دندانہ ہوتا۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ بابِ تفعیل سے ماضی کا صیغہ دَسَّسَ ہے۔قاعدے کے مطابق تیسری سین یا میں تبدیل ہوئی تو یہ دَسَّیَ ہوا۔پھر قاعدے کے مطابق دَسّٰی استعمال ہوتا ہے۔(دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:259، نوٹ۔2) (آیت۔13)۔نَاقَةَ اللّٰهِ میں نَاقَةَ کی نصب بتا رہی ہے کہ اس کا فعل محذوف ہے جو کہ اِحْذَرُوْا (تم لوگ محتاط رہو) ہو سکتا ہے۔

ترجمہ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۝١	وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝٢
قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی	اور قسم ہے چاند کی جب وہ پیچھے پیچھے آتا ہے اس (سورج) کے

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝٣	وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝٤
اور قسم ہے دن کی جب وہ خوب روشن کر دیتا ہے اس (سورج) کو	اور قسم ہے رات کی جب وہ ڈانپ لیتی ہے اس (سورج) کو

وَالسَّمَآءِ	وَمَا	بَنٰىهَا ۝٥	وَالْاَرْضِ	وَمَا	طَحٰىهَا ۝٦
اور قسم ہے آسمان کی	اور اس کی جیسا	اس نے بنایا اس (آسمان) کو	اور قسم ہے زمین کی	اور اس کی جیسا	اس نے پھیلایا اس کو

وَنَفْسٍ	وَّمَا	سَوّٰىهَا ۝٧	فَاَلْهَمَهَا
اور قسم ہے نفس کی	اور اس کی جیسا	اس نے سنوارا اس کو	پھر اس نے الہام کیا اس میں

فُجُوْرَهَا	وَتَقْوٰىهَا ۝٨	قَدْ اَفْلَحَ مَنْ	زَكّٰىهَا ۝٩
اس کی نافرمانی	اور اس کی پرہیزگاری (کا شعور)	مراد پا چکا ہے وہ جس نے	پاک رکھا اس (نفس) کو

وَقَدْ خَابَ مَنْ	دَسّٰىهَا ۝١٠	كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ	بِطَغْوٰىهَآ ۝١١
اور نامراد ہو گیا وہ جو	خاک آلود کرتا رہا اس (نفس کو)	جھٹلایا ثمود نے (رسول کو)	اپنی سرکشی کے باعث

اِذِ انْۢبَعَثَ	اَشْقٰىهَا ۝١٢	فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ	نَاقَةَ اللّٰهِ	وَسُقْيٰهَا ۝١٣
اب اٹھ کھڑا ہوا	ان کا زیادہ شقی	تو کہا اُن لوگوں سے اللہ کے رسولؐ نے	(محتاط رہو) اللہ کی اونٹنی سے	اور اس کے پینے (کی باری) سے

فَكَذَّبُوْهُ	فَعَقَرُوْهَا ۚ	فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ
پھرانہوں نے جھٹلایا اُن (رسولؑ) کو	توانہوں نے ٹانگیں کاٹیں اس (اونٹنی) کی	پس دھمادھم برسایا ان پر (عذاب)

رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ	فَسَوّٰىهَا ۖ ﴿۱۴﴾	وَلَا يَخَافُ	عُقْبٰهَا ﴿۱۵﴾
ان کے رب نے ان کے گناہ کے باعث	تواس نے برابر کردیا اس (قوم) کو	اور وہ نہیں ڈرتا	اس کے نتیجے سے

نوٹ:1

مضمون کے لحاظ سے یہ سورہ دو حصوں میں مشتمل ہے۔ پہلا حصہ سورہ کے آغاز سے آیت۔10۔ پر ختم ہوتا ہے۔اور دوسرا حصہ آیت۔ 11۔ سے آخر تک چلتا ہے۔ پہلے حصے میں تین باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ایک یہ جس طرح چاند، سورج، رات، دن اور زمین وآسمان ایک دوسرے سے مختلف اور نتائج میں متضاد ہیں اسی طرح سے نیکی اور بدی بھی ایک دوسرے سے مختلف اور نتائج میں متضاد ہیں۔دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو جسم، حواس اور ذہن کی قوتیں دے کر ایک فطری الہام کے ذریعے اس کے لاشعور میں نیکی اور بدی کا فرق، ان کے مابین امتیاز اور ایک کے خیر اور دوسرے کے شر ہونے کا احساس اتار دیا ہے۔تیسرے یہ کہ انسان کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اپنے نفس کے اچھے اور بُرے رجحانات میں سے کس کو ابھارتا اور کس کو دباتا ہے۔دوسرے حصے میں قوم ثمود کی تاریخی مثال پیش کرتے ہوئے رسالت کی اہمیت سمجھائی گئی ہے۔رسول دنیا میں اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ بھلائی اور برائی کا جو الہامی علم اللہ نے انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے، وہ بجائے خود انسان کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے۔کیونکہ اس الہامی علم کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی انسان خیر وشر کے غلط فلسفے اور معیار تجویز کر کے گمراہ ہوتا رہا ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام پر واضح اور صاف صاف وحی نازل فرمائی تاکہ وہ لوگوں کو کھول کر بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔8۔کا جملہ ساتویں قسم وَنَفْسٍ کے ساتھ مربوط ہے۔مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو بنایا پھر اس کے دل میں فجور اور تقویٰ، دونوں کا الہام کر دیا۔مراد یہ ہے کہ نفس انسانی کی تخلیق میں حق تعالیٰ نے گناہ اور طاعت، دونوں کے مادے اور استعداد رکھ دی ہے۔ پھر انسان کو ایک اختیار اور قدرت دے دی کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے گناہ کی راہ اختیار کر لے یا طاعت کی۔ جب وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ان میں سے کوئی راہ اختیار کرتا ہے تو اسی ارادے اور اختیار پر اس کو ثواب یا عذاب ملتا ہے۔(معارف القرآن)۔

اس جگہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ فطری الہام اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق پر اس کی نوعیت کے لحاظ سے کیا ہے۔مثلاً حیوانات کی ہر نوع کو اس کی ضرورت کے مطابق الہامی علم دیا ہے جس کی بنا پر مچھلی کو تیرنا، پرندے کو اڑنا، شہد کی مکھی کو چھتہ بنانا اور بَیٔ (چھوٹی چڑیا) کو گھونسلا بنانا آجاتا ہے۔انسان کو اس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے الگ الگ قسم کے الہامی علوم دیئے گئے ہیں۔انسان کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک حیوانی وجود ہے۔اس حیثیت سے جو الہامی علم اس کو دیا گیا ہے اس کی ایک نمایاں ترین مثال بچے کا پیدا ہوتے ہی ماں کا دودھ چوسنا ہے۔اس کی تعلیم اگر خدا نے فطری طور پر اس کو نہ دی ہوتی تو کوئی اسے یہ فن نہ سکھا سکتا تھا۔اس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک عقلی وجود ہے۔اس حیثیت سے خدا نے انسان کے آغاز سے مسلسل اس کو الہامی رہنمائی دی ہے جس کی بدولت وہ پے در پے ایجادات کر کے تمدن میں ترقی کر رہا ہے ان ایجادات کی تاریخ کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ ان میں شاید ہی کوئی ایسی ہو جو محض انسانی فکر وکاوش کا نتیجہ ہو، ورنہ ہر ایک کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں ایک بات آگئی اور اس کی بدولت اس نے کوئی چیز ایجاد کر لی۔ان دونوں حیثیتوں کے علاوہ انسان کی ایک اور حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک اخلاقی وجود ہے۔اس حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ نے اسے خیر وشر کا امتیاز اور خیر کے خیر ہونے اور شر کے شر ہونے کا احساس الہامی طور پر عطا کیا ہے۔یہ امتیاز اور احساس ایک عالمگیر حقیقت ہے۔دنیا میں کبھی کوئی انسانی معاشرہ خیر وشر کے تصورات سے خالی نہیں رہا۔اور کوئی ایسا معاشرہ نہ تاریخ میں کبھی پایا گیا ہے اور نہ اب پایا جاتا ہے جس کے نظام میں بھلائی اور برائی پر جزا اور سزا کی کوئی نہ کوئی صورت اختیار نہ کی گئی ہو۔اس چیز کا ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر مرحلۂ تہذیب و

تمدن میں پایا جانا، اس کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ اس حقیقت کا بھی ثبوت ہے کہ ایک حکیم اور دانا خالق نے اسے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن مادی اجزا سے انسان کا جسمانی وجود مرکب ہے اور دنیا کا مادی نظام جن قوانین کے تحت چل رہا ہے، ان کے اندر کہیں بھی اخلاق کے ماخذ کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3 گزشتہ آیات میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں، وہ جس بات پر کھائی گئی ہیں، اسے آیات۔ 9۔10 میں بیان کیا گیا ہے کہ جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے اور اس کے اندر بھلائی کو نشوونما دے وہ فلاح پائے گا۔ اور وہ شخص نامراد ہوگا جو نیکی کے رجحانات کو دبا دے اور فجور کو تقویٰ پر غالب کردے۔ بعض مفسرین نے ان آیات کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ فلاح پا گیا وہ جس کے نفس کو اللہ نے پاک کر دیا اور نامراد ہوا وہ جس کے نفس کو اللہ نے دبا دیا، لیکن یہ تفسیر زبان کے لحاظ سے قرآن کے طرز بیان کے خلاف ہے۔ اور یہ تفسیر اسی موضوع پر قرآن کے دوسرے بیانات سے ٹکراتی ہے۔ مثلاً سورۂ اعلیٰ کی آیت۔ 14۔ میں ہے کہ فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ سورۂ عبس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا کہ آپ ﷺ پر کیا ذمہ داری ہے اگر وہ پاکیزگی نہ اختیار کرے۔ ان دونوں آیتوں میں پاکیزگی اختیار کرنا بندے کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں جگہ جگہ یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اس دنیا میں انسان کا امتحان لیا جارہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ امتحان سرے سے بے معنی ہوجاتا ہے اگر امتحان لینے والا پہلے ہی ایک امیدوار کو ابھار دے اور دوسرے کو دبا دے۔ اس لیے صحیح تفسیر وہی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ زَكّٰهَا اور دَسّٰهَا کا فاعل بندہ ہے نہ کہ خدا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:4 آیات۔ 12۔ اور 14۔ پر غور کرنے سے ایک خاص بات یہ سامنے آتی ہے کہ اگرچہ اونٹنی کے قتل کا ارتکاب قوم کے اندر سے ایک ہی شخص نے کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا مجرم پوری قوم کو ٹھہرایا اور اس کی سزا بھی پوری قوم کو دی۔ اس سے قرآن کے فلسفۂ تاریخ کا یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کے جرم میں پوری قوم کو سزا دیتا ہے اگر قوم اس جرم پر راضی ہو۔ اس کے وبال سے صرف وہی لوگ بچتے ہیں جو اپنے مقدور بھر اس کی اصلاح کے لیے جو کر سکتے ہوں وہ کر گزریں اور اگر کچھ نہ کر سکتے ہوں تو ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس سے بیزار اور کنارہ کش رہیں۔ اس سے نیچے نہ ایمان کا کوئی درجہ ہے نہ خدا کی پکڑ سے بچنے کی کوئی سبیل ہے۔

بِذَنۡۢبِهِمۡ کے الفاظ سے وضاحت ہوگئی کہ عذاب ان کے اوپر اس جرم کے سبب سے آیا کہ اللہ کے رسول کی تنبیہہ کے باوجود انہوں نے اونٹنی کو گزند پہنچانے کی جسارت کی۔ ظاہر ہے کہ اس جرم کے بعد اگر ان کو ڈھیل ملتی تو وہ اللہ کے رسول پر بھی ہاتھ ڈالنے کی جسارت کر گزرتے اور یہ وہ جرم ہے جس کی مہلت اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو نہیں دی بلکہ جب کسی قوم نے رسول کے قتل کا ارادہ کیا تو وہ تباہ کر دی گئی۔ (یہ سنت الٰہی رسولوں سے متعلق ہے۔ جبکہ انبیاء قتل کیے گئے ہیں۔ مرتب)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب قریش کے لیڈروں نے رسول اللہ ﷺ کے قتل کے مشورے شروع کر دیئے تھے۔ یہ مشورے چونکہ خفیہ تھے۔ اس وجہ سے قرآن نے بھی اشارات کی زبان میں ان کو آگاہی دے دی کہ اگر وہ کوئی ارادہ بد اپنے دل میں پرورش کر رہے ہیں تو اس کے دوررس نتائج پر نگاہ ڈال لیں۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:5 آیت۔ 15۔ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو تباہ کرتا ہے، تو اپنی اس سنت کے مطابق کرتا ہے جو اس نے اس دنیا کی مصلحت اور

بہبود کے لیے اپنے علم اور قدرت کے تحت ٹھہرا رکھی ہے اس وجہ سے نہ اس کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ نتیجہ کے اعتبار سے اس کے اس فیصلے میں کوئی غلطی ہوسکتی ہے اور نہ یہ خوف ہوتا ہے کہ اس کو کوئی چیلنج کرسکتا ہے۔ اس سے ضمنی طور ان لغو بیانات کی بھی نفی ہو جاتی ہے جو تورات کی کتاب پیدائش میں اس کے راویوں نے ملائے ہیں۔ مثلاً ''اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے تصور اور خیالات سدا (ہمیشہ) برے ہیں، تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا۔'' (پیدائش۔ باب۔ 6۔ آیت۔ 5۔ 6) (تدبر قرآن)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الیل (92)

آیت نمبر (1 تا 21)

ترکیب

(آیت۔4) شَتّٰی۔ یہ مادہ ''ش ت ت'' سے باب تفعیل کا ماضی کا صیغہ نہیں ہے کیونکہ اس پر اِنَّ کی خبر پر آنے والا لامِ تاکید لگا ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دراصل فَعِیۡلٌ کے وزن پر صفت شَتِیۡتٌ کی جمع ہے، جیسے مَرِیۡضٌ کی جمع مَرۡضٰی ہے اس حوالے سے یہاں پر یہ بھی نوٹ کرلیں کہ فُعۡلٰی کا وزن افعل تفضیل کی مؤنث کے لیے ہے۔ جبکہ فَعۡلٰی جمع مکسر کے اوزان میں سے ایک وزن ہے۔ (آیت۔ 11) تَرَدّٰی میں یا اصلی ہے۔ یعنی یہ مادہ ''ردی'' سے باب تفعل کا ماضی تَرَدَّیَ ہے جو قاعدے کے مطابق تبدیل ہو کر تَرَدّٰی استعمال ہوتا ہے۔ (آیت۔12) اِنَّ کا اسم اَلۡھُدٰی ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جو وَاجِبٌ ہوسکتی ہے۔ خبر محذوف ہونے کی وجہ سے اِنَّ کی خبر پر آنے والا لامِ تاکید اس کے اسم پر آ گیا ہے، جس نے اَلۡھُدٰی کے ہمزۃ الوصل کو لکھنے میں بھی ساقط کر دیا۔ عَلَیۡنَا قائم مقام خبر مقدم ہے۔ (آیت۔13) اِنَّ کا اسم ہونے کی وجہ سے اَلۡاٰخِرَۃَ حالت نصب میں آیا ہے۔ اس کی بھی خبر محذوف ہے اس لیے لام تاکید اَلۡاٰخِرَۃَ پر داخل ہوا تو لَلۡاٰخِرَۃَ استعمال ہوا۔ اَلۡاُوۡلٰی بھی اِنَّ کا اسم ہے لیکن فُعۡلٰی کے وزن پر رفع۔ نصب۔ جر ظاہر نہیں ہوتی۔ آیت نمبر 14 میں تَلَظّٰی باب تفعل کا صیغہ واحد مونث غائب ہے۔ جو اصل میں تَتَلَظّٰی تھا۔ ایک تا کو گرا دیا گیا ہے۔ (آیت۔15) یَصۡلٰھَا میں ھَا کی ضمیر نَارًا تَلَظّٰی کے لیے ہے اور یَصۡلٰی کا فاعل اَلۡاَشۡقَی ہے۔ یہ افعل تفضیل کے مذکر کے وزن اَفۡعَلُ پر حالت رفع میں اَشۡقَی تھا جو قاعدے کے مطابق تبدیل ہو کر اَشۡقٰی آیا ہے۔ آگے م لانے کے لیے کھڑی زبر کو ہٹا کر اس پر پڑی زبر ڈالی ہے۔ (آیت۔18) یَتَزَکّٰی باب تفعل سے مضارع کا صیغہ ہے اور یہاں یہ حال کے طور پر آیا ہے۔ کیونکہ کوئی اسم جب حال کے طور پر آتا ہے تو وہ حالت نصب میں ہوتا ہے اور کوئی فعل جب حال کے طور پر آتا ہے تو وہ مضارع کا کوئی صیغہ ہوتا ہے۔ (آیت۔19) عِنۡدَہٗ کی ضمیر اَلۡاَتۡقٰی کے لیے ہے۔ تُجۡزٰی کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے مِنۡ نِعۡمَۃٍ محلاً حالت رفع میں ہے۔

ترجمہ

وَالَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی ۙ﴿۱﴾	وَالنَّھَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۙ﴿۲﴾	وَمَا
قسم ہے رات کی جب وہ چھا جاتی ہے	اور قسم ہے دن کی جب وہ خوب روشن ہوتا ہے	اور قسم ہے اس کی جو

خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰۤی ۙ﴿۳﴾	اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ؕ﴿۴﴾	فَاَمَّا مَنۡ	اَعۡطٰی وَاتَّقٰی ۙ﴿۵﴾
اس نے پیدا کیے مذکر اور مؤنث	بیشک تم لوگوں کی سعی و جہد متفرق ہے	پس وہ جو ہے جس نے	خوش دلی سے دیا اور پرہیز گار رہا

2004

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۶﴾	فَسَنُيَسِّرُهٗ	لِلْيُسْرٰى ؕ﴿۷﴾	وَ اَمَّا مَنْ
اوراس نے تصدیق کی اس بڑی بھلائی کی	تو ہم پہنچادیں گے اس کو	اس بڑی آسانی تک	اور وہ جو ہے جس نے

بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ﴿۸﴾	وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۹﴾	فَسَنُيَسِّرُهٗ	لِلْعُسْرٰى ؕ﴿۱۰﴾
کنجوسی کی اور بے پرواہ ہوا	اوراس نے جھٹلایا اس بڑی بھلائی کو	تو ہم پہنچادیں گے اس کو	اُس بڑی سختی تک

وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ	اِذَا تَرَدّٰى ؕ﴿۱۱﴾	اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۖ﴿۱۲﴾
اور کام نہ آئے گا اس کے اس کا مال	جب وہ گڑھے میں گرے گا	بیشک ہم پر یقیناً ہے راہ سمجھا دینا

وَاِنَّ لَنَا	لَلْاٰخِرَةَ	وَالْاُوْلٰى ﴿۱۳﴾
اور بیشک ہمارے لیے ہی (قبضۂ قدرت میں)	آخرت (بھی) ہے	اور یہ پہلی (دنیا) بھی ہے

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا	تَلَظّٰى ۚ﴿۱۴﴾	لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ﴿۱۵﴾
پس میں نے خبردار کردیا تم لوگوں کو ایک ایسی آگ سے	جو غصہ سے بھڑک اٹھتی ہے	نہیں گرے گا اس میں مگر بڑا بدبخت

الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ؕ﴿۱۶﴾	وَسَيُجَنَّبُهَا	الْاَتْقَى ۙ﴿۱۷﴾	الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ
وہ جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا	اور بچالیا جائے گا اس (آگ) سے	بڑے پرہیزگار کو	وہ جو دیتا ہے اپنا مال

يَتَزَكّٰى ۚ﴿۱۸﴾	وَمَا لِاَحَدٍ	عِنْدَهٗ	مِنْ نِّعْمَةٍ
پاکیزگی حاصل کرتے ہوئے	اس حال میں کہ نہیں ہے کسی ایک کا	اس کے پاس (یعنی اس پر)	کوئی بھی ایسی نعمت (احسان) جس کا

تُجْزٰۤى ۙ﴿۱۹﴾	اِلَّا	ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ﴿۲۰﴾	وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۱﴾
بدلہ دیا جانا ہو	سوائے اس کے کہ	اپنے اعلیٰ رب کی توجہ کی جستجو کرنا	اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہوگا

نوٹ: 1

آیات۔5۔6۔ میں انسانی کوششوں کی ایک قسم میں تین کا ذکر کیا گیا ہے غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام خوبیوں کی جامع ہیں۔ایک یہ کہ انسان زر پرستی میں مبتلا نہ ہو بلکہ کھلے دل سے اپنا مال، جتنا کچھ اللہ نے دیا ہے، اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے میں صرف کرے۔ دوسرے یہ کہ اس کے دل میں خدا کا خوف ہو۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کاموں سے پرہیز کرے جو خدا کی ناراضی کے موجب ہوں۔ تیسرے یہ کہ وہ بھلائی کی تصدیق کرے۔ بھلائی ایک وسیع المعانی لفظ ہے جس میں عقیدے، اخلاق اور اعمال، تینوں کی بھلائی شامل ہے۔ انسانی کوششوں کی اس قسم کا نتیجہ اگلی آیت میں بیان ہوا ہے اس طرزِ زندگی میں سب سے پہلی آسانی انسان کو یہ حاصل ہوتی ہے کہ یہ راستہ انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ اس میں انسان کو اپنے ضمیر سے لڑ کر نہیں چلنا پڑتا۔ اس میں انسان کو ہر طرف اس مزاحمت اور کشمکش سے سابقہ پیش نہیں آتا جو گناہوں سے بھری زندگی میں پیش آتا ہے۔ اور معاشرے میں اسے ہر قدم پر صلح و آشتی اور قدر و منزلت میسر آتی چلی جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو آدمی اپنا مال خلق خدا کی بھلائی کے لیے خرچ کر رہا ہو، جس سے کسی کو خیانت، ظلم اور زیادتی کا اندیشہ نہ ہو، وہ خواہ کیسے ہی بگڑے ہوئے معاشرے میں رہتا ہو، بہر حال اس کی قدر ہو کر رہتی ہے۔ لوگ اس کی طرف کھینچتے ہیں۔ اس کا اپنا قلب و ضمیر بھی مطمئن ہوتا ہے اور معاشرے میں اس کو وہ وقار حاصل ہوتا ہے جو کبھی بھی بدکردار آدمی کو حاصل نہیں ہوتا۔ یہی بات سورۂ نحل کی آیت۔97۔ میں اس طرح فرمائی گئی کہ جو شخص نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور (یعنی اس حال میں کہ) ہو وہ مومن، تو اسے ہم

پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔اور اسی بات کو سورۂ مریم کی آیت۔96، میں یوں فرمایا گیا کہ یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے،تو رحمان ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے سورۂ بلد میں اسی راستے کو دشوار گزار گھاٹی کہا گیا ہے اور یہاں اس کو آسان راستہ قرار دیا گیا ہے۔ان دونوں باتوں میں تطبیق کیسے ہوگی۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس راہ کو اختیار کرنے سے پہلے یہ آدمی کو دشوار گزار گھاٹی ہی محسوس ہوتی ہے جس پر چڑھنے کے لیے اسے اپنے نفس کی خواہشوں سے،اپنے دنیا پرست اہل وعیال سے،اپنے رشتہ داروں سے،اپنے دوستوں اور معاملہ داروں سے اور سب سے بڑھ کر شیطان سے لڑنا پڑتا ہے۔کیونکہ ہر ایک اس میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اور اس کو خوفناک بنا کر دکھاتا ہے۔لیکن جب انسان اس پر چلنے کا عزم کر لیتا ہے تو اس گھاٹی پر چڑھنا اس کے لیے آسان اور اخلاقی پستیوں کے کھڈ میں لڑھکنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔(مطلب یہ ہے کہ اس راستے پر چلنے سے پہلے یہ انسان کو دشوار گزار محسوس ہوتا ہے۔لیکن جب وہ عملاً اس پر چلنا شروع کر دیتا ہے تو پھر اسے بتدریج وہ آسانیاں میسر آنا شروع ہو جاتی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔مرتب) پھر یہی وہ راستہ ہے جس میں دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کے لیے سرور ہی سرور اور راحت ہے۔اس کے نتائج عارضی اور وقتی نہیں بلکہ ابدی اور لازوال ہیں۔(تفہیم القران)

نوٹ:2

آیات۔8۔9۔میں انسانی کوششوں میں سے دوسری قسم کا بیان ہے جو اپنے ہر جز میں پہلی قسم کے ہر جز سے مختلف ہے۔عام طور پر لوگ اس آدمی کو کنجوس کہتے ہیں جو روپیہ پیسہ جوڑ کر رکھتا ہے اور اسے اپنے اور اپنے بال بچوں پر خرچ نہیں کرتا۔لیکن اس جگہ بخل سے مراد راہ خدا میں اور نیکی کے کاموں میں خرچ نہ کرنا ہے۔اس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنی ذات پر،اپنے عیش وآرام اور تفریحات پر تو دل کھول کر خرچ کرتا ہے،مگر کسی نیک کام کے لیے اس کی جیب سے کچھ نہیں نکلتا۔بے نیازی برتنے سے مراد یہ ہے کہ آدمی دنیا کے فائدہ ہی کو اپنی ساری تگ ودو کا مقصود بنالے اور اس بات کی کچھ پرواہ نہ کرے کہ کس کام سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور کس کام سے ناراض ہوتا ہے۔اس راستہ کو سخت اس لیے کہا گیا ہے کہ اس پر چلنے والا اگرچہ دنیوی لذتوں اور ظاہری کامیابیوں کے لالچ میں اس طرف جاتا ہے لیکن اس میں ہر وقت اپنی فطرت سے،اپنے ضمیر سے،اللہ کے بنائے ہوئے قوانین سے اور معاشرے سے اس کی جنگ جاری رہتی ہے۔اگر وہ کمزور ہو تو اس روش کے عوض اسے طرح طرح کی سزائیں بھگتنی ہوتی ہیں۔اور اگر وہ طاقتور اور بااثر ہو تو چاہے دنیا اس کے زور آگے دب جائے لیکن کسی کے دل میں اس کے لیے خیر خواہی،عزت اور محبت کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا،اور یہ جو فرمایا گیا کہ ایسے شخص کو ہم سخت راستے پر چلنے کی سہولت دیں گے،تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے بھلائی کے راستے پر چلنے کی توفیق سلب کر لی جائے گی۔برائی کے دروازے اس کے لیے کھول دیئے جائیں گے اور اسی کے اسباب اور وسائل اسے فراہم کر دیئے جائیں گے۔بدی کرنا اس کے لیے آسان ہو جائے گا۔(تفہیم القرآن)

نوٹ:3

آیت۔15 میں ہے کہ اس میں یعنی بھڑکتی آگ میں وہی گرے گا جو زیادہ شقی ہے۔یہاں بھڑکتی آگ سے شاید دوزخ کا وہ طبقہ مراد ہوگا جو بڑے بھاری مجرموں اور بدبختوں کے لیے مخصوص ہے۔(ترجمہ شیخ الہند)۔اس لحاظ سے آیت۔17۔کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جو جتنا زیادہ پرہیزگار ہوگا اس کو اس بھڑکتی آگ سے اتنا ہی دور رکھا جائے گا۔(مرتب)

2004

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

2029

سورۃ الضحیٰ (93)

آیت نمبر (1 تا 11)

س	ج	و

(ن) سَجۡوًا رات کا پرسکون ہونا۔ سنسان ہونا۔ خاموش ہونا۔ پھر اس سے مراد لیتے ہیں رات کا چھا جانا۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔ (اس کا مادہ ناقص واوی ہے اور اس کا ماضی کا صیغہ سجا یا سجی لکھا جاتا ہے یہاں اس کو سجیٰ (ناقص یائی کی طرح لکھنا قرآن کا مخصوص املا ہے)۔

ترکیب (آیت۔2) سَجٰی ماضی ہے لیکن اِذَا کی وجہ سے ترجمہ حال میں ہوگا۔ (آیات۔6۔7۔ اور 8۔ میں فَاٰوٰی، فَهَدٰی اور فَاَغۡنٰی، اِن تینوں کے آگے ضمیر مفعولی کَ محذوف ہے۔ (آیت۔7) اس میں ضَآلًّا اسم الفاعل ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں اس کی جمع ضَآلِّیۡنَ آئی ہے۔ وہاں اس کا ترجمہ 'گمراہ' کیا جاتا ہے۔ جبکہ یہاں اس کا ترجمہ راستہ تلاش کرنے والا کیا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے استادِ محترم پروفیسر حافظ احمد یار صاحب مرحوم نے فرمایا کہ انہوں نے متعدد ڈکشنریاں اور کُتب دیکھیں تو اس لفظ کے کوئی بارہ مختلف مفاہیم میں استعمال سامنے آئے۔ اور قرآن مجید میں بھی یہ متعدد مفاہیم میں آیا ہے۔ پھر انہوں نے تلاش کیا کہ اس لفظ کا وہ بنیادی معنی کیا ہے جس سے یہ تمام مفاہیم نکلتے ہیں۔ تو انہوں نے امام راغب اصفہانیؒ کے بیان کردہ معنی کو اس لحاظ سے سب سے زیادہ تسلی بخش پایا۔ امام صاحب نے اس کے معنی بتائے ہیں کہ مطلوبہ راستہ سے ہٹ جانا، خواہ قصداً ہو یا سہواً، معمولی ہو یا زیادہ۔ قرآن میں اس کے مختلف استعمال کا ایک خاکہ ذہن نشین کرنے کے لیے طلبا زیر حوالہ آیات کو قرآن میں دیکھ لیں۔ واضح رہے کہ یہ مکمل فہرست نہیں ہے البقرہ۔282۔ (اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا)۔ الانعام۔24۔ بنی اسرائیل۔67۔ الکہف۔104، طٰہٰ۔52۔ محمد۔1۔ (آیات۔9 تا 11) اَلۡيَتِيۡمَ اور اَلسَّآئِلَ کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ لَا تَقۡهَرۡ اور لَا تَنۡهَرۡ کے مفعول مقدم ہیں اور حَدِّثۡ کے مفعول پر بِ کا صلہ آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ یہ پورا فقرہ حَدِّثۡ کا مفعول مقدم ہے۔ اَلۡيَتِيۡمَ اور السَّآئِلَ پر لام جنس ہے۔

ترجمہ

وَالضُّحٰى ۙ﴿۱﴾	وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰى ۙ﴿۲﴾	مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ
قسم ہے چاشت کے وقت کی	اور قسم ہے رات کی جب سناٹا ہو جاتا ہے	نہ الوداع کہا آپؐ کو آپؐ کے رب نے

وَمَا قَلٰى ؕ﴿۳﴾	وَلَلۡاٰخِرَةُ	خَيۡرٌ لَّكَ	مِنَ الۡاُوۡلٰى ؕ﴿۴﴾
اور نہ وہ بیزار ہوا (آپؐ سے)	اور یقیناً بعد میں آنے والی (حالت)	بہتر ہے آپؐ کے لیے	پہلی سے

وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيۡكَ رَبُّكَ	فَتَرۡضٰى ؕ﴿۵﴾	اَلَمۡ يَجِدۡكَ	يَتِيۡمًا فَاٰوٰى ۪﴿۶﴾
اور یقیناً عنقریب عطا کرے گا آپؐ کو آپؐ کا رب	نتیجتاً آپؐ راضی ہو جائیں گے	کیا اس نے نہیں پایا آپؐ کو	یتیم تو اس نے رہنے کی جگہ دی (آپؐ کو)

وَوَجَدَكَ	ضَآلًّا	فَهَدٰى ۪﴿۷﴾	وَوَجَدَكَ عَآئِلًا
اور اس نے پایا آپؐ کو	راہ تلاش کرنے والا	تو اس نے رہنمائی کی (آپؐ کی)	اور اس نے پایا آپؐ کو تنگ دست

فَاَغۡنٰی ﴿۸﴾	فَاَمَّا	الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡهَرۡ ﴿۹﴾	2029
تو اس نے غنی کیا آپؐ کو)	پس وہ جو ہے، تو	کسی بھی یتیم کو پس آپؐ ذلیل مت کریں	اور وہ جو ہے، تو

السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ ﴿۱۰﴾	وَ اَمَّا	بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ ﴿۱۱﴾ ع
کسی بھی مانگنے والے کو پس آپؐ مت جھڑکیں	اور وہ جو ہے تو	اپنے رب کی نعمت کا آپؐ چرچا کریں

نوٹ: 1

اس سورہ میں پہلے آفاق کے شواہد سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح اس دنیا کی مادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے دن کی حرارت و روشنی کی ضرورت ہے اور رات کی خنکی اور تاریکی کی بھی، اسی طرح انسانی فطرت کی مخفی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو تنگی اور آسانی، دکھ اور سکھ، رنج اور راحت، دونوں طرح کے حالات سے گزارا جائے۔ جو لوگ زندگی کی تربیت میں ان امتحانوں کا مقام سمجھتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کی اعلیٰ صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور جو لوگ ان امتحانوں کی حکمت سے ناوقف ہوتے ہیں یا اپنی کم ہمتی کی وجہ سے ان سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتے جس کے لیے قدرت نے ان کو مقدر کیا ہے، وہ اپنے آپ کو اس مقام بلند سے محروم کر لیتے ہیں۔ جو اس امتحان سے گزرے بغیر انسان کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس اصولی حقیقت کو بیان کرنے کے بعد نبی ﷺ کو خطاب کر کے تسلی دی ہے کہ جس امتحان سے آپ گزر رہے ہیں وہ خدا کی طرف سے کسی عتاب کے سبب پیش نہیں آیا ہے بلکہ یہ اسی امتحان کا ایک حصہ ہے جو انسان کی روحانی و اخلاقی تربیت کے لیے ضروری ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 2

روایات میں ہے کہ جبریلؑ دیر تک رسول اللہ ﷺ کے پاس نہ آئے، یعنی وحی قرآنی بند رہی تو مشرکین کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) کو اس کے رب نے رخصت کر دیا۔ اس کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ لیکن میرا گمان یہ ہے کہ مخالفین نے اس وقت اس طرح کی باتیں کی ہوں جب سورۂ اِقرء کی ابتدائی آیات نازل ہونے کے بعد ایک طویل مدت تک وحی رکی رہی اور حضور ﷺ خود اس فترت (بندش) کے زمانے میں مضطرب رہے۔ یہاں تک کہ فرشتہ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یٰۤاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ کا خطاب سنایا۔ چنانچہ ابن کثیرؒ نے ابن اسحاق وغیرہ سے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ اسی احتمال کی تائید کرتے ہیں۔ ممکن ہے اسی دوران وہ قصہ بھی پیش آیا ہو جو بعض احادیث میں بیان ہوا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ بیماری کی وجہ سے دو تین رات نہ اٹھ سکے تو ایک عورت کہنے لگی ''اے محمد معلوم ہوتا ہے تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا ہے۔'' (العیاذ باللہ)۔ غرض ان سب خرافات کا جواب اس سورہ میں دیا گیا ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

واضح رہے کہ مکی دور میں جب قریش کی مخالفت زیادہ شدت اختیار کر گئی تو اس سے آپ ﷺ کو خاص پریشانی جو ہوئی وہ یہی ہوئی کہ ہو سکتا ہے ان لوگوں کی اس بیزاری میں آپ ﷺ کی کسی کوتاہی یا بے تدبیری کا کوئی دخل ہو جو اللہ تعالیٰ کے عتاب کا سبب بنی ہے۔ جس کے باعث یہ حالات پیش آ رہے ہیں۔ اس پریشانی میں قدرتی طور پر آپ ﷺ کو وحی کا انتظار ہوتا کیونکہ یہی وہ واحد چیز ہے جو تاریک حالات میں روشنی بھی دکھا سکتی ہے اور اسی سے آپ ﷺ کو یہ اندازہ بھی ہو سکتا تھا کہ آپ ﷺ فریضۂ دعوت رب کی منشا کے مطابق انجام دے رہے ہیں یا نہیں۔ حضور ﷺ کی ان پریشانیوں کا ذکر مکی سورتوں میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ اس آیت (نمبر 3) میں آپ ﷺ کو جو تسلی دی گئی ہے وہ ایسے ہی حالات میں دی گئی ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 3

آیت۔4۔ میں اٰخرۃ اور اُولیٰ کے الفاظ دنیا اور آخرت کے اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ عام مفہوم میں ہیں۔ یعنی دعوت کے آخری دور اور ابتدائی دور کے یا دعوت کے موجودہ دور اور اس کے مستقبل کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ اور یہ اسی تسلی کی مزید وضاحت ہے کہ اس وقت

جوحالات ہیں وہ بدل جائیں گے اور مستقبل موجودہ حال سے بہت بہتر ہوگا۔قدیم صحیفوں میں آنحضرت ﷺ سے متعلق بھی پیشن گوئیاں وارد ہوئی ہیں ان میں آپ ﷺ کی دعوت کے آغاز کو رائی کے دانے کی تمثیل سے سمجھایا ہے جو ہوتا تو نہایت چھوٹا ہے لیکن جب اُگتا ہے تو اس کا پودا سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ پرندے اس میں بسیرا لیتے ہیں۔(تدبر قرآن)۔

یہ خوشخبری اللہ تعالیٰ نے ایسی حالت میں دی تھی جبکہ مٹھی بھر آدمی آپ ﷺ کے ساتھ تھے، ساری قوم آپ ﷺ کی مخالف تھی اور بظاہر کامیابی کے آثار دور دور کہیں نظر نہ آتے تھے۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابتدائی دور کی مشکلات سے آپ ﷺ پریشان نہ ہوں۔ ہر بعد کا دور پہلے دور سے آپ ﷺ کے لیے بہتر ہوگا۔آپ ﷺ کی قوت، عزت اور قدر و منزلت برابر بڑھتی چلی جائے گی اور آپ ﷺ کا نفوذ و اثر پھیلتا چلا جائے گا۔اور اس میں یہ وعدہ بھی شامل ہے کہ آخرت میں جو مرتبہ آپ کو ملے گا وہ اُس مرتبہ سے بدرجہا بڑھ کر ہوگا جو دنیا میں آپ ﷺ کو حاصل ہوگا۔ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے سامنے وہ تمام فتوحات پیش کی گئیں جو میرے بعد میری اُمت کو حاصل ہونے والی ہیں۔ اس پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا کہ آخرت تمہارے لیے دنیا سے بھی بہتر ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:4

آیت۔5۔کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو اتنا دے گا کہ آپ ﷺ راضی ہو جائیں گے۔اس میں حق تعالیٰ نے یہ متعین کر کے نہیں بتایا کہ کیا دیں گے۔ اس میں اشارہ عموم کی طرف ہے کہ آپ ﷺ کی ہر مرغوب چیز آپ ﷺ کو اتنی دیں گے کہ آپ ﷺ راضی ہو جائیں۔آپ ﷺ کی مرغوب چیزوں میں اُمت کی ہر ضرورت، زمین میں اللہ کا کلمہ بلند کرنا اور دین حق پھیلانا سب داخل ہیں۔حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری اُمت کے بارے میں میری شفاعت قبول فرمائیں گے یہاں تک کہ حق تعالیٰ فرمائیں گے اے محمد (ﷺ) اب آپ راضی ہیں، تو میں عرض کروں گا اے میرے پروردگار میں راضی ہوں۔ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے وہ آیت تلاوت فرمائی جو حضرت ابراہیمؑ سے متعلق ہے۔﴿فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۳۶﴾ (سورہ ابراہیم:36) پھر دوسری آیت تلاوت فرمائی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ﴾ (المائدہ۔118)

پھر آپ ﷺ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔آپ ﷺ روتے رہے اور بار بار فرماتے تھے اَللّٰھُمَّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر جبریلؑ تشریف لائے اور پوچھا کہ آپؐ کیوں روتے ہیں۔تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی اُمت کی مغفرت چاہتا ہوں۔اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ سے فرمایا کہ جاؤ اور کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی اُمت کے بارے میں راضی کر دیں گے۔(معارف القرآن)۔

نوٹ:5

آنحضرت ﷺ کی ولادت سے پہلے ہی آپ ﷺ کے والد وفات پا چکے تھے۔ چھ سال کی عمر تھی کہ والدہ نے رحلت کی پھر آٹھ سال کی عمر تک اپنے دادا عبدالمطلب کی کفالت میں رہے۔آخر میں ظاہری تربیت و پرورش کی سعادت آپ ﷺ کے چچا ابوطالب کے حصے میں آئی۔ انہوں نے زندگی بھر آپ ﷺ کی نصرت و حمایت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ہجرت سے کچھ پہلے وہ بھی دنیا سے رخصت ہوئے۔ پھر یہ امانت الٰہی اللہ کے حکم سے انصارِ مدینہ کے گھر پہنچ گئی۔اوس اور خزرج کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا اور انہوں نے اس کی حفاظت اس طرح کی جس کی نظر چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ فَاٰوٰی کے تحت میں داخل ہیں۔(ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:6

یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جو رسوم و روایات خاندان کے بزرگوں سے ملیں ان پر آپ ﷺ کی سلیم

فطرت مطمئن نہ ہوسکی اور دوسری کوئی ایسی روشنی تھی نہیں جو آپ ﷺ کے لیے سرمایہ تسکین بنتی۔ آسمانی مذاہب سے پیروکار جو آپ ﷺ کے اردگرد تھے ان کے عقائد واعمال اس قدمسخ ہو چکے تھے کہ کوئی حقیقت کو تلاش کرنے والا ان سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ اس صورتِ حال نے آپ ﷺ کو ذہنی کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ آپ ﷺ کی اسی کشمکش کو آیت۔ 7۔ میں وَوَجَدَكَ ضَآلًّا کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے بھی فطرت سلیم پر ہوتے ہیں۔ لیکن فطرت عقائد واعمال کی موٹی موٹی باتوں ہی میں رہنمائی کرتی ہے لیکن عقائد واعمال کے تمام لوازمات کی وہ تشریح نہیں کرسکتی۔ اس وجہ سے فطرت پر ہونے کے باوجود ایک شخص یہ جاننے کا محتاج رہتا ہے کہ جس خدا کے وجود پر اس کا دل گواہی دے رہا ہے اس کی صفات کیا ہیں اور ان صفات کے تقاضے کیا ہیں۔ اس کے کیا حقوق بندے پر عائد ہوتے ہیں اور وہ کس طرح ادا کرنے ہیں۔ زندگی کی ایک ضابطہ بندی کس طرح کی جائے کہ وہ پوری کی پوری خالق کی پسند کے مطابق ہوجائے یہی سوالات ہیں جو نبی ﷺ کے دل پر زندگی کے اس دور میں مستولی تھے جس کی طرف وَوَجَدَكَ ضَآلًّا کے الفاظ اشارہ کررہے ہیں۔ بعثت سے پہلے غارِ حرا کی تنہائیوں میں آپ ﷺ انہی گتھیوں کو سلجھانے میں گم رہے۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب میں دین حنیفی کے پیروکاروں کا حال کتابوں میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ ان میں سے بعض افراد ایسی شدید الجھن میں مبتلا تھے کہ وہ بیت اللہ سے ٹیک لگا کر حرم میں بیٹھ جاتے تھے اور نہایت حسرت کے ساتھ کہتے تھے کہ اے رب ہم نہیں جانتے کہ تیری عبادت کس طرح کریں ورنہ اسی طرح کرتے۔ یہی حال اس وقت تک نبی ﷺ کا بھی رہا ہوگا جب تک آپ ﷺ کتاب سے روشناس نہیں ہوئے۔ چنانچہ سورۂ شوریٰ کی آیت۔ 52۔ میں اسی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف ایک روح وحی کی جو ہمارے امر میں سے ہے۔ نہ تم کتاب سے آشنا تھے اور نہ ایمان سے لیکن ہم نے اس وحی کو روشنی بنایا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں۔'' (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 7

آیت۔ 10۔ کے دو معنی ہیں۔ اگر سائل کو مدد مانگنے والے حاجت مند کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مدد کرسکتے ہو تو کردو، ورنہ نرمی کے ساتھ معذرت کرلو، مگر بہرحال اسے جھڑکو نہیں۔ اور اگر سائل کو پوچھنے والے کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پوچھنے والا خواہ کیسا ہی جاہل اور اُجڈ ہو اور خواہ کتنے ہی نامعول طریقے سے سوال کرے، بہرحال اسے شفقت کے ساتھ جواب دو اور علم کا زعم رکھنے والے بدمزاج لوگوں کی طرح اسے جھڑک کر دور مت کرو۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 8

نعمت کا لفظ عام ہے۔ اس سے مراد وہ نعمتیں بھی ہیں جو اس سورہ کے نزول تک اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمائی تھیں اور وہ نعمتیں بھی جو بعد میں عطا کیں۔ پھر حکم یہ ہے کہ اے نبی ﷺ ہر نعمت جو اللہ نے تم کو دی ہے اس کا ذکر اور اس کا اظہار کرو۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ ہر نعمت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اظہار کی ایک صورت چاہتی ہے۔ مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ زبان سے اللہ کا ذکر ادا کرے اور اس بات کا اقرار واعتراف کرے کہ جو نعمتیں بھی مجھے حاصل ہیں یہ سب اللہ کا فضل واحسان ہیں اور کوئی چیز بھی میرے کسی ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ نعمت نبوت کا اظہار یہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کا حق ادا کیا جائے۔ نعمت قرآن کا اظہار یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کی اشاعت کی جائے اور اس کی تعلیمات لوگوں کے ذہن نشین کی جائیں۔ نعمت ہدایت کا اظہار یہ ہے کہ اللہ کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو سیدھا راستہ بتایا جائے اور اس کام کی ساری تلخیوں اور ترشیوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ الغرض یہ ایک بڑی جامع ہدایت تھی جو اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سے فقرے میں دی۔ (تفہیم القرآن)۔

ہر نعمت کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ مالی نعمت کا شکریہ ہے کہ اس مال میں سے کچھ اللہ کے لیے اخلاص نیت کے ساتھ خرچ کرے۔ نعمت بدن کا شکریہ ہے کہ جسمانی طاقت کو اللہ تعالیٰ کے واجبات ادا کرنے میں صرف کرے۔ علم و معرفت کا شکریہ ہے کہ دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 9

سورۂ والضحیٰ سے آخر قرآن تک ہر سورت کے ساتھ تکبیر کہنا سنت ہے۔ اس تکبیر کے الفاظ شیخ صالح مصری نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ بتلائے ہیں۔ ابن کثیر نے ہر سورت کے ختم پر بغوی نے ہر سورت کے شروع میں ایک مرتبہ تکبیر کہنے کو سنت کہا ہے۔ دونوں میں جو صورت بھی اختیار کرے سنت ادا ہو جائے گی۔

سورۂ ضحیٰ سے آخر قرآن تک بیشتر سورتوں میں رسول اللہ ﷺ پر حق تعالیٰ کے خاص انعامات اور آپ ﷺ کے مخصوص فضائل کا ذکر ہے اور چند سورتوں میں قیامت اور اس کے احوال کا۔ قرآن حکیم کا شروع خود قرآن کی عظمت اور ناقابل شک و شبہہ ہونے سے کیا گیا اور ختم قرآن اس ذات کی عظمت و شان پر کیا گیا جس پر قرآن نازل ہوا۔ (معارف القرآن)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الم نشرح (94)

آیت نمبر (1 تا 8)

ترجمہ

اَلَمْ نَشْرَحْ	لَكَ صَدْرَكَ ۝١	وَوَضَعْنَا	عَنْكَ وِزْرَكَ ۝٢
کیا ہم نے کھول نہیں دیا	آپؐ کے لیے آپؐ کے سینے کو	اور ہم نے اتارا	آپؐ سے آپؐ کے بوجھ کو

الَّذِيْٓ اَنْقَضَ	ظَهْرَكَ ۝٣	وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝٤
وہ (بوجھ) جس نے ٹوٹنے کے قریب کیا	آپؐ کی پیٹھ کو	اور ہم نے بلند کیا آپؐ کے لیے آپؐ کے ذکر کو

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٥	اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦	فَاِذَا فَرَغْتَ
پس یقیناً سختی کے ساتھ ایک نرمی ہے	بیشک مشکل کے ساتھ آسانی ہے	پھر جب آپؐ فارغ ہوں

فَانْصَبْ ۝٧	وَاِلٰى رَبِّكَ	فَارْغَبْ ۝٨
تو آپؐ کوشش کریں	اور اپنے رب کی طرف ہی	پھر آپؐ التجا کریں

نوٹ: 1

شرح صدر (سینہ کھولنے) کا لفظ قرآن میں جن مواقع پر آیا ہے ان پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر قسم کے ذہنی خلجان اور تردد سے پاک ہو کر اس بات پر مطمئن ہو جانا کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے۔ دوسرا یہ کہ نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی اس میں ہمت پیدا ہو جائے۔ مثلاً سورۂ انعام۔ آیت۔ 125۔ میں ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ یہاں یہ لفظ پہلے معنی میں ہے۔ جبکہ سورۂ طٰہٰ۔ آیات۔ 25۔ 26۔ میں ہے کہ نبوت ملنے کے موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ اے میرے رب میرا سینہ میرے لیے کھول دے اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے۔

یہاں یہ دوسرے معنی میں ہے غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس سورہ کی پہلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کا سینہ کھول دینے سے یہ دونوں معنی مراد ہیں۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

وِزْرَ سے مراد غم کا بوجھ ہے جو بعثت سے پہلے آپ ﷺ کے دل پر اس سبب سے تھا کہ آپ ﷺ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں تھے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ پھر جب اللہ نے آپ ﷺ پر ہدایت کی راہ کھول دی تو اس غم پر مزید اضافہ اس سبب سے ہوا کہ آپ ﷺ کی پوری قوم دشمن بن کر کھڑی ہوگئی۔ اور توقع کے خلاف جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ جتنی دعوت کی راہ میں آپ ﷺ کی سرگرمی بڑھتی جارہی تھی اتنی ہی لوگوں کی مخالفت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، تو قدرتی طور پر آپ ﷺ کو یہ گمان گزرا کہ شاید آپ ﷺ کی جدو جہد میں کہیں کوئی کمی ہے۔ علاوہ ازیں اس طرح کے حالات میں اگر وحی کے آنے میں کچھ وقفہ ہو جاتا تو یہ وقفہ بھی آپ ﷺ کی پریشانی میں اضافہ کر دیتا۔ حضور ﷺ کی ان پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے جس طرح پچھلی سورہ میں تسلی دی گئی ہے اسی طرح یہاں بھی دی گئی ہے۔(تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

رسول اللہ ﷺ کا ذکر بلند کرنے کی بات اس زمانے میں فرمائی گئی تھی جب کوئی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ جس کے ساتھ گنتی کے چند آدمی ہیں اور وہ بھی صرف شہر مکہ تک محدود ہیں اس کا ذکر دنیا بھر میں کیسے بلند ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان ہی حالات میں یہ خوشخبری سنائی اور پھر عجیب طریقہ سے اسے پورا کیا۔ سب سے پہلے اس نے آپ ﷺ کے رفع ذکر کا کام خود آپ ﷺ کے دشمنوں سے لیا۔ حج کے موقع پر جب تمام عرب سے لوگ ان کے شہر میں آتے تھے، اس زمانے میں کفار مکہ کے وفود حاجیوں کے ڈیرے پر جاتے اور لوگوں کو خبردار کرتے کہ یہاں ایک شخص ہے جو لوگوں پر جادو کرتا ہے تو باپ بیٹے، بھائی بھائی اور شوہر بیوی میں جدائی پڑ جاتی ہے۔ اس لیے اس سے بچ کے رہنا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے گوشے گوشے میں آپ ﷺ کا نام پہنچ گیا۔ اس کے بعد ہجرت سے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوا جس میں منافقین، یہود اور تمام عرب کے مشرکین آپ ﷺ کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے۔ دشمنوں نے جنگ سے حضور ﷺ کے اثر کو مٹانے کی کوشش کی مگر آپ ﷺ کی قیادت میں اہل ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس نے نظم وضبط، شجاعت اور اخلاقی حدود کی پابندی سے اپنی برتری ثابت کر کے سارے عرب سے اپنا لوہا منوالیا۔ اور دس سال کے اندر اندر حضور ﷺ کا رفع ذکر اس طرح ہوا کہ عرب کا گوشہ گوشہ کلمہ شہادت کی صدا سے گونج اٹھا۔

پھر تیسرے مرحلے کا آغاز خلافتِ راشدہ کے دور سے ہوا جب آپ ﷺ کا نام مبارک تمام روئے زمین میں بلند ہونا شروع ہوا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جارہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک بڑھتا چلا جائے گا۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور دن میں پانچ مرتبہ اذان میں آپ ﷺ کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، نمازوں میں آپ ﷺ پر درود نہ بھیجا جارہا ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپ ﷺ کا ذکرِ خیر نہ ہو۔ سال کے بارہ مہینوں میں سے کوئی دن، اور دن کے 24 گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب روئے زمین میں کسی نہ کسی جگہ آپ ﷺ کا ذکر نہ ہو رہا ہو۔ نبوت کے ابتدائی دور میں جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اس وقت کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ یہ رفع ذکر اس شان سے اور اتنے بڑے پیمانے پر ہوگا۔ یہ قرآن کی صداقت کا ایک اور کھلا ہوا ثبوت ہے۔(تفہیم القرآن)

نوٹ:4

آیات۔5۔6۔ سے پہلے جو باتیں کہی گئیں ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ہم نے آپ ﷺ کے لیے آپ ﷺ کا سینہ کھولا۔ آپ ﷺ سے آپ ﷺ کا بوجھ ہٹایا۔ آپ ﷺ کے لیے آپ ﷺ کا ذکر بلند کیا۔ لیکن ان آیات میں یہ نہیں کہا کہ آپ ﷺ کی مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بلکہ بات کو عمومی انداز میں کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ دراصل آفاقی صداقت (Classical Truth) کا بیان ہے یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی رائج تھا۔ البتہ حیاتِ طیبہ کے دوران وہ اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ لیکن اس کے بعد یہ قاعدہ ختم نہیں ہوگیا۔ بلکہ آج بھی ہلکے پیمانے پر جاری ہے۔ اور مومن۔ مسلم۔ کافر۔ دہریہ سب کی زندگی میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ (مرتب)۔ اب اگر دنیا میں کسی شخص کو عُسر کے بعد یُسر نصیب نہ تو وہ اس آیت کے منافی نہیں ہے۔ البتہ عادۃُ اللہ اب بھی یہی ہے کہ جو شخص سختی پر صبر کرے اور آسانی میں دیر ہونے سے آس نہ توڑ بیٹھے تو ضرور اللہ تعالیٰ اس کے حق میں آسانی کردے گا۔ بعض روایات حدیث میں بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ (معارف القرآن)

یہاں اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ ایک ہی بات دو مرتبہ فرمائی گئی ہے۔ یہ تکرار محض تاکید کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ عُسر اور یُسر دنیا میں لازم وملزوم ہیں۔ ایک گھاٹی کسی نے پار کرلی تو وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ بس اب کسی گھاٹی سے اس کو سابقہ نہیں پیش آنا ہے بلکہ دوسری اور تیسری گھاٹی بھی آسکتی ہے۔ چاہیے کہ ان کو عبور کرنے کا حوصلہ بھی قائم رکھے۔ زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ اس جہاں میں ہر مسافر کو نشیب وفراز سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان سے گزرنے کے بعد ہی کوئی مسافر منزل مقصود پر پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ حق کے راستے پر چلنے والوں سے بھی ہے۔ جو لوگ اس راستہ پر چلنے کا ارادہ کرتے ہیں ان کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ راستے کی تمام مشکلات خود بخود دور ہوجائیں، بلکہ ان کو دور کرنے کے لیے خود ان کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے یہ ضمانت ضرور ہے کہ اگر وہ راہ کی رکاوٹوں سے ہمت نہیں ہاریں گے تو وہ ان کے لیے ہر مشکل کے بعد آسانی پیدا کرے گا۔ جس سے تازہ دم ہو کر وہ آگے کے سفر کے لیے مزید عزم وحوصلہ کرلیں گے۔ اس طرح ایک کے بعد دوسری مشکل سے لڑتے اور اس کو سر کرتے ہوئے بالآخر منزل مطلوب پر پہنچ جائیں گے۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:5

آیات۔7۔8۔ کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ دعوت حق اور تبلیغ احکام سے فارغ ہوں تو دوسری محنت کے لیے تیار ہوجایئے۔ وہ یہ کہ نماز، ذکر اللہ اور دعا واستغفار میں لگ جائیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت وتبلیغ، خلق خدا کو راستہ دکھانا اور ان کی اصلاح کی فکر، یہ آپ ﷺ کی سب سے بڑی عبادت تھی۔ مگر یہ عبادت بواسطہ مخلوق تھی۔ آیت کا مقصود یہ ہے کہ اسی عبادت بالواسطہ پر آپ ﷺ قناعت نہ کریں، بلکہ جب اس سے فرصت ملے خلوت میں بلاواسطہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور اسی سے کام میں کامیابی کی دعا کریں۔ اصل مقصود جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے وہ عبادت بلاواسطہ ہی ہے۔ شاید اسی لیے عبادت بالواسطہ سے فراغت کا ذکر فرمایا کہ وہ کام ایک ضرورت کے لیے ہے، اس سے فراغت ہوسکتی ہے اور توجہ الی اللہ ایسی چیز ہے کہ اس سے فراغت مومن کو کبھی نہیں ہوسکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم وتبلیغ کا کام کرنے والوں کو اس سے غافل نہیں ہونا چاہیے اور کچھ وقت توجہ الی اللہ کے لیے بھی مخصوص ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر تبلیغ مؤثر نہیں ہوتی اور اس میں نور وبرکت نہیں ہوتی۔ (معارف القرآن)

2029

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ التین (95)

آیت نمبر (1 تا 8)

ترجمہ

وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ ۙ﴿۱﴾	وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ ۙ﴿۲﴾	وَہٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ ۙ﴿۳﴾
قسم ہے انجیر کی اور قسم ہے زیتون کی	اور قسم ہے سینین کی (کوہِ) طور کی	اور قسم ہے اس امن والے شہر کی

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ	فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾	ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ
بیشک ہم نے پیدا کیا انسان کو	بہترین تعدیل وتناسب میں	پھر ہم نے لوٹایا اس کو

اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾	اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا	وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
پست ہونے والوں کا سب سے پست	سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے	اور انہوں نے عمل کیے نیکیوں کے

فَلَہُمۡ اَجۡرٌ	غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ؕ﴿۶﴾	فَمَا یُکَذِّبُکَ	بَعۡدُ
تو ان کے لیے ایک ایسا اجر ہے جو	غیر منقطع ہے	تو کیا چیز (دلیل) جھٹلا سکتی ہے آپ کو	اس کے بعد

بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۷﴾	اَلَیۡسَ اللّٰہُ	بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۸﴾
بدلے کے بارے میں	کیا اللہ نہیں ہے	تمام حاکموں کا سب سے بڑا حاکم

نوٹ: 1

پہلی آیت کی تفسیر میں ایک رائے یہ ہے کہ انجیر سے مراد یہی انجیر ہے جسے لوگ کھاتے ہیں اور زیتون سے مراد یہی زیتون ہے جس سے تیل نکالا جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ ایک عام عربی دان ان الفاظ کو سُن کر یہی معنی لے گا۔ لیکن دو وجوہ ایسے ہیں جو یہ معنی لینے میں رکاوٹ ہیں۔ ایک یہ کہ آگے طور سینا اور شہر مکہ کی قسم کھائی گئی ہے اور دو پھلوں کے ساتھ دو مقامات کی قسم کھانے میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ دوسرے ان چار چیزوں کی قسم کھا کر آگے جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس طور سینا اور شہر مکہ تو دلالت کرتے ہیں لیکن یہ دو پھل اس پر دلالت نہیں کرتے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ تین سے مراد دمشق کا شہر ہے اور زیتون سے مراد بیت المقدس ہے۔ یہ الفاظ سُن کر یہ معنی ایک عام عرب کے ذہن میں نہیں آسکتے کیونکہ اہل عرب میں یہ بات معروف نہیں تھی کہ تین اور زیتون ان مقامات کے نام ہیں۔

البتہ یہ طریق اہلِ عرب میں رائج تھا کہ جو پھل کسی علاقے میں کثرت سے پیدا ہوتا ہو اس علاقے کو بسا اوقات اس پھل کے نام سے موسوم کر دیتے تھے۔ اس محاورے کے لحاظ سے تین اور زیتون کے الفاظ کا مطلب ان کی پیداوار کا علاقہ ہوسکتا ہے۔ اور وہ ملک شام اور ملک فلسطین کا علاقہ ہے کیونکہ اس زمانے میں یہی علاقہ ان کی پیداوار کے لیے مشہور تھا۔ (تفہیم القرآن)۔

اس طرح ان قسموں میں وہ تمام مقاماتِ مقدسہ شامل ہوگئے جہاں خاص خاص انبیاءؑ پیدا اور مبعوث ہوئے ملک شام عام انبیاءؑ کا وطن ہے۔ کوہ طور حضرت موسیٰؑ کے حق تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کی جگہ ہے۔ جبکہ سینین یا سینا اس مقام کا نام ہے جہاں یہ پہاڑ واقع ہے۔ اور مکہ مکرمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسکن ہے۔ (معارف القرآن)

نوٹ: 2

چار چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ ہم نے انسان کو بہترین تقویم پر پیدا کیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی جبلت وفطرت کو بھی دوسری مخلوقات کے

اعتبار سے احسن بنایا گیا ہے۔ اور اس کی جسمانی ہیئت اور شکل وصورت کو بھی دوسرے جانداروں سے بہتر اور حسین بنایا گیا ہے۔ ابن عربی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں کوئی انسان سے احسن نہیں کیونکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے حیات کے ساتھ عالم۔ قادر۔ متکلم۔ سمیع۔ بصیر۔ مدبر اور حکیم بنایا ہے اور یہ سب صفات دراصل خود اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔ مراد اس سے یہی ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا کوئی درجہ اس کو بھی دیا گیا ہے۔ ورنہ حق تعالیٰ ہر شکل وصورت سے بَری ہے۔ (معارف القرآن)

تقویم کے بنیادی معنی کسی چیز کو سیدھا کرنے کے ہیں۔ سیدھی کی ہوئی چیز میں حسن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کی لمبائی اور چوڑائی میں ایک اعتدال اور تناسب ہو۔ خطاطی کے ماہر فن لوگ اگر الف لکھیں گے تو اس کی لمبائی اور موٹائی کے تناسب کا لحاظ رکھیں گے، اسی طرح الفاظ کے تمام حروف کے قدو کاٹھ میں اعتدال اور تناسب کا لحاظ رکھا جائے گا۔ جو خطاط جتنا مناسب اعتدال وتناسب قائم کرلیتا ہے اس کی خطاطی دیکھنے میں اتنی ہی خوبصورت ہوتی ہے۔ (حافظ احمد یار صاحب کے کیسٹ سے ماخوذ)۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر جب ہم غور کرتے ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے انسان کی جسمانی ساخت میں اس کی صلاحیتوں میں اور اس کی استعداد میں جبر وقدر کا ایک بڑا عجیب توازن کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ہماری آنکھ دیکھ سکتی ہے، کان سن سکتے ہیں لیکن ان کی یہ استعداد لامحدود نہیں ہے۔ ایک خاص فاصلہ سے آگے کی آواز ہمارے کان نہیں سن سکتے۔ جبکہ اس فاصلے پر موجود چیزوں کو آنکھ دیکھ سکتی ہے لیکن ایک حد سے آگے آنکھ بھی نہیں دیکھ سکتی۔ ہم کو نفس امارہ دیا گیا ہے تو ساتھ ہی نفس لوامہ بھی دیا گیا ہے۔ اس انداز میں انسان کی فطرت وجبلت پر غور کریں تو ہر جگہ ہمیں توازن، اعتدال اور تناسب کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ دوسری مخلوقات کو یہ حسن اتنا نہیں دیا گیا جتنا انسان کو دیا گیا ہے۔ (مرتب)۔

نوٹ: 3

اس کے آگے۔ ۵۔ میں فرمایا کہ پھر ہم نے اس کو لوٹا دیا پست ترین لوگوں میں۔ یہ مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے کہ پست ترین مخلوق میں یعنی درندوں سے بھی بدتر۔ (مرتب)۔ مفسرین نے عام طور پر اس آیت کے دو معنی بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے اسے ارذل العمر یعنی بڑھاپے کی ایسی حالت کی طرف پھیر دیا جس میں وہ کچھ سوچنے اور کام کرنے کے قابل نہ رہا۔ دوسرے یہ کہ ہم نے اسے جہنم کے سب سے نیچے درجے کی طرف پھیر دیا۔ لیکن اس سورہ کا مقصود جزا وسزا کے برحق ہونے پر استدلال کرنا ہے۔ اس لیے یہ دونوں معنی اس مقصود کلام کے لیے دلیل نہیں بنتے۔ ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کے بعد انسان اپنے جسم اور ذہن کی طاقتوں کو بُرائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے برائی ہی کی توفیق دیتا ہے اور گراتے گراتے اسے گراوٹ کی اس انتہا تک پہنچا دیتا ہے کہ کوئی مخلوق گراوٹ میں اس حد کو پہنچی ہوئی نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے اندر بکثرت مشاہدے میں آتی ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

اس آیت میں ثُمَّ رَدَدْنٰهُ کے الفاظ آئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ لوٹانے کے عمل کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کر رہا ہے لیکن ذمہ دار انسان ہے۔ یہ وہی اندازِ کلام ہے جو قرآن میں جا بجا استعمال ہوا ہے اور سب سے پہلے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ والی آیت میں آیا تھا۔ وہیں پر اس کی وضاحت کردی گئی ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/ البقرۃ:7، نوٹ۔4) (مرتب)۔

نوٹ: 4

آیت۔7۔8 کا مفہوم یہ ہے کہ بہترین ساخت پر پیدا کیے ہوئے انسانوں میں سے ایک گروہ اعمالِ بد اختیار کرنے کے نتیجے میں اخلاقی 2029 پستیوں میں گرتے گرتے سب نیچوں سے بھی نیچے چلا جاتا ہے اور دوسرا گروہ اعمال صالح اختیار کرنے کے نتیجے میں اسی حالت پر قائم رہتا ہے جو بہترین ساخت پر انسان کو پیدا کرنے سے مطلوب تھی۔ اس کے بعد بدلے کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے۔ کیا عقل یہ کہتی ہے کہ دونوں قسم کے انسانوں کا انجام یکساں ہو۔ جب دنیا کے چھوٹے چھوٹے حاکموں سے تم یہ چاہتے ہو کہ وہ انصاف کریں، مجرموں کو سزا دیں اور اچھے کام کرنے والوں کو انعام دیں، تو خدا کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ تو کیا اس کے بارے میں تمہارا خیال ہے کہ وہ انصاف نہیں کرے گا؟ کیا وہ بُرے اور بھلے کو ایک جیسا کر دے گا۔ (تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ العلق (96)

آیت نمبر (1 تا 5)

اِقۡرَاۡ	بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ	خَلَقَ ۚ ﴿۱﴾	خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ
آپؐ پڑھیئے	اپنے اس رب کے نام کے ساتھ جس نے	پیدا کیا (ہر چیز کو)	اس نے پیدا کیا انسان کو

مِنۡ عَلَقٍ ۚ ﴿۲﴾	اِقۡرَاۡ	وَ رَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۙ ﴿۳﴾	الَّذِىۡ عَلَّمَ	بِالۡقَلَمِ ۙ ﴿۴﴾
ایک چمٹے ہوئے خون سے	آپؐ پڑھیئے	اور آپؐ کا رب ہی سب سے زیادہ کریم ہے	وہ، جس نے علم دیا	قلم کے ذریعہ سے

عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ	مَا	لَمۡ يَعۡلَمۡ ؕ ﴿۵﴾
اس نے علم دیا انسان کو	اس کا جس کو	اس نے جانا ہی نہیں

نوٹ: 1

علماء کی اکثریت کا اتفاق ہے کہ وحی کی ابتدا سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیات سے ہوئی ہے۔ بعض حضرات نے سورۂ مدثر کو اور بعض نے سورۂ فاتحہ کو پہلی سورت قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ علق کی پانچ آیات نازل ہونے کے بعد نزولِ قرآن کچھ عرصہ تک موقوف رہا۔ اس کے بعد پھر اچانک حضرت جبرئیل علیہ السلام سامنے آئے اور سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ اس وقت بھی رسول اللہ ﷺ پر وہی کیفیت طاری ہوئی جو سورۂ علق کے نزول کے وقت پیش آئی تھی۔ اس لحاظ سے اس کو بعض حضرات نے پہلی سورت کہا ہے۔ ۹ اور سورۂ فاتحہ کو پہلی سورت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ مکمل سورت سب سے پہلے سورۂ فاتحہ ہی نازل ہوئی ہے، اس سے پہلے چند سورتوں کی متفرق آیات ہی کا نزول ہوا تھا۔

ایک طویل حدیث میں وحی کی ابتدا کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ (اس حدیث کی تفصیل تفاسیر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہم صرف اس کے اہم نکات درج کر رہے ہیں۔ مرتب) سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ پر وحی کا سلسلہ سچے خوابوں سے شروع ہوا۔ اس کے بعد آپ ﷺ میں خلوت میں عبادت کرنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ یہ عبادت لوگوں سے الگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ خاص اور تفکر کی تھی۔

غارِ حرا میں خلوت گزینی کی مدت ایک ماہ ہے یعنی آپ ﷺ نے پورے ماہ رمضان اس میں قیام فرمایا۔ وہاں حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا اِقْرَاْ۔ جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔ تو جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو آغوش میں لے کر دبایا۔ اس طرح تین مرتبہ ہوا۔ پھر انہوں نے پانچ آیات پڑھیں۔ یہ آیتیں لے کر آپ ﷺ گھر واپس آئے۔ آپ ﷺ پر گھبراہٹ طاری تھی۔ جب آپ ﷺ کو آفاقہ ہوا تو آپ ﷺ نے بی بی خدیجہؓ کو سارا واقعہ سنایا۔ وہ انہیں اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ انہوں نے سنتے ہی کہا یہ وحی فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُتارا تھا۔ کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ ﷺ کی قوم آپ ﷺ کو وطن سے نکالے گی، کیونکہ جب بھی کوئی آدمی یہ دین حق لے کر آیا جو آپ ﷺ لائے ہیں تو اس کی قوم نے اس کو ستایا ہے۔ اس کے چند ہی روز بعد ورقہ بن نوفل کا انتقال ہوگیا۔ اس واقعہ کے بعد وحیٔ قرآن کا سلسلہ رُک گیا۔ روایات میں وحی میں وقفہ کی مدت ڈھائی سے تین سال تک بیان کی گئی ہے۔ (معارف القران۔ ج۸، ص ۷۸۴ سے ماخوذ)۔

یہ قصہ خود اپنے منہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک بھی رسول اللہ ﷺ اس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپ ﷺ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اس چیز کا طلب یا متوقع ہونا تو درکنار آپ ﷺ کے وہم وگمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ پیش آنے والا ہے۔ فرشتے کا اس طرح سامنے آنا ایک حادثہ تھا جس کا پہلا تاثر آپ ﷺ کے اوپر وہی وہا جو ایک انسان پر فطری طور پر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ﷺ اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو مکہ کے لوگوں نے آپ ﷺ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے، مگر ان میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی خطرہ تھا کہ آپ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں کیونکہ آپ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے، دوسری بات یہ ہے کہ ورقہ بن نوفل مکہ کے باشندے تھے، بچپن سے حضور ﷺ کی زندگی دیکھتے چلے آرہے تھے اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر وہ آپ ﷺ کے حالات سے اور زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے جب یہ واقعہ سنا تو اِسے کوئی وسوسہ نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ وہی فرشتہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک آپ ﷺ اتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپ ﷺ کا نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابل تعجب بات نہ تھی۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آپ۔۵۔ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اصل میں بالکل بے علم تھا۔ اسے جو کچھ بھی علم حاصل ہوا ہے وہ اللہ کے دینے سے حاصل ہوا ہے۔ اللہ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولنے چاہے وہ اس پر کھلتے چلے گئے۔ جن جن چیزوں کو انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے درحقیقت وہ پہلے اس کے علم میں نہ تھیں، اللہ ہی نے جب چاہا ان کا علم اسے دیا (تفہیم القرآن)۔ یہ وہ مادی علوم ہیں، جن کا دروازہ کھولنے کا جب اللہ تعالیٰ فیصلہ کر لیتا ہے تو انسان اپنے حواس خمسہ کے ذریعے اور اپنی عقل کی مدد سے ان تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن اس کائنات کے وہ حقائق جو انسان کے حواس خمسہ اور عقل کی پہنچ سے باہر ہیں، ان کی تعلیم کے لیے رسل وکتب کا سلسلہ قائم کیا تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ پر اس علم وحی کے فائنل ایڈیشن کا نزول ہوا۔ جبکہ مادی علوم کی تعلیم کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ (مرتب)

آیت نمبر (6تا19)

س ف ع

(ف) سَفْعًا کسی کو پکڑ کر گھسیٹنا۔ کھینچنا۔ زیر مطالعہ آیت۔15۔

ز ب ن

(ض) زَبْنًا ٹکر لگانا۔ دھکے دینا۔

زِبْنِيَةٌ ج زبانِيَةٌ۔ سخت انسان یا جن۔ سپاہی۔ زیر مطالعہ آیت۔18۔

ترکیب

(آیت۔8) اَلرُّجْعٰى فُعْلٰى کا وزن ہے لیکن یہ افعل تفضیل میں واحد مونث نہیں ہے بلکہ یہ رَجَعَ۔ یَرْجِعُ کا ایک مصدر ہے۔ فُعْلٰى کے وزن پر کچھ مصدر بھی آتے ہیں۔ (آیات۔11۔13) ان دونوں آیات میں اِنْ شرطیہ ہے۔ دونوں کا جواب شرط محذوف ہے جسے ترجمہ میں ظاہر کیا جائے گا۔ (آیت۔15) يَنْتَهِ دراصل مضارع يَنْتَهِيْ ہے۔ اس کو لَمْ نے مجزوم کیا تو یا گر گئی۔ لَنَسْفَعًا دراصل مضارع نَسْفَعُ ہے۔ اس پر لام تاکید اور نون خفیفہ داخل ہوا تو یہ لَنَسْفَعَنْ ہو گیا اور عربی میں یہ اسی طرح لکھا جاتا ہے۔ یہ قرآن کا مخصوص املا ہے کہ نون خفیفہ کی جگہ تنوین لگا کر الف کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ ایسا قرآن میں صرف دو مرتبہ ہوا ہے۔ ایک اس جگہ اور دوسری سورۂ یوسف کی آیت۔32۔ میں لَيَكُوْنَنْ کو لَيَكُوْنًا لکھا گیا ہے۔ (آیت۔16) نَاصِيَةٍ سابقہ آیت میں بِالنَّاصِيَةِ کا بدل ہونے کی وجہ سے حالتِ جَر میں ہے اور یہ نکرہ موصوفہ ہے۔ حالانکہ بِالنَّاصِيَةِ معرفہ ہے اور اس کا بدل نَاصِيَةٍ نکرہ ہے۔ لیکن نکرہ موصوف ہو تو معرفہ سے بدل پڑ سکتا ہے۔ (تدبر قرآن) كَاذِبَةٍ اور خَاطِئَةٍ اس کی صفت ہونے کی وجہ سے حالتِ جَر میں ہیں۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ	لَيَطْغٰٓى ۙ﴿۶﴾	اَنْ رَّاٰهُ	اسْتَغْنٰى ؕ﴿۷﴾	اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ
ہرگز نہیں! بیشک انسان	ضرور سرکشی کرتا ہے	(جب) کہ وہ دیکھے خود کو	بے نیاز	بے شک آپؐ کے رب کی طرف ہی

الرُّجْعٰى ؕ﴿۸﴾	اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ﴿۹﴾	عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ؕ﴿۱۰﴾	اَرَءَيْتَ
لوٹنا ہے (سب کو)	کیا آپؐ نے دیکھا اس کو جو روکتا ہے	ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے	کیا آپؐ نے غور کیا

اِنْ كَانَ	عَلَى الْهُدٰٓى ۙ﴿۱۱﴾	اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ؕ﴿۱۲﴾	اَرَءَيْتَ
اگر وہ ہوتا	ہدایت پر	یا وہ ترغیب دیتا خدا خوفی کی (تو کیا انسان ہوتا)	کیا آپؐ نے غور کیا

اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ؕ﴿۱۳﴾	اَلَمْ يَعْلَمْ	بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ؕ﴿۱۴﴾
اگر اس نے جھٹلایا اور اعراض کیا (تو اپنا ہی نقصان کیا)	کیا اس نے جانا ہی نہیں	کہ اللہ دیکھتا ہے (سب کچھ)

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ	لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۙ﴿۱۵﴾	نَاصِيَةٍ
ہرگز نہیں! بیشک اگر وہ باز نہ آیا	تو ہم ضرور پکڑ کر گھسیٹیں گے (اس کو) پیشانی کے بال سے	ایک ایسی پیشانی سے جو

كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ﴿۱۶﴾	فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۙ﴿۱۷﴾	سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۙ﴿۱۸﴾
جھوٹی خطا کار ہے	پس اسے چاہیے کہ وہ بلا لے اپنے اہل مجلس کو	ہم بلائیں گے سپاہیوں (فرشتوں) کو

كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ	وَاسْجُدْ	وَاقْتَرِبْ ۩
ہرگز نہیں! آپ مت مانیں اس کی	اور آپ سجدہ کریں	اور آپ قربت اختیار کریں (سجدہ۔ ۱۴)

نوٹ: 1

ان آیات میں آخر سورہ تک ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھنا شروع کی تو ابوجہل نے آپ ﷺ کو نماز پڑھنے سے روکا اور دھمکی دی کہ آئندہ نماز پڑھیں گے تو وہ معاذ اللہ آپ ﷺ کی گردن کو پاؤں سے کچل دے گا۔ (معارف القرآن)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے کہا کہ میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا۔ اور اس نے آپ ﷺ کو دھمکیاں دیں۔ جواب میں آپ ﷺ نے اس کو جھڑک دیا۔ اس پر اس نے کہا کہ تم کس بل بوتے پر مجھے ڈراتے ہو۔ خدا کی قسم اس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔ آیات۔ 17۔18۔ میں اس کا حوالہ ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب پر سرفراز فرمانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ اس طریقے کا ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے۔ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعے سے آپ ﷺ کو ایسی باتوں کی تعلیم دی جاتی تھی جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 3

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ اپنے رب سے قریب تر اُس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہو۔ اس لیے سجدہ میں بہت دعا کیا کرو ایک دوسری حدیث میں یہ لفظ بھی آئے ہیں کہ سجدے کی حالت میں دعا قبول ہونے کے لائق ہے۔

نفل نماز کے سجدہ میں دعا کرنا ثابت ہے۔ بعض احادیث میں یہ دعا کے خاص الفاظ بھی آئے ہیں۔ وہ الفاظ ماثورہ پڑھے جائیں تو بہتر ہے۔ فرض نمازوں میں اس طرح کی دعائیں ثابت نہیں ہیں کیونکہ فرائض میں اختصار مطلوب ہے (معارف القرآن)۔ ہمیں بزرگوں نے یہ سکھایا تھا کہ نفل نماز کے سجدوں میں صرف وہ دعائیں مانگی جاسکتی ہیں جو قرآن مجید اور احادیث میں دی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ دعائیں مانگنی ہوں تو سلام پھیر کے استغفار اور درود شریف پڑھنے کے بعد مانگتے ہوئے سجدے میں چلے جاؤ، پھر جو چاہو مانگو، جس زبان میں چاہو مانگو۔ (مرتب)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ القدر (97)

آیت نمبر (1 تا 5)

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ	فِى لَيْلَةِ ٱلْقَدْرِ ۝١	وَمَآ أَدْرَىٰكَ	مَا
یقیناً ہم نے ہی اتارا اس (قرآن) کو	قدر کی رات میں	اور آپ کیا جانیں	کیا ہے

لَيْلَةُ ٱلْقَدْرِ ۝٢	لَيْلَةُ ٱلْقَدْرِ خَيْرٌ	مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝٣	تَنَزَّلُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ وَٱلرُّوحُ
قدر کی رات	قدر کی رات زیادہ بہتر ہے	ایک ہزار مہینوں سے	اترتے ہیں فرشتے اور وہ روح (جبریلؑ)

فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ	مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۙ۝۴	سَلٰمٌ ۣ هِيَ	حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵
اس (رات میں) میں اپنے رب کے اِذن سے	ہر کام سے (کے ساتھ)	سلامتی ہے یہ (رات)	فجر کے طلوع ہونے کے وقت تک

نوٹ: 1

قدر کے ایک معنی عظمت وشرف (قدر و قیمت والا ہونا) کے ہیں۔ اور اس رات کو لیلۃ القدر کہنے کی وجہ اس رات کی عظمت ہے۔ قدر کے دوسرے معنی تقدیر کے بھی آتے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے اس کو لیلۃ القدر کہنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس رات میں تمام مخلوقات کے لیے جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے، اس کا جو حصہ اس سال رمضان سے اگلے رمضان تک پیش آنے والا ہے، وہ ان فرشتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو کائنات کے امور نافذ کرنے کے لیے مامور ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ وہ فرشتے جن کو یہ امور سپرد کیے جاتے ہیں چار ہیں، حضرت اسرافیلؑ، حضرت میکائیلؑ، حضرت جبریلؑ۔

قرآن کریم کی تصریحات سے ثابت ہے کہ شب قدر ماہِ رمضان المبارک میں آتی ہے۔ مگر تاریخ کے تعین میں علماء کے مختلف اقوال ہیں صحیح یہ ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے مگر آخری عشرہ کی کوئی خاص تاریخ متعین نہیں بلکہ ان میں سے کسی بھی رات میں ہوسکتی ہے اور وہ ہر رمضان میں بدلتی بھی رہتی ہے۔ اور ان میں سے طاق راتوں میں زیادہ احتمال ہے۔ اس رات کی سب سے بڑی فضیلت تو وہی ہے جو اس سورت میں بیان ہوئی ہے کہ اس ایک رات کی عبادت ایک ہزار مہینوں یعنی 83 سال سے زائد کی عبادت سے بھی بہتر ہے۔ پھر بہتر ہونے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ کتنی بہتر ہے دوگنی، چوگنی، دس گنی، سوگنی وغیرہ سب ہی احتمالات ہیں۔ (قیاس یہ کہتا ہے کہ حد مقرر نہ کرنے میں شاید یہ حکمت ہو کہ بندے بندے کی عبادت میں اخلاص کی وجہ سے فرق ہوتا ہے۔ اس کا لحاظ رکھنے کی خاطر حد کو کھلا چھوڑا گیا ہے۔ گویا فکر ہر کس بقدر ہمت اوست والی بات ہے۔ مرتب) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شب قدر میں عبادت کے لیے کھڑا رہا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ شب قدر میں وہ تمام فرشتے جن کا مقام سدرۃ المنتہیٰ پر ہے، حضرت جبریلؑ کے ساتھ دنیا میں اترتے ہیں اور کوئی مومن مرد یا عورت ایسی نہیں جس کو وہ سلام نہ کرتے ہوں بجز اس کے جو شراب پیتا ہو یا سور کا گوشت کھاتا ہو۔ شب قدر میں بعض حضرات کو خاص انوار کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے، مگر اس رات کی برکات اور ثواب حاصل ہونے میں ایسے مشاہدات کا کچھ دخل نہیں ہے اس لیے اس کی فکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔

اس سورت کی پہلی آیت میں تصریح ہے کہ قرآن کریم شب قدر میں نازل ہوا۔ اس کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر اتارا گیا پھر جبریلؑ اس کو تدریجاً ۲۳ سال کے عرصے میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق تھوڑا تھوڑا لاتے رہے۔ اور یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ نزولِ قرآن کی ابتدا اس رات میں چند آیتوں سے ہوگئی، باقی بعد میں نازل ہوتا رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صحفِ ابراہیم علیہ السلام تیسری رمضان میں تورات چھٹی رمضان میں، انجیل تیرھویں رمضان اور زبور اٹھارویں رمضان میں نازل ہوئی ہیں۔

هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵ کا مطلب یہ ہے کہ لیلۃ القدر کی برکات رات کے کسی خاص حصے کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ غروب آفتاب سے طلوع فجر تک ایک ہی حکم ہے۔ جس شخص نے شب قدر میں عشاء اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھ لی اس نے بھی اس رات کا ثواب پا لیا اور جو شخص جتنا زیادہ کرے گا اتنا زیادہ ثواب پائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر لی تو آدھی رات کے قیام کا ثواب پا لیا اور جس نے صبح کی نماز بھی جماعت سے ادا کر لی تو پوری رات جاگنے

عبادت کرنے کا ثواب حاصل کرلیا۔

اختلاف مطالعہ (سورج طلوع ہونے کے وقت میں فرق) کی وجہ سے مختلف ملکوں اور شہروں میں شب قدر مختلف اوقات اور مختلف دنوں میں ہوتو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ کیونکہ ہر جگہ کے اعتبار سے جو رات شب قدر قرار پائے گی، اُس جگہ اُسی رات میں شب قدر کے برکات حاصل ہوں گے۔ (معارف القرآن۔ ج ۸۔ ص ۷۹۱ تا ۷۹۴ سے ماخوذ)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البینہ (98)

آیت نمبر (1 تا 5)

ترکیب

(آیت۔1) لَمۡ یَکُنِ میں کَانَ کا اسم اَلَّذِیۡنَ سے اَلۡمُشۡرِکِیۡنَ تک کا پورا فقرہ ہے اور مُنۡفَکِّیۡنَ اس کی خبر ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ اَلۡمُشۡرِکِیۡنَ سابقہ مِنۡ پر عطف ہونے کی وجہ سے حالتِ جر میں ہے۔ (آیت۔2) رَسُوۡلٌ کو اگر خبر مانیں تو اس سے پہلے اس کا مبتدا محذوف مانا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو فاعل مانیں اور اس سے پہلے فعل فَقَدۡ جَاءَ یا فَقَدۡ اَتٰی محذوف مانیں۔ دونوں صورتوں میں یہ پورا جملہ سابقہ اَلۡبَیِّنَۃُ کی وضاحت ہے۔ ترجمہ میں ہم دوسری صورت کو ترجیح دیں گے کیونکہ ایسی صورت میں آگے فعل مضارع یَتۡلُوۡا کو رَسُوۡلٌ کا حال ماننے کی گنجائش پیدا ہوتی ہے، جو زیادہ حسب حال ہے۔ صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً یہ پورا مرکب توصیفی نکرہ مخصوصہ ہے۔ اور آگے کا پورا جملہ اس کی خصوصیت ہے۔ (آیت۔3) کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ مبتدا موخر نکرہ ہے اس کی خبر موجودۃٌ محذوف ہے اور فِیۡہَا قائم مقام خبر مقدم ہے۔ اس میں ھَا کی ضمیر صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً کے لیے ہے۔ (آیت۔5) لِیَعۡبُدُوۡا پر لام کی نہیں بلکہ لام امر ہے اور یَعۡبُدُوۡا منصوب نہیں بلکہ مجزوم ہے۔ ترجمہ اسی لحاظ سے کرنا ہوگا۔ مُخۡلِصِیۡنَ حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے اور یہ اسم الفاعل ہے۔ اس نے الدِّیۡنَ کو نصب دی ہے۔ یُقِیۡمُوۡا اور یُؤۡتُوۡا سابقہ لِیَعۡبُدُوۡا کے لام امر پر عطف ہونے کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ مرکب اضافی ہے۔ اَلۡقَیِّمَۃِ مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے دِیۡنُ کی صفت نہیں ہوسکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا موصوف یہاں محذوف ہے جو اَلۡمِلَّۃِ یا اَلرِّجَالِ ہوسکتا ہے۔

ترجمہ

لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا	مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَالۡمُشۡرِکِیۡنَ	مُنۡفَکِّیۡنَ
تھے ہی نہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا	مشرکین اور اہل کتاب میں سے	باز آنے والے (کفر سے)

حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ	الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾	رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ	یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾
جب تک کہ (نہ) پہنچے ان کے پاس	روشن دلیل	(تو آچکا ہے) ایک رسول اللہ کی طرف سے	پڑھتا ہوا ایسے پاکیزہ صحیفے

فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾	وَمَا تَفَرَّقَ	الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ	اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا
جن میں پختہ لکھی ہوئی باتیں (احکام) ہیں	اور الگ الگ نہیں ہوئے	وہ لوگ جن کو دی گئی کتاب	مگر اس کے بعد سے جو

جَآءَتۡهُمُ ٱلۡبَيِّنَةُ ۝٤	وَمَآ أُمِرُوٓاْ إِلَّا	لِيَعۡبُدُواْ ٱللَّهَ	مُخۡلِصِينَ
آئی ان کے پاس واضح بات	اور ان لوگوں کو حکم نہیں دیا گیا سوائے اس کے کہ	چاہیے کہ وہ لوگ بندگی کریں اللہ کی	خالص کرنے والے ہوتے ہوئے

لَهُ ٱلدِّينَ	حُنَفَآءَ	وَيُقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ
اسی کے لیے ضابطۂ حیات (دین) کو	یکسو ہوتے ہوئے	اور چاہیے کہ وہ لوگ قائم کریں نماز کو

وَيُؤۡتُواْ ٱلزَّكَوٰةَ	وَذَٰلِكَ	دِينُ ٱلۡقَيِّمَةِ ۝٥
اور چاہیے کہ وہ لوگ پہنچائیں زکوۃ کو	اور یہ ہے	(لوگوں کا) پختہ ضابطۂ حیات (دین)

نوٹ:1 قرآن مجید کی ترتیب میں سورۃ البینہ کو سورہ علق اور سورۂ قدر کے بعد رکھنا بہت معنی خیز ہے۔ سورۂ علق میں پہلی وحی درج کی گئی ہے۔ سورۂ قدر میں بتایا گیا ہے کہ وہ کب نازل ہوئی اور اس سورہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کے ساتھ ایک رسول بھیجنا کیوں ضروری تھا۔

نوٹ:2 کفر میں مشترک ہونے کے باوجود اہل کتاب مشرکین، دونوں گروہوں کو دو الگ الگ ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس انبیاء کی لائی ہوئی کتابیں تھیں اور مشرکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی نبی کے پیرو اور کسی کتاب کے ماننے والے نہ تھے۔ اگرچہ قرآن مجید میں اہل کتاب کے شرک کا بہت سے مقامات پر ذکر کیا گیا ہے لیکن قرآن میں کہیں بھی ان کے لیے مشرک کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اصل دین تو توحید ہی کو مانتے تھے اور پھر شرک کرتے تھے۔ بخلاف اس کے غیر اہل کتاب کے لیے مشرک کا لفظ بطور اصطلاح استعمال کیا گیا ہے کیونکہ وہ اصل دین شرک ہی کو قرار دیتے تھے اور توحید کو ماننے سے ان کو قطعی انکار تھا۔ یہ فرق ان دونوں گروہوں کے درمیان صرف اصطلاح میں ہی نہیں بلکہ شریعت کے احکام میں بھی ہے۔ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال کیا گیا اور ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی۔ جبکہ مشرکین کا نہ ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح حلال ہے۔

نوٹ:3 آیت۔ 1۔ کا مطلب ہے کہ ان لوگوں کے کفر سے نکلنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ ایک روشن دلیل آ کر انہیں کفر کی ہر صورت کا غلط اور خلافِ عقل ہونا سمجھائے اور راہ راست کو واضح اور مدلل طریقے سے ان کے سامنے پیش کر دے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس روشن دلیل کے آجانے کے بعد وہ سب کفر سے باز آجانے والے تھے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دلیل کی غیر موجودگی میں ان کا حالتِ کفر سے نکلنا ممکن ہی نہ تھا۔ البتہ اس کے آنے کے بعد بھی ان میں سے کچھ لوگ اگر کفر پر قائم رہیں تو اس کی ذمہ داری پھر ان ہی پر ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:4 کفر و شرک کی عالمگیر ظلمت کو دور کرنے کے لیے رب العالمین کی حکمت و رحمت کا تقاضہ یہ ہوا کہ جیسے یہ مرض شدید اور عالمگیر ہے، اس کے علاج کے لیے ویسا ہی کوئی ماہر معالج بھیجنا چاہیے آگے اس ماہر حکیم کی صفت بیان کی کہ اس کا وجود ایک اَلْبَیِّنَۃ یعنی روشن دلیل ہو۔ آگے فرمایا اس معالج سے مراد اللہ کا وہ رسول ہے جو قرآن کی واضح حجت لے کر ان کے پاس آئے۔ آگے قرآن کی چند اہم صفات کا بیان ہے۔

تلاوت کے معنی پڑھنے کے ہیں لیکن ہر پڑھنے کو تلاوت نہیں کہا جاتا بلکہ تلاوت اس پڑھنے کو کہتے ہیں جو پڑھانے والے کی تلقین کے بالکل مطابق ہو۔ کتاب اور صحیفہ تقریباً ہم معنی لفظ ہیں۔ لیکن کتاب کا لفظ حکم کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور قرآن میں بھی اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً الانفال۔68۔ اس جگہ بھی یہی دوسرے معنی مراد ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً سے مراد یہ ہے کہ یہ صحیفے جھوٹ، شک، نفاق اور گمراہی سے پاک ہیں۔ آگے قَيِّمَةٌ کو اگر مستقیم کے معنی میں کتب یعنی احکام کی صفت لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ احکام منصفانہ اور معتدل ہیں اور اگر اس کو مضبوط و مستحکم کے معنی میں لیں تو مطلب ہوگا کہ یہ احکام جو قرآن میں آئے ہیں قیامت تک قائم رہیں گے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 5

آیت۔4۔ میں تفرق سے مراد وہ انکار و اختلاف ہے جو قرآن اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کے بارے میں اہل کتاب میں پیدا ہوا۔ اُن کی آسمانی کتب تورات و انجیل میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا، آپ ﷺ کی خاص خاص صفات کا اور آپ ﷺ پر قرآن نازل ہونے کا واضح ذکر موجود تھا۔ اس لیے کسی یہودی یا نصرانی کو اس میں اختلاف نہیں تھا کہ آخر زمانے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائیں گے، آپ ﷺ پر قرآن (اللہ کا کلام) نازل ہوگا اور آپ ﷺ ہی کا اتباع سب پر لازم ہوگا۔ مگر جب اللہ کا اَلْبَيِّنَه یعنی رسول آخر الزماں تشریف لے آئے تو ان میں افتراق پیدا ہو گیا کہ کچھ لوگ تو آپ ﷺ پر ایمان لے آئے اور بہت سے انکار کرنے لگے۔ یہ معاملہ چونکہ اہل کتاب ہی کے ساتھ مخصوص تھا اس لیے اس آیت میں صرف اہل کتاب ہی کا ذکر فرمایا ہے، مشرکین کو شامل نہیں کیا۔
(معارف القرآن)۔

آیت نمبر (6 تا 8)

ترکیب

اَلْمُشْرِكِيْنَ کے دو امکانات ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو مِنْ پر عطف مانا جائے۔ ایسی صورت میں مطلب ہوگا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ (مِنَ) الْمُشْرِكِيْنَ۔ دوسرے یہ کہ اس کو اِنَّ پر عطف مانا جائے۔ ایسی صورت میں مطلب ہوگا۔ وَ(اِنَّ) الْمُشْرِكِيْنَ دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔ یہ پورا فقرہ مبتدا ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے۔ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ قائم مقام خبر ہے اور خٰلِدِيْنَ تفضیل کل (Superlative Degree) ہے۔ (دیکھیں آسان عربی گرامر حصہ سوم، پیراگراف:۶۲:۶) اَلْبَرِيَّةِ دراصل فَعِيْلٌ کے وزن پر بَرِيْءٌ کا مونث بَرِيْئَةٌ ہے، اس کو اس طرح بھی پڑھتے ہیں اور ہمزہ کو یا میں تبدیل کر کے بَرِيَّةٌ بھی پڑھتے ہیں۔ (آیت۔8) جزاؤُهُمْ مبتدا ہے۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ اس کی خبر نہیں ہے بلکہ متعلق خبر مقدم ہے اور جَنّٰتُ عَدْنٍ اس کی خبر ہے۔

ترجمہ

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	وَالْمُشْرِكِيْنَ
بیشک وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا	اہل کتاب میں سے	اور (بیشک) سب شرک کرنے والے

فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ	خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ	اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝۶
جہنم کی آگ میں ہیں	ہمیشہ رہنے والے ہوتے ہوئے اس میں	وہ لوگ ہی تمام مخلوق کے بدترین ہیں

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ	اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝۷
بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے	اور اُنہوں نے عمل کیے نیکیوں کے	وہ لوگ ہی تمام مخلوق کے بہترین ہیں

جَزَآؤُهُمْ	عِنْدَ رَبِّهِمْ	جَنّٰتُ عَدْنٍ	تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
ان لوگوں کی جزا	ان کے رب کے پاس	عدن کے باغات ہیں	بہتی ہیں جن کے دامن سے نہریں

خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ	رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ
ایک حالت میں رہنے والے ہوتے ہوئے اس میں ہمیشہ	راضی ہواللہ ان لوگوں سے

وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ	ذٰلِكَ لِمَنْ	خَشِیَ رَبَّهٗ ۠ ۸
اور وہ لوگ راضی ہوئے اس سے	یہ اس کے لیے ہے جو	مرعوب ہوا اپنے رب سے

نوٹ:1

آیت۔6۔ میں فرمایا کہ جو قرآن کی تکذیب کر کے کفر کے مرتکب ہوئے ہیں وہ سب جہنم میں بھر دیئے جائیں گے۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی ہے کہ وہ اس جہنم میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل کیے جائیں گے۔ یہاں اہل کتاب کے زعم پر نظر رہے کہ اول تو دوزخ کی آگ سے ان کو کوئی سابقہ پڑنے والا نہیں ہے اور اگر پڑا بھی تو وہ چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں ہوگا۔ آگے اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّةِ ؕ فرما کر ان کے غرور و تکبر پر ضرب لگائی گئی ہے۔ اہل کتاب اور مشرکین کے سردار قرآن اور پیغمبر ﷺ پر ایمان لانے کے لیے شرط لگاتے تھے کہ جب تک کوئی فرشتہ آسمان سے نہیں اترے گا یا ایسی ہی دوسری شرائط لاتے کہ اس کے بغیر وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ محمد (ﷺ) اپنے دعوائے رسالت میں سچے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شرائط وہ اس غرور کی بنا پر لگاتے تھے کہ وہ اپنے ہی اندر کے ایک شخص کو جو دنیوی اعتبار سے ان سے کم تر بھی ہے، خدا کا رسول مان کر اس کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں کس طرح ڈال لیں۔ ان کا یہ غرور قبولِ حق سے مانع بنا جس نے ان کو بدترین مخلوق بنا دیا۔

نوٹ:2

آیت۔8۔ میں اہل جنت کی سب سے بڑی نعمت کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے، اب ناراضی کا کوئی خطرہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے خطاب فرمائیں گے یَا اَهْلَ الْجَنَّةِ تو اہل جنت جواب دیں گے لَبَّیْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَیْكَ وَالْخَیْرُ كُلُّهٗ فِیْ یَدَیْكَ پھر حق تعالیٰ فرمائیں گے هَلْ رَضِیْتُمْ۔ وہ جواب دیں گے اے ہمارے پروردگار اب بھی راضی نہ ہونے کا کیا احتمال ہے جبکہ آپ نے ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما دیا جو کسی مخلوق کو نہیں ملا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیا میں تم کو اس سے بھی افضل اور بہتر نعمت دے دوں۔ پھر فرمائیں گے کہ میں نے اپنی رضا تمہارے اوپر نازل کر دی اب کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔ اس حدیث میں اہل جنت سے پوچھا گیا ہے کہ آپ راضی بھی ہو۔ اور اس آیت میں خبر دی گئی ہے کہ اہل جنت اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں گے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے ہر حکم اور ہر فعل سے راضی ہونا تو لازمۂ عبدیت ہے۔ اس کے بغیر تو کوئی جنت میں جا ہی نہیں سکتا، پھر یہاں اہل جنت کی رضامندی کا ذکر کرنے کا کیا مطلب ہے جواب یہ ہے کہ رضا کے عام مفہوم کے اعتبار سے رضاء بالقدر فرائض عبدیت میں سے ہے لیکن رضا کا ایک درجہ اور بھی ہے جو اس سے آگے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اس کی ہر مراد عطا کر دیں اور کوئی تمنا یا آرزو باقی نہ چھوڑیں۔ (معاف القرآن)۔

نوٹ:3

سورت کے آخر میں وہ بات بتادی جس پر تمام دینی کمالات اور آخرت کی نعمتوں کا مدار ہے اور وہ ہے اللہ کی خشیت۔ خشیت اس خوف کو نہیں کہا جاتا جو کسی دشمن، درندے یا موذی چیز سے طبعاً ہوتا ہے بلکہ خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی عظمت اور

جلال سے پیدا ہوا اور جس کا تقاضہ یہ ہو کہ وہ ہر حال میں اس کی رضا جوئی کی فکر کرے اور ناراضی کے شبہہ سے بھی بچتا رہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو عبد کامل اور مقبول بنانے والی ہے۔ (معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الزلزال (99)

آیت نمبر (1 تا 8)

ترکیب

(آیت۔1 تا 3) بات اِذَا سے شروع ہو رہی ہے اس لیے ان آیات میں آنے والے افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔ (آیت۔4) تُحَدِّثُ کا مفعول اَخۡبَارَهَا بنفسہٖ آیا ہے۔ اس حوالے سے نوٹ کر لیں کہ حَدَّثَ کا مفعول بِ کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے اور بنفسہٖ بھی آتا ہے۔ (آیت۔5) قرآن مجید میں تقریباً ہر جگہ اَوۡحٰی کا مفعول الیٰ کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ یہ واحد مقام ہے جہاں اس کی ضمیر مفعولی ھا کے ساتھ لام کا صلہ آیا ہے۔ (آیت۔6) اَشۡتَاتًا حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ یَرَوۡا مضارع مجہول ہے جو ثلاثی مجرد اور باب افعال میں ہم شکل ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ان میں پہچان کا ایک قرینہ موجود ہے۔ رَءٰی۔ یَرٰی (ثلاثی مجرد) کا ایک مفعول آتا ہے، کسی کو دیکھا۔ جبکہ اَرٰی۔ یُرِیۡ (باب افعال) کے دو مفعول آتے ہیں، کس کو دکھایا اور کیا دکھایا۔ یہاں یُرَوۡا میں شامل ھم کی ضمیر نائب فاعل (یعنی مفعول اوّل) موجود ہے۔ آگے اَعۡمَالَهُمۡ اس کا مفعول ثانی آیا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ یہاں یُرَوۡا باب افعال کا مضارع مجہول ہے۔ (آیت۔7) مَنۡ شرطیہ ہے۔ اس لیے یَعۡمَلۡ مجزوم آیا ہے۔ یَرٰی جواب شرط ہونے کی وجہ سے مجزوم ہوا تو اس کی یا گر گئی۔ ترجمہ جملہ شرطیہ کے لحاظ سے ہوگا۔ یَعۡمَلۡ کا مفعول خَیۡرًا ہے جو نکرہ مخصوصہ ہے۔ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ اس کی خصوصیت مقدم ہے۔

ترجمہ

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ	زِلۡزَالَهَا ۙ﴿۱﴾	وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ	اَثۡقَالَهَا ۙ﴿۲﴾
جب ہلایا جائے گا زمین کو	جیسے اس کو ہلا مارنے کا حق ہے	اور نکال ڈالے گی زمین	اپنے سارے بوجھ

وَقَالَ الۡاِنۡسَانُ	مَا لَهَا ۚ﴿۳﴾	یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ	اَخۡبَارَهَا ۙ﴿۴﴾	بِاَنَّ رَبَّكَ
اور کہے گا انسان	اس کو کیا (ہو گیا) ہے	اُس دن وہ بیان کرے گی	اپنی خبریں	(یہ) اس سبب سے کہ آپؐ کے رب نے

اَوۡحٰی لَهَا ؕ﴿۵﴾	یَوۡمَئِذٍ یَّصۡدُرُ النَّاسُ	اَشۡتَاتًا ۙ	لِّیُرَوۡا	اَعۡمَالَهُمۡ ؕ﴿۶﴾
الہام کیا اس کو	اس دن واپس ہوں گے لوگ	الگ الگ ہوتے ہوئے	تا کہ ان لوگوں کو دکھایا جائے	ان کا سب کیا دھرا

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ	مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا	یَّرَهٗ ؕ﴿۷﴾	وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ
پس جس نے (بھی) عمل کیا	کسی ذرہ کے ہم وزن کسی بھلائی کا	تو وہ دیکھ لے گا اس کو	اور جس نے (بھی) عمل کیا

مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا	یَّرَهٗ ﴿۸﴾
کسی ذرہ کے ہم وزن کسی برائی کا	تو وہ دیکھ لے گا اس کو

نوٹ: 1 اس میں اختلاف ہے کہ یہاں جس زلزلہ کا ذکر ہے، یہ وہ زلزلہ ہے جو نفخہ اولیٰ (پہلا صور پھونکے جانے) سے پہلے دنیا

میں ہوگا، جیسا کہ علاماتِ قیامت میں ذکر آیا ہے۔ یا اس زلزلہ سے مراد وہ زلزلہ ہے جو دوسرا صور پھونکے جانے کے بعد ہوگا جب مُردے زندہ ہو کر اٹھیں گے۔ مفسرین کے اقوال مختلف ہیں لیکن آگے احوال قیامت اور حساب کتاب کا ذکر ہے، وہ قرینہ اسی کا ہے کہ یہ زلزلہ دوسرا صور پھونکے جانے کے بعد کا ہے۔ (معارف القرآن)۔

اس وقت زمین جو کچھ اس کے پیٹ میں ہے مثلاً مُردے یا سونا چاندی وغیرہ، سب کچھ باہر اگل ڈالے گی لیکن اس وقت مال کا کوئی لینے والا نہ ہوگا۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زمین اپنے جگر کے ٹکڑے بڑی چٹانوں کی صورت میں اُگل دے گی۔ اس وقت ایک شخص جس نے مال کے لیے کسی کو قتل کیا تھا وہ دیکھ کر کہے گا۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے میں نے اتنا بڑا جرم کیا تھا۔ جس شخص نے اپنے رشتہ داروں سے مال کی وجہ سے قطع تعلق کیا تھا وہ کہے گا یہ ہے وہ چیز جس کے لیے میں نے یہ حرکت کی تھی چوری کی سزا میں جس چور کا ہاتھ کاٹا گیا تھا وہ کہے گا اس کے لیے میں نے اپنا ہاتھ گنوایا تھا۔ پھر کوئی بھی اس سونے کی طرف التفات نہ کرے گا۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔4۔ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ حالات یہ ہیں کہ زمین ہر بندے اور بندی کے بارے میں اس عمل کی گواہی دے گی جو اس کی پیٹھ پر اس نے کیا ہوگا۔ وہ کہے گی کہ اس نے فلاں دن فلاں کام کیا تھا۔ یہ ہیں وہ حالات جو زمین بیان کرے گی۔

زمین کے متعلق یہ بات کہ وہ قیامت کے روز اپنے اوپر گزرے ہوئے سب حالات و واقعات بیان کرے گی، قدیم زمانے کے آدمی کے لیے بڑی حیران کُن ہوگی کہ آخر زمین کیسے بولنے لگے گی، لیکن آج علوم طبعی کے انکشافات اور سنیما، ریڈیو، ٹیلیویژن، ٹیپ ریکارڈر، الیکٹرانکس وغیرہ ایجادات کے اس دور میں یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ زمین اپنے حالات کیسے بیان کرے گی۔ انسان اپنی زبان سے جو کچھ بولتا ہے اس کے نقوش ہوا میں، ریڈیائی لہروں میں اور مختلف جگہوں کے ذرات میں ثبت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس وقت چاہے ان ساری آوازوں کو ٹھیک اسی طرح ان چیزوں سے دہروا سکتا ہے جس طرح کبھی وہ انسان کے منہ سے نکلی تھیں۔ پھر انسان نے زمین پر جہاں بھی کوئی کام کیا ہے اس کی ایک ایک حرکت کا عکس اس کے گرد و پیش کی تمام چیزوں پر پڑا ہے اور اس کی تصویر ان پر نقش ہو چکی ہے۔ بالکل گھپ اندھیرے میں بھی اس نے کوئی فعل کیا ہو تو خدا کی خدائی میں ایسی شعاعیں موجود ہیں جن کے لیے اندھیرا اور اُجالا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ ہر حالت میں اس کی تصویر لے سکتی ہیں۔ یہ ساری تصویریں قیامت کے روز ایک متحرک فلم کی طرح انسان کے سامنے آجائیں گی۔

اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے اعمال کو براہِ راست خود جانتا ہے، مگر آخرت میں جب وہ عدالت قائم کرے گا تو جس کو بھی سزا دے گا، انصاف کے تمام تقاضے پورے کر کے دے گا۔ اس کی عدالت میں ہر مجرم انسان کے خلاف جو مقدمہ قائم کیا جائے گا، اس کو ایسی مکمل شہادتوں سے ثابت کر دیا جائے گا کہ اس کے مجرم ہونے میں کسی کلام کی گنجائش باقی نہ رہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔7۔ میں خیر سے مراد وہ خیر ہے جو شرعاً معتبر ہے یعنی جو ایمان کے ساتھ ہو۔ بغیر ایمان کے کوئی نیک عمل اللہ کے نزدیک نیک نہیں یعنی آخرت میں ایسے نیک عمل کا جو حالت کفر میں کیا گیا تھا، کوئی اعتبار نہیں ہوگا، گو دنیا میں اس کو اس کا بدلہ دے دیا جائے۔ اسی لیے اس آیت سے اس پر استدلال کیا گیا ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا وہ بالآخر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ کیونکہ اس آیت کے وعدے کے مطابق اس کو اپنی نیکی کا پھل بھی آخرت میں ملنا ضروری ہے۔ اگر اور کوئی نیکی نہ ہو تو خود ایمان بہت بڑی نیکی ہے۔ اگلی آیت میں شر سے مراد وہ شر ہے جس سے اپنی زندگی میں توبہ نہ کر لی ہو، کیونکہ توبہ سے گناہوں کا معاف ہونا قرآن وسنت میں یقینی طور پر ثابت ہے۔ البتہ جس گناہ سے توبہ نہ کی گئی ہو وہ چھوٹا ہو یا بڑا، آخرت میں اس کا نتیجہ ضرور سامنے آئے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسے گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کرو جن کو چھوٹا یا حقیر سمجھا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر بھی مواخذہ ہونا ہے۔ (معارف القرآن)۔

2029

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ العٰدیٰت (100)

آیت نمبر (1 تا 11)

ض ب ح

(ف) ضَبۡحًا دوڑتے ہوئے سینے سے آواز نکالنا۔ ہانپنا۔ زیر مطالعہ آیت۔1۔

ق د ح

(ف) قَدۡحًا دو چیزوں کو رگڑ کر آگ نکالنا، زیر مطالعہ آیت۔2۔

ن ق ع

(ف) نَقۡعًا کسی جگہ پانی کا جمع ہو کر ٹھہر جانا۔ گرد و غبار کا گر کر بیٹھ جانا۔

نَقۡعٌ اسم ذات بھی ہے۔ گرد و غبار۔ ٹھہرا ہوا پانی۔ زیر مطالعہ آیت۔4۔

ك ن د

(ن) كُنُوۡدًا زمین کا بنجر ہونا۔ انسان کا ناشکری کرنا۔

كَنُوۡدٌ فَعُوۡلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ نعمتوں کو بھولنے والا اور مصائب کو شمار کرنے والا۔ انتہائی ناشکرا۔ زیر مطالعہ آیت۔6۔

ح ص ل

(ن) حُصُوۡلًا حاصل ہونا۔ باقی رہنا۔

(تفعیل) تحصیلًا حاصل کرنا، ظاہر کرنا، کان سے سونا، چاندی یا دوسری معدنیات نکالنا۔ کسی چیز کا چھلکا اتار کر گودہ نکالنا۔ (زیر مطالعہ آیت۔10)

ترکیب

عربی میں عام طور پر گھوڑوں کے لیے جمع مؤنث کے صیغے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان آیات میں جمع مؤنث کے صیغوں کا ترجمہ اردو محاورے کے مطابق جمع مذکر میں کیا جائے گا، (آیت۔1) ضَبۡحًا حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ (آیت۔2) قَدۡحًا مصدر ہے اور اس میں رگڑ کر آگ جلانے کا مفہوم ہے۔ جبکہ اَلۡمُوۡرِیٰتِ مادہ وری سے باب افعال میں اسم الفاعل ہے۔ اس میں بھی رگڑ کر آگ جلانے والے کا مفہوم ہے۔ یہ دونوں ہم معنی ہونے کی وجہ سے بہتر ہے کہ قَدۡحًا کو مُوۡرِیَاتٍ کا مفعول مطلق مانا جائے۔ (حافظ احمد یار صاحب)۔ اَلۡمُوۡرِیٰتِ کو حالتِ نصب میں ماننے کی کوئی وجہ یا قرینہ یہاں موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس کو پہلی آیت کے

واوقسمیہ پرعطف مان کرحالتِ جرّ میں مانا جائے گا۔ضَبْحًا ظرف ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔(آیت۔4۔5)۔ اَثَرْنَ اور وَسَطْنَ فعل ماضی میں جمع مؤنث کے صیغے ہیں۔لیکن ان میں آفاقی صداقت یعنی گھوڑوں کی مستقل خصلت کا بیان ہے اس لیے ان کا ترجمہ حال میں ہوگا۔(دیکھیں آیت۔2/البقرہ:49،نوٹ۔2)۔نَقْعًا اور جَمْعًا بالترتیب اَثَرْنَ اور وَسَطْنَ کے مفعول ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔

ترجمہ

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾	فَالْمُوْرِيٰتِ	قَدْحًا ۙ﴿۲﴾
قسم ہے ہانپتے ہوئے تیز دوڑنے والوں (گھوڑوں) کی	پھر قسم ہے رگڑ سے آگ نکالنے والوں کی	جیسا رگڑنے کا حق ہے

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾	فَاَثَرْنَ بِهٖ	نَقْعًا ۙ﴿۴﴾	فَوَسَطْنَ بِهٖ
پھر قسم ہے صبح کے وقت غارتگری کرنے والوں کی	پھر وہ اٹھاتے ہیں اُس (وقت) میں	گرد وغبار کو	پھر وہ درمیان میں گھس جاتے ہیں اس وقت

جَمْعًا ۙ﴿۵﴾	اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ	لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾	وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ	لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾
کسی جماعت کے	بیشک انسان اپنے رب کے لیے	یقیناً انتہائی ناشکرا ہے	حالانکہ بیشک وہ اس (بات) پر	یقیناً معائنہ کرنے والا ہے

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ	لَشَدِيْدٌ ۭ﴿۸﴾	اَفَلَا يَعْلَمُ	اِذَا بُعْثِرَ	مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾
اور بیشک وہ مال کی محبت کے لیے	یقیناً بہت سخت ہے	تو کیا وہ جانتا نہیں (اُس وقت کو)	جب کریدا جائے گا	اس کو جو قبروں میں ہے

وَحُصِّلَ مَا	فِي الصُّدُوْرِ ۙ﴿۱۰﴾	اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ	يَوْمَىِٕذٍ لَّخَبِيْرٌ ۧ﴿۱۱﴾
اور حاصل کرلیا جائے گا اس کو جو	سینوں میں ہے	بیشک ان کا رب ان کے بارے میں	اس دن یقیناً خبر رکھنے والا ہے

نوٹ:1

قرآن مجید جس چیز کی قسم کھا کر کوئی مضمون بیان فرماتا ہے تو اس چیز کو اس مضمون کے ثبوت میں دخل ہوتا ہے۔یہاں جنگی گھوڑوں کی خدمات کا ذکر اس بات کی شہادت میں میں لایا گیا ہے کہ انسان بڑا ناشکرا ہے۔تشریح اس کی یہ ہے کہ جنگی گھوڑے میدان جنگ میں انسان کے حکم اور اشارے کے تحت اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کیسی کیسی سخت خدمات انجام دیتے ہیں۔حالانکہ انسان نے ان گھوڑوں کو پیدا نہیں کیا۔ انسان ان کو جو گھاس، دانہ وغیرہ دیتا ہے وہ بھی اس کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔اس کا کام صرف اتنا ہے کہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے رزق کو ان تک پہنچانے کا ایک واسطہ بنتا ہے۔اب گھوڑے کو دیکھیں کہ وہ انسان کے اتنے سے احسان کو کیسا پہچانتا اور مانتا ہے کہ اس کے ایک اشارے پر اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔اس کے بالمقابل انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک حقیر قطرے سے پیدا کیا، اس کو مختلف کاموں کی قوت بخشی، اس کے کھانے پینے کی ہر چیز پیدا فرمائی اور اس کی تمام ضروریات کو اس تک پہنچا دیا مگر وہ ان تمام احسانات کا شکر گزار بننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔(معارف القرآن)۔

نوٹ:2

یہاں انسان کے متعلق دو باتیں کہی گئی ہیں۔ایک یہ کہ وہ تکلیفوں کو یاد رکھتا ہے اور نعمتوں اور احسانات کو بھول جاتے ہیں۔دوسرے یہ کہ وہ مال کی محبت میں شدید ہے۔یہ دونوں باتیں شرعاً اور عقلاً مذموم ہیں۔ناشکری کا مذموم ہونا تو بالکل ظاہر ہے لیکن مال کی محبت کو بھی مذموم قرار دیا گیا ہے حالانکہ اس پر انسانی ضروریات کا مدار ہے اور اس کے کسب واکتساب کو شریعت نے صرف حلال ہی نہیں بلکہ بقدر ضرورت فرض قرار دیا ہے۔تو مال کی محبت کا مذموم ہونا اس اعتبار سے ہے کہ انسان مال کی محبت سے اتنا مغلوب ہوجائے کہ اللہ کے احکام سے غافل ہوجائے اور

حلال وحرام کی پروانہ رہے۔اس لیے مال کو کمانا اور بقدر ضرورت جمع کرنا تو مذموم نہیں بلکہ فرض ہے لیکن دل میں اس کی محبت ہونا مذموم ہے۔ جیسے انسان بیماری میں دوا بھی پیتا ہے، آپریشن بھی کراتا ہے مگر دل میں ان چیزوں کی محبت نہیں ہوتی بلکہ بدرجۂ مجبوری اور بقدر ضرورت کرتا ہے۔اسی طرح اللہ کے نزدیک مومن کو ایسا ہونا چاہیے کہ بقدر ضرورت مال کو حاصل بھی کرے، اس کی حفاظت بھی کرے اور ضرورت پر اس سے کام بھی لے مگر دل اس کے ساتھ مشغول نہ ہو۔جیسا کہ مولانا رومیؒ نے فرمایا: کہ پانی جب تک کشتی کے نیچے رہے تو وہ کشتی کا مددگار ہے مگر یہی پانی جب کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کو لے ڈوبتا ہے۔اسی طرح مال جب تک دل کی کشتی کے اردگرد ہے تو مفید ہے لیکن جب دل کے اندر گھس گیا تو ہلاکت ہے۔(معارف القرآن)۔

مال و دولت کے متعلق اسلام کا یہ وہ متوازن طرز فکر اور طرزِ عمل ہے جو ہمارے پروردگار کو مطلوب ہے۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کو بیان کرنا اور اس کی تلقین کرنا جتنا آسان ہے، اس کو اپنانا اور لائف اسٹائل بنانا اتنا ہی مشکل ہے۔یہ اس دنیا کا پل صراط ہے، بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز۔کوئی مائی کا لعل گزر نہیں سکتا، اللہ اگر توفیق نہ دے۔اس لیے اسی کے آگے گڑگڑاتے رہنا چاہیے، اسی سے توفیق و تائید مانگتے رہنا چاہیے۔یہ لائف اسٹائل اختیار کرنا نسبتاً آسان ہے۔اور اللہ جب اس راہ کا راہی بنائے تو پھر کہہ دینا چاہیے ﴿حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴾ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص صبح اور شام اس آیت کو سات سات بار پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کو دین اور دنیا کی فکروں سے نجات دے دے گا۔(حدیث منقول از صحیفۂ اہل حدیث، ۷۔جنوری ۲۰۱۱ء۔مرتب)۔

نوٹ:3

آیت۔10۔کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری افعال کے پیچھے جو باطنی محرکات (MOtives) چھپے ہوئے ہیں وہ سب کھول کر رکھ دیئے جائیں گے اور ان کی جانچ پڑتال کر کے اچھائی برائی کو الگ الگ کر دیا جائے گا۔یعنی فیصلہ صرف ظاہر ہی کو دیکھ کر نہیں کیا جائے گا کہ انسان نے عملاً کیا کچھ کیا۔بلکہ دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو نکال کر دیکھا جائے گا کہ انسان نے جو کام کیے وہ کس نیت اور کس غرض سے کیے۔اس بات پر اگر انسان غور کرے تو وہ یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اصلی اور مکمل انصاف خدا کی عدالت کے سوا اور کہیں نہیں ہوسکتا۔دنیا کے لادینی قوانین بھی اصولی حیثیت سے ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے محض ظاہری فعل کی بنا پر اسے سزا نہ دی جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس نے کس نیت سے وہ فعل کیا۔لیکن دنیا کی کسی عدالت کے پاس وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ نیت کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کر سکے۔یہ صرف اور صرف خدا ہی کر سکتا ہے کہ الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ محض اللہ کے اس علم کی بنا پر نہیں ہوگا جو وہ دلوں کے ارادوں اور نیتوں کے بارے میں پہلے ہی سے رکھتا ہے، بلکہ قیامت کے روز اس رازوں کو کھول کر سامنے رکھ دیا جائے گا اور کھلی عدالت میں یہ دکھایا جائے گا کہ ان میں خیر کیا تھی اور شر کیا تھا۔ (تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورۃ القارعہ (101)

آیت نمبر (1 تا 8)

اَلۡقَارِعَةُ ۙ﴿۱﴾	مَا الۡقَارِعَةُ ۚ﴿۲﴾	وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ؕ﴿۳﴾
کھٹکھٹانے والی	کیا ہے کھٹکھٹانے والی	اور تو نے کیا سمجھا کیا ہے کھٹکھٹانے والی

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ	كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ﴿۴﴾	وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ
جس دن ہو جائیں گے لوگ	بکھیرے ہوئے پتنگوں کی مانند	اور ہو جائیں گے سارے پہاڑ

كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴿۵﴾	فَاَمَّا مَنْ	ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۶﴾	فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿۷﴾
دُھنی ہوئی رنگین اون کی مانند	پس وہ جو ہے	بھاری ہوئے جس کے ترازو (پلڑے)	تو وہ من بھاتی زندگی گزارنے میں ہے

وَاَمَّا مَنْ	خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۸﴾	فَاُمُّهٗ
اور وہ جو ہے	ہلکے ہوئے جس کے ترازو (پلڑے)	تو اس کی ماں (گود)

هَاوِيَةٌ ﴿۹﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ﴿۱۰﴾	نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾
ایک نیچے اترنے والی (جگہ۔گڑھا) ہے	ارتو نے سمجھا کیا ہے وہ (جگہ)	(وہ) ایک دہکنے والی آگ ہے

نوٹ: 1

قَارِعَةٌ کا لفظی ترجمہ ہے ٹھونکنے والی۔ یہ لفظ ہولناک حادثہ اور بڑی بھاری آفت کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں یہ لفظ قیامت کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور اِن آیات میں قیامت کے پہلے مرحلے سے لے کر عذاب وثواب کے آخری مرحلے تک کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ پہلی پانچ آیات میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے جب وہ حادثۂ عظیم (اَلْقَارِعَةُ) برپا ہوگا جس کے نتیجے میں دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس وقت لوگ گھبراہٹ کے عالم میں اس طرح بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے ہر طرف پراگندہ ومنتشر ہوتے ہیں اور پہاڑ دھنکے ہوئے اُون کی طرح ہوں گے۔ پھر اگلی آیات میں اس مرحلے کا ذکر ہے جب دوبارہ زندہ ہو کر لوگ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوں گے۔ (تفہیم القرآن)۔

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ﴿۴﴾ کا ایک مطلب یہ بھی لیا گیا ہے کہ یہ اس وقت کی کیفیت کا بیان ہے جب لوگ دوبارہ زندہ ہو کر قبروں سے نکلیں گے۔ لیکن اگلی آیت میں پہاڑوں کی جس کیفیت کا بیان ہے اس کی بنیاد پر یہ رائے زیادہ قرین قیاس نہیں ہے۔ (مرتب)۔

اعمال کے وزن کی وضاحت الاعراف کی آیات۔8۔9۔ کے نوٹ۔2 میں کی جا چکی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ التکاثر (102)

آیت نمبر (1 تا 8)

ترکیب

(آیت۔1) تَكَاثُرُ باب تفاعل کا مصدر ہے اس لیے اس میں باہم ایک دوسرے پر کثرت حاصل کرنے کا مفہوم شامل ہے۔ اور یہ اَلْهٰى کا فاعل ہونے کی وجہ سے حالتِ رفع میں ہے۔ جس چیز میں کثرت کی خواہش نے انسان کو غافل کیا وہ یہاں محذوف ہے اس لیے اس کے مفہوم میں وسعت ہے۔ دنیوی ساز وسامان نے جس چیز سے انسان کو غافل کیا وہ بھی محذوف ہے۔ جو آخرت بھی ہو سکتی ہے، ذکر اللہ بھی ہو سکتا ہے۔

(آیت۔7) تَعْلَمُوْنَ کا مفعول ہونے کی وجہ سے عِلْمَ الْيَقِيْنِ حالتِ نصب میں ہے۔ ثُمَّ لَتَرَوُنَّ کا مفعول هَا ضمیر ہے

اور عَيْنَ الْيَقِيْنَ حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ عِلْمَ الْيَقِيْنِ اور عَيْنَ الْيَقِيْنِ دونوں مرکب اضافی ہیں لیکن اضافت کے ساتھ ترجمہ کرنے سے ان اصطلاحات کا مفہوم واضح نہیں ہوتا اس لیے ان کا ترجمہ اردو محاورے کے مطابق ہوگا۔ (آیت۔8) اَلنَّعِيْمِ پر لام جنس ہے۔

ترجمہ

اَلْهٰىكُمُ	التَّكَاثُرُ ۙ①	حَتّٰى زُرْتُمُ
غافل کیا تم لوگوں کو (اللہ کی یاد سے)	ایک دوسرے پر کثرت کرنے نے (دنیوی سامان میں)	یہاں تک کہ زیارت کی تم لوگوں نے

الْمَقَابِرَ ؕ②	كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ③	ثُمَّ كَلَّا	سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ④
قبرستانوں کی	ہرگز نہیں! عنقریب جان لوگے	پھر (مکرر) ہرگز نہیں!	عنقریب تم لوگ جان لوگے

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ	عِلْمَ الْيَقِيْنِ ؕ⑤	لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ⑥
ہرگز نہیں! کاش تم لوگ جانتے ہوتے	(بتائے ہوئے) علم پر یقین (کی اہمیت) کو	(تو اب) تم لوگ لازماً دیکھو گے دوزخ کو

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا	عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ⑦	ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ	عَنِ النَّعِيْمِ ⑧
پھر تم لوگ لازماً دیکھو گے اس کو	دیکھنے پر یقین کرتے ہوئے	پھر تم سے لازماً پوچھا جائے گا اس دن	تمام نعمتوں کے بارے میں

نوٹ:1 تکاثر کا مطلب ہے کثرت کے ساتھ مال و دولت جمع کرنا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سورۃ پڑھ کر فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مال کو ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے اور مال پر جو فرائض اللہ کے عائد ہوئے ہیں ان میں خرچ نہ کریں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2 مسجد خالد، لاہور کے پہلے خطب کرنل اختر مرحوم نے ایک مثال کے ذریعے علم الیقین اور عین الیقین کا فرق اس طرح واضح کیا کہ ایک عام آدمی بھی بڑی آسانی سے اس کو سمجھ لیتا ہے۔ مثال یہ ہے کہ دو آدمی بازار سے ہو کر اپنے گھر جا رہے تھے۔ کسی نے ان کو اطلاع دی کہ اس راستے پر آگے تمہارا دشمن بیٹھا ہے۔ اس راستے سے مت جاؤ۔ ایک آدمی نے اس اطلاع پر یقین کر لیا اور راستہ بدل کر بخیریت پہنچ گیا۔ دوسرے آدمی نے یقین نہیں کیا۔ آگے جا کر جب وہ دشمن کے ہتھے چڑھ گیا تب اس کو یقین آیا اس مثال میں ایک اَن دیکھی حقیقت کا علم دونوں کو دیا گیا۔ پہلے آدمی نے اس علم پر یقین کر لیا۔ اس کو علم الیقین کہتے ہیں۔ اس کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ اس علم سے فائدہ اٹھانے یا کسی خطرے سے بچاؤ کرنے کے لیے عمل کرنے کا موقع باقی رہتا ہے۔ دوسرے آدمی نے علم پر یقین نہیں کیا۔ آگے جا کر جب اس کو دشمن نظر آیا تو اس کو یقین آ گیا۔ اس کو عین الیقین تو حاصل ہو جائے گا لیکن اس کا فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔ اس حوالہ سے اس بات کو ذہن نشین کر لیں کہ سارا اجر و ثواب علم الیقین پر ہے اور اسی کا دوسرا نام ایمان بالغیب ہے۔ جدید تعلیم یافتہ کچھ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایمان بالغیب کا مطالبہ غیر فطری ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مطالبہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے کیونکہ غیب پر ایمان لانے کی صلاحیت انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ (Inbuilt) ہے۔ اس کی تشریح آیت۔2/البقرۃ:3، نوٹ۔2 میں کی جا چکی ہے۔

2029

2029

2029

2029

2029

2029

2029

2029

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

2050

سورۃ العصر (103)

آیت نمبر (1 تا 3)

ترجمہ

وَالۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾	اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾	اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا
قسم ہے زمانے کی	بیشک تمام انسان یقیناً خسارے میں ہیں	سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ	وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾
اور انہوں نے عمل کیے نیکیوں کے	اور باہم تاکید کی اس حق (دین) کی	اور باہم تاکید کی ثابت قدم رہنے کی

نوٹ: 1

العصر (زمانہ) لفظ گزرے ہوئے زمانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور گزرتے ہوئے زمانے کے لیے بھی جسے حال کہتے ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جو لوگ بھی اِن صفات سے خالی تھے وہ بالآخر خسارے میں پڑ کر رہے۔ اور گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کا مطلب سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات سمجھ لیں کہ جو زمانہ اب گزر رہا ہے یہ دراصل وہ وقت ہے جو ہر ایک شخص کو دنیا میں کام کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اس کی مثال اس وقت کی سی ہے جو امتحان کے کمرے میں طالب علم کو پرچے حل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ وقت جس تیز رفتاری سے گزر رہا ہے اس کا اندازہ تھوڑی دیر کے لیے اپنی گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھنے سے آپ کو ہو جائے گا۔ پس گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر جو بات اس سورہ میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تیز رفتار زمانہ شہادت دے رہا ہے کہ ان چار صفات سے خالی ہو کر انسان جن کاموں میں بھی اپنی مہلت عمر صرف کر رہا ہے وہ سب کے سب خسارے کے سودے ہیں۔ نفع میں صرف وہ لوگ ہیں جو ان چاروں صفات سے متصف ہو کر دنیا میں کام کریں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

اس سورہ میں خسارے سے بچنے کے لیے جن چار صفات کا ذکر ہے وہ یہ ہیں ایمان۔ عملِ صالح۔ تواصی بالحق۔ تواصی بالصبر۔ ان میں ایمان اور عمل صالح خود انسان کی ذات سے متعلق ہیں۔ ان کا معاملہ واضح ہے اور کسی تشریح کا محتاج نہیں، البتہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر قابل غور ہیں۔ تواصی کا لفظ وصیت سے بنا ہے۔ کسی شخص کو تاکید کے ساتھ مؤثر انداز میں نصیحت کرنے کا نام وصیت ہے۔ اسی وجہ سے مرنے والا اپنے بعد کے لیے جو ہدایات دیتا ہے اس کو بھی وصیت کہا جاتا ہے۔ لفظ حق اور صبر کے معنی میں ایک احتمال یہ ہے کہ حق سے مراد صحیح عقائد اور اعمال صالحہ کا مجموعہ ہو اور صبر سے مراد تمام گناہوں اور بُرے کاموں سے بچنا ہو۔ ایسی صورت میں حق کا حاصل امر بالمعروف ہو گیا اور صبر کا حاصل نہی عن المنکر ہو گیا، یعنی وہ ایمان اور عمل صالح جس کو انسان نے خود اختیار کیا ہے اس کی تاکید اور نصیحت دوسروں کو کرنا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ حق سے مراد صحیح اعتقادات لیے جائیں اور صبر کے مفہوم میں تمام نیک اعمال کی پابندی اور بُرے کاموں سے بچنا شامل ہو۔ حافظ ابن تیمیہ کے ایک رسالے کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ تواصی بالحق سے مراد دوسرے مسلمانوں کی علمی اصلاح ہے اور تواصی بالصبر سے مراد عملی اصلاح ہے۔

اس لحاظ سے اس سورہ میں مسلمانوں کو ایک بہت بڑی ہدایت دی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کا اپنے عمل کو قرآن وسنت کے تابع کر لینا جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا ہی اہم اور ضروری یہ بھی ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ایمان اور عمل صالح کی طرف بلانے کی مقدور بھر کوشش

کرے ورنہ صرف اپنا عمل نجات کے لیے کافی نہ ہوگا۔ خاص طور سے اپنے اہل وعیال، متعلقین اور احباب کے بُرے اعمال سے غفلت برتنا اپنی نجات کا راستہ بند کرنا ہے، اگرچہ خود وہ کیسے ہی اعمال صالحہ کا پابند ہو۔ اس معاملہ میں عام مسلمان بلکہ بہت سے خواص تک غفلت میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ہدایت پر عمل کی توفیق نصیب فرمادے۔ (معارف القرآن)۔

آج (۱۴۳۲ھ۔ ۲۰۱۱ء) کے پاکستانی معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ یہ معاملہ اب غفلت برتنے سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو، اور اس میں بھی خاص طور سے نہی عن المنکر کو ہم لوگ دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی سمجھ کر معیوب سمجھتے رہے۔ پھر جب بات اس سے بھی آگے بڑھی تو پہیہ اُلٹا گھومنا شروع ہوگیا۔ یعنی اب ہم لوگ نہی عن المنکر کے فریضے کو نہ صرف اپنے لیے معیوب سمجھتے ہیں بلکہ یہ فریضہ سرانجام دینے والے کو اس کام سے منع کرتے ہیں اور اپنے مقدور بھر روکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ ہمارا دوسرا المیہ یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ یہ فریضہ سرانجام دینے کے لیے کمربستہ ہوتے ہیں تو پھر وہ داروغہ بن بیٹھتے ہیں حالانکہ اللہ نے اس کی اجازت اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی نہیں دی تھی۔ ان دونوں انتہائی (Extereme) رویوں کی بنیادی وجہ ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ اس فریضے کو سرانجام دینے کے لیے قرآن وحدیث کا مطلوبہ متوازن طرزِ عمل ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم میں سے جو لوگ اس کو فرض سمجھتے بھی ہیں تو انہوں نے اس کو فرض کفایہ یعنی مولوی لوگوں کی ذمہ داری قرار دے کر خود کو فارغ کرلیا ہے۔ حالانکہ یہ فرض عین ہے یعنی فرداً فرداً ہر شخص پر اس کے ظروف واحوال کے مطابق فرض ہے۔ اسی ذہنی خلا کو پر کرنے کی نیت سے کچھ عرصہ پہلے فاؤنڈیشن کے میگزین میں شائع ہونے والے چند مضامین کو یکجا کر کے ''اصلاحِ معاشرہ'' کے عنوان سے شائع کر کے تقسیم کیا گیا تھا پھر اسے جینے کا سلیقہ کورس میں شامل کر دیا گیا۔ جن طلبا کے پاس یہ کتابچہ نہیں ہے وہ اپنے رول نمبر کے حوالے سے یہ کتابچہ بلا معاوضہ طلب کرلیں۔

اس ضمن میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اوپر معارف القرآن کی عبارت میں کہا گیا ہے کہ اس فریضہ سے پہلوتہی کرنا اپنی نجات کا راستہ بند کرنا ہے۔ یہاں نجات کا مطلب یہ ہے کہ بندے کو میدان حشر سے براہِ راست جنت میں داخلے کا پروانہ نصیب ہوجائے۔ اس میں اس عقیدے کی نفی نہیں ہے کہ گنہگار اہل ایمان اپنے گناہوں کے بمقدار سزا بھگتنے کے بعد دوزخ سے نکال لیے جائیں گے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الھمزۃ (104)

آیت نمبر (1 تا 9)

ترکیب

(آیات۔ 1 تا 4) هُمَزَةٌ۔ لُمَزَةٌ۔ حُطَمَةٌ یہ تینوں الفاظ اسمائے صفت ہیں اور ان تینوں پر تائے مبالغہ ہے۔ (آیت۔ 3) اَنَّ کا اسم مَالَهٗ ہے اس لیے یہ حالت نصب میں ہے اور یہ اَخۡلَدَ کا فاعل ہے۔ اس سے متصل هٗ کی ضمیر مفعولی گزشتہ آیت میں اَلَّذِیۡ کے لیے ہے۔ (آیت۔ 6) نَارُ اللّٰهِ خبر ہے۔ اَلۡمُوۡقَدَةُ۔ نَارُ کی صفت ہے اس لیے اس پر تائے تانیث ہے۔ اس خبر کا مبتدا هِیَ محذوف ہے۔ (آیت۔ 8) اِنَّ کا اسم اس کے ساتھ هَا کی ضمیر ہے جو نَارٌ کے لیے ہے۔ مُّؤۡصَدَةٌ اس کی خبر ہے اس لیے اس پر تائے تانیث ہے۔ (آیت۔ 9) فِیۡ عَمَدٍ متعلق خبر ہے اِنَّهَا کی اور مُّمَدَّدَةٍ صف ہے عَمَدٍ، جو جمع مکسر ہے۔ اس لیے اس کی صفت واحد مؤنث آئی ہے۔

ترجمہ

2050

وَيْلٌ لِّكُلِّ	هُمَزَةٍ	لُّمَزَةٍ ۝١	ٱلَّذِي جَمَعَ مَالًا
تباہی ہے ہر ایک	بہت طعنہ زنی کرنے والے	بہت عیب جوئی کرنے والے کے لیے	جس نے جمع کیا کچھ مال

وَّعَدَّدَهُۥ ۝٢	يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُۥٓ	أَخْلَدَهُۥ ۝٣	كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ
اور وہ بار بار گنتا رہا اس کو	وہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال	دوام بخشے گا اس کو	ہرگز نہیں! اُس (شخص) کو لازماً پھینکا جائے گا

فِي ٱلْحُطَمَةِ ۝٤	وَمَآ أَدْرَىٰكَ	مَا ٱلْحُطَمَةُ ۝٥	نَارُ ٱللَّهِ ٱلْمُوقَدَةُ ۝٦
اُس بہت روندنے والی میں	اور تو نے کیا سمجھا	کیا ہے وہ بہت روندنے والی	(وہ) اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے

ٱلَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى ٱلْأَفْـِٔدَةِ ۝٧	إِنَّهَا عَلَيْهِم	مُّؤْصَدَةٌ ۝٨	فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝٩
جو چڑھتی ہے دلوں پر	بیشک وہ (آگ) ان پر	اوپر سے بند کی ہوئی ہے	دراز کیے ہوئے ستونوں میں

نوٹ: 1

سابق سورۃ العصر اور اس سورہ کے مضمون میں نہایت واضح مناسبت یہ ہے کہ سابق سورہ میں فلاح پانے والے انسانوں کا کردار بیان ہوا ہے اور اس سورہ میں اس کے بالکل ضد کردار بیان ہوا ہے جو روپیہ گن گن کر رکھتے ہیں اور لوگوں کے حقوق ادا کرنا تو درکنار، کسی کو اگر دیکھ پائیں کہ وہ ادائے حقوق کے معاملے میں عملاً و قولاً سرگرم ہے تو اپنے طعن وطنز سے اسے تنگ کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کا حوصلہ پست کر دیں تاکہ ان کی بخالت پر پردہ پڑا رہے اور ان کو خفت وندامت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ قرآن نے بخیل سرمایہ داروں کے اس کردار کی طرف جگہ جگہ اشارہ کیا ہے۔ مثلاً سورۃ توبہ کی آیت۔ 49۔ میں ہے۔ ''جو لوگ خوش دلی سے انفاق کرنے والے اہل ایمان پر ان کے صدقات کے باب میں نکتہ چینی کرتے ہیں اور جو غریب اپنی محنت مزدوری سے انفاق کرتے ہیں، ان پر پھبتیاں چست کرتے ہیں، اللہ نے ان لوگوں کا مذاق اڑایا اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔'' (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 2

اس سورہ کو اگر ان سورتوں کے تسلسل میں رکھ کر دیکھا جائے جو سورہ زلزال سے یہاں تک چلی آرہی ہیں تو آدمی بڑی اچھی طرح یہ سمجھ سکتا ہے کہ مکہ معظّمہ کے ابتدائی دور میں کس طریقے سے اسلام کے عقائد اور اس کی تعلیمات کو لوگوں کے ذہن نشین کیا گیا تھا۔ سورۂ زلزال میں بتایا گیا کہ کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی ایسی نہ ہوگی جو اس نے دنیا میں کی ہو اور وہ آخرت میں اس کے سامنے نہ آجائے۔ سورہ عادیات میں اس کشت وخون اور غارت گری کی طرف اشارہ کیا گیا جو عرب میں ہر طرف برپا تھی۔ پھر یہ احساس دلانے کے بعد کہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں کا یہ استعمال اس کی بہت بڑی ناشکری ہے، لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ معاملہ اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی میں صرف افعال ہی کی نہیں بلکہ نیتوں تک کی جانچ پڑتال ہوگی۔ سورۂ قارعہ میں قیامت کا نقشہ پیش کرنے کے بعد لوگوں کو خبردار کیا گیا کہ آخرت میں انسان کے انجام کا انحصار اس پر ہوگا کہ اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے یا ہلکا۔ سورۂ تکاثر میں اس ذہنیت پر گرفت کی گئی جس کی وجہ سے لوگ مرتے دم تک دنیا کے عیش وآرام اور جاہ ومنزلت میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ پھر اس کے بُرے انجام سے آگاہ کیا گیا کہ ایک ایک نعمت جو یہاں تمہیں مل رہی ہے اس کے لیے تمہیں اپنے رب کو جواب دینا ہوگا کہ اسے کیسے حاصل کیا اور کہاں استعمال کیا۔ سورۂ عصر میں بتا دیا گیا کہ نوع انسانی کا ایک ایک فرد خسارے میں ہے اگر اس میں مذکورہ چار صفات نہ ہوں۔ اس کے بعد یہ سورہ آئی ہے جس

میں جاہلیت کی سرداری کا ایک نمونہ پیش کر کے لوگوں کے سامنے گویا یہ سوال رکھ دیا گیا کہ یہ کردار خسارے میں کیوں نہ ہو۔(تفہیم القرآن)۔ 2050

نوٹ: 3 آیت۔3۔کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے حیاتِ جاوداں بخش دے گا یعنی دولت جمع کرنے اور اسے گن گن کر رکھنے میں وہ ایسا منہمک ہے کہ اسے اپنی موت یاد نہیں رہی اور اسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ایک وقت یہ سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہونا ہے۔

آیت۔7۔میں اَلْاَفْـِٕدَةِ کا لفظ آیا ہے جو فواد کی جمع ہے اور جس کے معنی دل کے ہیں۔لیکن یہ لفظ اس عضو کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسان کے شعور وادراک، جذبات وخواہشات، عقائد وانکار اور نیتوں اور ارادوں کا مقام ہے۔دلوں تک اس آگ کے پہنچنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ آگ اس جگہ تک پہنچے گی جو انسان کے فاسد عقائد اور ناپاک خواہشات وجذبات کا مرکز ہے۔دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی وہ آگ دنیا کی آگ کی طرح اندھی نہیں ہوگی کہ مستحق اور غیر مستحق سب کو جلا دے بلکہ وہ ایک ایک مجرم کے دل تک پہنچ کر ہر ایک کو اس کے جرم کے مطابق عذاب دے گی۔(تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الفیل (105)

آیت نمبر (1 تا 5)

اَلَمۡ تَرَ	کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ	بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ؕ﴿۱﴾	اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَهُمۡ
کیا تو نے غور نہیں کیا	کیسا کیا تیرے رب نے	ہاتھی والوں کے ساتھ	کیا اس نے نہیں کیا ان کے داؤ کو

فِیۡ تَضۡلِیۡلٍ ۙ﴿۲﴾	وَّ اَرۡسَلَ عَلَیۡهِمۡ طَیۡرًا	اَبَابِیۡلَ ۙ﴿۳﴾
تباہ کرنے میں	اور اس نے بھیجے ان لوگوں پر کچھ پرندے	جھنڈ در جھنڈ ہوتے ہوئے

تَرۡمِیۡهِمۡ	بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۙ﴿۴﴾	فَجَعَلَهُمۡ کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ ﴿۵﴾
جو پھینکتے تھے ان پر	کچھ پتھر مٹی کے پتھر میں سے	پھر اس نے کر دیا ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند

نوٹ: 1 سورہ بروج کے نوٹ۔2۔میں بیان کیا جا چکا ہے کہ یمن کے بادشاہ نے اللہ پر ایمان لانے والے عیسائیوں کو آگ میں زندہ جلا دیا تھا۔اس ظلم کا بدلہ لینے کے لیے حبشہ کی عیسائی حکومت نے یمن پر حملہ کر دیا اور 525ء میں اس پورے علاقے پر حبشی حکومت قائم ہو گئی تھی یمن پر جو حبشی فوج حملہ آور ہوئی تھی اس کے دو سردار ارياط اور ابرہہ بعد میں آپس میں لڑ پڑے مقابلہ میں ارياط مارا گیا اور ابرہہ ملک پر قابض ہو گیا۔یمن میں پوری طرح اپنا اقتدار مضبوط کر لینے کے بعد ابرہہ نے اس مقصد کے لیے کام شروع کیا جو ابتدا سے رومی سلطنت اور حبشی عیسائیوں کے پیش نظر تھا۔یعنی عرب میں عیسائیت پھیلانا اور اس کی تجارت پر قبضہ کرنا جو بلادِ مشرق (یعنی انڈونیشیا،

ہندوستان وغیرہ) اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے یمن کے دارالحکومت صنعا میں ایک عظیم الشان کلیسا (گرجا گھر) تعمیر کرایا۔ اس کی تکمیل کے بعد اس نے حبشہ کے بادشاہ کو لکھا کہ میں عربوں کا حج کعبہ سے اس کلیسا کی طرف موڑے بغیر نہ رہوں گا۔ اس نے یمن میں علی الاعلان اپنے اس ارادے کا اظہار کیا اور اس کی منادی کرادی۔ اسپر کسی عرب یا قریشی نے یا چند قریشی نوجوانوں نے مشتعل ہوکر کلیسا کو گندا کر دیا یا اس کو آگ لگائی۔ لیکن یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ابرہہ نے خود اپنے کسی آدمی سے ایسی کوئی حرکت کروائی ہوتا کہ اسے مکہ پر حملہ کرنے کا بہانہ مل جائے۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد اس نے کعبہ کو ڈھا دینے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں وہ ساٹھ ہزار فوج اور تیرہ ہاتھی لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں دو عرب سرداروں نے اپنے اپنے لشکر جمع کر کے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر دونوں کو شکست ہوئی۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ لشکر جب عرفات کے قریب پہنچا تو حضرت عبدالمطلب اس کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کو اگر کوئی چیز مطلوب تھی تو ہمیں کہلا بھیجتے ہم اسے لے کر خود آپ کے پاس حاضر ہو جاتے۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ یہ گھر امن کا گھر ہے، میں اس کا امن ختم کرنے آیا ہوں۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا کہ یہ اللہ کا گھر ہے اور اس نے آج تک کسی کو اس پر مسلط نہیں ہونے دیا ہے۔ ابرہہ نے کہا ہم اس کو منہدم کیے بغیر نہیں پلٹیں گے۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا کہ آپ جو کچھ چاہیں لے لیں اور واپس چلے جائیں۔ مگر ابرہہ نے انکار کر دیا اور اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں اونٹوں کے قصے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ مکہ اور اس کے آس پاس کے قبائل اتنی بڑی فوج سے لڑ کر کعبے کو بچانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے یہ بالکل قابل فہم بات ہے کہ قریش نے اس کی مزاحمت کی کوئی کوشش نہ کی۔ ابرہہ کے لشکر سے واپس آ کر حضرت عبدالمطلب نے قریش والوں سے کہا کہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جائیں تا کہ ان کا قتل عام نہ ہو جائے۔ پھر وہ قریش کے چند سرداروں کو لے کر حرم میں حاضر ہوئے اور کعبے کے دروازے کا کُنڈا پکڑ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اس وقت خانۂ کعبہ میں ۳۶۰ بت موجود تھے لیکن اس وقت یہ لوگ ان سب کو بھول گئے اور انہوں نے صرف اللہ کے آگے دست سوال پھیلایا۔ ان کی جو دعائیں تاریخوں میں منقول ہیں ان میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ دعائیں مانگ کر حضرت عبدالمطلب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں میں چلے گئے۔

دوسرے روز ابرہہ مکہ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا مگر اس کا خاص ہاتھی محمود، جو آگے آگے تھا یکایک بیٹھ گیا۔ اس کو بہت تبر مارے گئے، آنکسو سے کچوکے دیئے گئے یہاں تک کہ اسے زخمی کر دیا گیا مگر وہ نہ ہلا۔ اسے کسی اور سمت موڑ کر چلاتے تو وہ دوڑنے لگتا مگر مکہ کی طرف موڑا جاتا تو فوراً بیٹھ جاتا اور کسی طرح آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اتنے میں پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں لیے ہوئے آئی اور لشکر پر ان کی بارش کر دی۔ جس پر یہ کنکر گرتے اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا اور ہڈیاں نکل آتیں۔ خود ابرہہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ سب کے سب اسی وقت ہلاک نہیں ہوئے۔ کچھ تو وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے بھر گرتے چلے گئے، ابرہہ بھی خثعم کے علاقے میں پہنچ کر مرا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں عرب کے دوسرے سردار نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو صرف یہی سزا دینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ تین چار سال کے اندر یمن سے حبشی اقتدار ہمیشہ

کے لیے ختم کر دیا۔ واقعہ فیل کے بعد یمن میں ان کی طاقت ٹوٹ گئی۔ جگہ جگہ یمنی سردار علم بغاوت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک یمنی سردار نے شاہ ایران سے فوجی مدد طلب کر لی۔ ایران سے صرف ایک ہزار فوج چھ جہازوں کے ساتھ آئی تھی جو حبشی حکومت کا خاتمہ کر دینے کے لیے کافی ہوگئی۔ یہ ۵۷۵ء کا ہے۔

یہ اتنا بڑا واقعہ تھا جس کی تمام عرب میں شہرت ہوگئی۔ بہت سی شعراء نے قصائد کہے۔ ان تمام قصائد میں یہ بات بالکل نمایاں ہے کہ سب نے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعجاز قرار دیا اور کہیں اشارہ و کنایۃً بھی یہ نہیں کہا کہ اس میں ان بتوں کا بھی کوئی دخل تھا جو کعبہ میں پوجے جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قریش نے دس سال تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ جس سال یہ واقعہ پیش آیا اہل عرب اسے عام الفیل کہتے ہیں۔ اور اسی سال رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ مبارکہ ہوئی۔ محدثین اور مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ واقعہ محرم میں پیش آیا تھا اور حضور ﷺ کی ولادت ربیع الاوّل میں ہوئی تھی۔ اکثریت یہ کہتی ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت واقعہ فیل کے پچاس دن بعد ہوئی۔

جو تاریخی واقعات اوپر دیئے گئے ہیں ان کو نگاہ میں رکھ کر سورۂ فیل پر غور کیا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس سورہ میں اس قدر اختصار کے ساتھ صرف اصحاب فیل پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کر دینے پر کیوں اکتفا کیا گیا۔ واقعہ کچھ پرانا نہ تھا اور مکہ کا بچہ بچہ اس کو جانتا تھا۔ تمام اہل عرب اس بات کے قائل تھے کہ ابرہہ کے حملے سے کعبے کی حفاظت کسی دیوی دیوتا نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ قریش کے سرداروں نے اللہ ہی سے مدد کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ پھر اس واقعہ سے وہ اس قدر متاثر رہے کہ کئی سالوں تک انہوں نے اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی تھی۔ اس لیے سورۂ فیل میں تفصیلات کے ذکر کے بجائے صرف اس واقعہ کو یاد دلا دینا کافی تھا تاکہ قریش کے لوگ خصوصاً اور اہل عرب عموماً سوچیں کہ محمد ﷺ جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دوسرے تمام معبودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جائے۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶۔ ص ۴۶۲ تا ۴۶۹ سے ماخوذ)۔

نوٹ: 2

آیت۔ ۲۔ میں لفظ کَید استعمال کیا گیا ہے جو کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے خفیہ تدبیر کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں کیا چیز خفیہ تھی۔ ابرہہ ساٹھ ہزار کا لشکر ہاتھیوں کے دستے کے ساتھ لے کر اعلانیہ یمن سے مکہ آیا تھا اور اس نے یہ بات چھپا کر نہیں رکھی تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھانے آیا ہے۔ اس لیے یہ تدبیر تو خفیہ نہ تھی۔ البتہ اس اعلانیہ کاروائی کے پیچھے جو نیت تھی وہ خفیہ تھی اور وہ حبشیوں کی یہ غرض تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھا کر اور تمام اہل عرب کو مرعوب کر کے تجارت کا وہ راستہ عربوں سے چھین لینا چاہتے تھے جو جنوبِ عرب سے شام و مصر کی طرف جاتا تھا۔ اس مقصد کو انہوں نے چھپا کر رکھا تھا اور ظاہر یہ کیا تھا کہ ان کے کلیسا کی جو بے حرمتی عربوں نے کی ہے اس کا بدلہ وہ ان کا معبد ڈھا کر لینا چاہتے ہیں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 3

ابابیل کا لفظ جمع کا ہے مگر اس کا کوئی مفرد (واحد) مستعمل نہیں ہے۔ اس کے معنی پرندوں کے غول کے ہیں اور یہ کسی خاص پرندے کا نام نہیں ہے۔ اردو میں ایک خاص چڑیا کو ابابیل کہتے ہیں، یہاں وہ مراد نہیں ہے بلکہ یہ پرندے عجیب طرح کے تھے جو اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے تھے۔ جسامت میں کبوتر سے چھوٹے تھے اور ان کے پنجے سرخ تھے۔ یہ کوئی ایسی جنس تھی جو پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی اور نہ بعد میں دیکھی گئی۔ (معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

2050

سورۃ(107)

آیت نمبر(1تا4)

ترکیب

(آیت۔1)اِیۡلَافٌ باب افعال کا مصدر ہے۔اس پر حروف جارہ کالِ داخل ہوا جس نے اس کو جرّ دی ہے اور مضاف ہونے کی وجہ سے اس کی تنوین ختم ہوئی ہے۔قُرَیۡشٍ اس کا مضاف الیہ ہے۔بات کا مرکب جاری سے شروع ہونا تقاضا کرتا ہے کہ اس سے پہلے کچھ محذوف مانا جائے۔چنانچہ مفسرین کے ایک گروہ نے پچھلی سورت کے ساتھ معنوی تعلق کی بنا پر یہاں اِنَّ اَهۡلَكۡنَاهُمۡ یا اِنَّا اَهۡلَكۡنَا اَصۡحٰبَ الۡفِيۡلِ کو محذوف مانا ہے۔دوسرے گروہ نے اس کا تعلق اس جملہ سے مانا ہے جو آگے آرہا ہے یعنی فَلۡيَعۡبُدُوۡا ہم پہلی رائے کو ترجیح دیں گے۔
(آیت۔2)اٰلِفِهِمۡ میں اِیلَافِ کی جرّ بتا رہی ہے کہ پچھلے مرکب جاری لِاِیۡلَافِ قُرَیۡشٍ کا بدل ہے اِیۡلَافٌ دو مفعول کا تقاضہ کرتا ہے۔کس کو مانوس کیا اور کس چیز سے مانوس کیا۔یہاں اِیۡلَافِ کا مفعول اول هِمۡ کی ضمیر ہے اور رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ مفعول ثانی ہے۔

ترجمہ

لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۙ﴿۱﴾	اٰلِفِهِمۡ	رِحۡلَةَ	الشِّتَآءِ
(ہم نے ہلاک کیا اصحاب فیل کو) قریش کو مانوس کرنے کے واسطے	ان کو مانوس کرنا	سفر سے	سردی کے

وَالصَّيۡفِ ۚ﴿۲﴾	فَلۡيَعۡبُدُوۡا	رَبَّ هٰذَا الۡبَيۡتِ ۙ﴿۳﴾	الَّذِىۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ
اور گرمی کے	تو چاہیے کہ یہ لوگ بندگی کریں	اس گھر کے مالک کی	وہ جس نے کھانے کو دیا ان کو

مِّنۡ جُوۡعٍ ۙ	وَّاٰمَنَهُمۡ	مِّنۡ خَوۡفٍ ﴿۴﴾
بھوک میں	اور جس نے امن دیا ان کو	خوف میں

نوٹ:1

اس پر تو مفسرین کا اتفاق ہے کہ معنی اور مضمون کے اعتبار سے یہ سورت سورۂ فیل ہی سے متعلق ہے اور شاید اسی وجہ سے بعض مصاحف میں ان دونوں کو ایک ہی سورت کے طور پر لکھا گیا تھا اور ان کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی گئی تھی مگر حضرت عثمانؓ نے جب تمام مصاحف قرآن کو جمع کر کے ایک نسخہ تیار فرمایا اور تمام صحابہ کرامؓ کا اس پر اجماع ہوا،تو اس میں ان دونوں کو الگ الگ سورتوں کے طور پر لکھا گیا اور دونوں کے درمیان بسم اللہ لکھی گئی۔(معارف القرآن)۔

نوٹ:2

اس سورہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے جس سے اس سورہ کے مضمون اور سورۂ فیل کے مضمون کا گہرا تعلق ہے۔

قریش کا قبیلہ نبی ﷺ کے جدِ اعلیٰ قُصَیّ بن کلاب کے زمانے تک حجاز میں منتشر تھا۔قُصَیّ نے ان کو مکہ میں جمع کیا اور بیت اللہ کا انتظام اس قبیلہ کے ہاتھ آ گیا۔اس نے اطرافِ عرب سے آنے والے حاجیوں کی خدمت کا بہترین انتظام کیا۔قُصَیّ کے بعد اس کے بیٹوں عبد مناف اور عبدالدّار کے درمیان یہ انتظامات تقسیم ہو گئے۔عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ان میں ہاشم،حضرت عبدالمطلب کے والد اور رسول اللہ ﷺ کے پردادا تھے۔ہاشم کو سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ اس بین الاقوامی تجارت میں حصہ لیا جائے جو شام و مصر اور بلادِ مشرق (یعنی ہندوستان،انڈونیشا وغیرہ) کے درمیان ہو رہی تھی۔یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی حکومت اس

تجارتی راستے پر قابض ہو چکی تھی جو شمالی علاقوں اور خلیج فارس کے راستے سے رومی سلطنت اور بلادِ مشرق کے درمیان ہوئی تھی۔ اس لیے جنوبی عرب سے بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا، اس کا کاروبار بہت چمک اٹھا تھا۔ دوسرے تجارتی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے تمام قبائل بیت اللہ کے خادم ہونے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کے قافلوں پر ڈاکے نہیں مارتے تھے اور نہ ان سے رہگذر کے وہ بھاری ٹیکس وصول کرتے جو دوسرے قافلوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ ہاشم نے انہی تمام پہلوؤں کو دیکھ کر تجارت کی اسکیم بنائی اور اس میں اپنے باقی تین بھائیوں کو شامل کیا۔ یہ اسکیم کامیاب رہی اور ان کی تجارت تیزی سے ترقی کرنے لگی۔

اس تجارت کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام۔ مصر۔ عراق۔ ایران۔ یمن اور حبش کے لوگوں سے تعلقات کے مواقع حاصل ہوئے۔ اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب سے براہِ راست سابقہ پیش آنے کے باعث ان کی دانش و بینش کا معیار اتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ کوئی دوسرا قبیلہ ان کی ٹکر کا نہ رہا۔ ان بین الاقوامی تعلقات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ عراق سے یہ لوگ وہ رسم الخط لے کر آئے جو بعد میں قرآن مجید لکھنے میں استعمال ہوا۔ عرب کے کسی دوسرے قبیلے میں اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ تھے جتنے قریش میں تھے۔ یہ حالات تھے جب مکہ پر ابرہہ کی چڑھائی کا واقعہ پیش آیا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو عرب میں قریش ہی کی نہیں خود کعبہ کی دھاک بھی ختم ہو جاتی۔ مکہ تک حبشیوں کی پیش قدمی کے بعد رومی سلطنت آگے بڑھ کر شام اور مکہ کے درمیان کا تجارتی راستہ بھی اپنے قبضہ میں لے لیتی اور قریش اس سے زیادہ خستہ حالی میں مبتلا ہو جاتے جس میں وہ قُصَیّ بن کلاب سے پہلے مبتلا تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے حبشیوں کی ساٹھ ہزار فوج کو رہا کر دیا اور مکہ سے یمن تک سارے راستے اس فوج کے لوگ گر گر کر مرتے گئے، تو کعبہ کے بیت اللہ ہونے پر تمام اہل عرب کا ایمان پہلے سے بدرجہ زیادہ مضبوط ہو گیا ساتھ ہی قریش کی دھاک بھی ملک بھر میں پہلے سے زیادہ قائم ہو گئی۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے زمانے میں یہ حالات سب ہی کو معلوم تھے، اس لیے ان کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورہ کے چار مختصر فقروں میں قریش سے صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ جب تم مانتے ہو کہ یہ گھر بتوں کا نہیں بلکہ اللہ کا گھر ہے اور جب تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں اس گھر کی طفیل یہ امن عطا کیا، تمہاری تجارت کو یہ فروغ بخشا اور تمہیں فاقہ زدگی سے بچا کر یہ خوشحالی نصیب کی، تو تمہیں اسی کی عبادت کرنی چاہیے۔ (تفہیم القرآن، ج ۶۔ ص ۴۷۴ تا ۴۷۶ سے ماخوذ)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الماعون (107)

آیت نمبر (1 تا 7)

ترجمہ

اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ	يُكَذِّبُ	بِالدِّيۡنِ ۝١	فَذٰلِكَ	الَّذِىۡ
کیا تو نے دیکھا اس کو جو	جھوٹ جانتا ہے	بدلے (کے دن) کو	تو وہ،	وہ ہے جو

يَدُعُّ الۡيَتِيۡمَ ۝٢	وَلَا يَحُضُّ	عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ ۝٣
دھکا دیتا ہے یتیم کو	اور وہ ترغیب نہیں دیتا (کسی کو)	مسکین کا کھانا (دینے) پر

فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ۙ﴿۴﴾	الَّذِيۡنَ هُمۡ	عَنۡ صَلَاتِهِمۡ	سَاهُوۡنَ ۙ﴿۵﴾
تو بربادی ہے نمازیوں کے لیے	یہ وہ لوگ ہیں جو	اپنی نماز سے	غافل ہونے والے ہیں

الَّذِيۡنَ هُمۡ	يُرَآءُوۡنَ ۙ﴿۶﴾	وَيَمۡنَعُوۡنَ	الۡمَاعُوۡنَ ﴿۷﴾
یہ وہ لوگ ہیں جو	ریاکاری کرتے ہیں	اور روکتے ہیں	گھریلو اشیاء کو (گردش سے)

نوٹ:1 اس سورہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت پر ایمان نہ لانا، انسان کے اندر کس قسم کے اخلاق پیدا کرتا ہے۔ آیات۔2 اور 3۔ میں ان کفار کی حالت بیان کی گئی ہے جو اعلانیہ آخرت کو جھٹلاتے ہیں۔ اور آخری چار آیتوں میں ان منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے جو بظاہر مسلمان ہیں مگر دل میں آخرت اور اس کی جزا و سزا کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔ مجموعی طور پر دو گروہوں کے طرز عمل کو بیان کرنے سے مقصود یہ حقیقت ذہن نشین کرانا ہے کہ انسان کے اندر ایک مستحکم اور پاکیزہ کردار عقیدۂ آخرت کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2 آیت۔3۔ میں اگر اِطۡعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ کہا گیا ہوتا تو معنی یہ ہوتے کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں اکساتا۔ لیکن طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسکین کا کھانا اس کو دینے پر نہیں اکساتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو کھانا مسکین کو دیا جاتا ہے وہ دینے والے کا کھانا نہیں ہے بلکہ اسی مسکین کا کھانا ہے۔ یعنی دینے والا کوئی بخشش نہیں دے رہا ہے بلکہ مسکین کا حق ادا کر رہا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3 آیت۔4۔5۔ کے متعلق حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے فِيۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ نہیں فرمایا بلکہ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ فرمایا ہے۔ ہم نماز میں بھولتے تو ضرور ہیں مگر نماز سے غافل نہیں ہیں۔ اس لیے ہمارا شمار منافقوں میں نہیں ہوگا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے ان کے صاحبزادے مصعب بن سعد نے پوچھا کہ آپ نے اس آیت پر غور فرمایا کیا اس کا مطلب نماز چھوڑ دینا ہے یا اس سے مراد نماز پڑھتے ہوئے خیال کسی اور طرف چلا جانا ہے۔ خیال ہٹ جانے کی حالت ہم میں سے کس پر نہیں گزرتی۔ حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد نماز کے وقت کو ضائع کرنا اور اسے وقت ٹال کر پڑھنا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورۃ الکوثر (108)

آیت نمبر (1 تا 3)

ن	ح	ر

(ف) نَحۡرًا گلے میں چوٹ لگانا۔ ذبح کرنا۔
اِنۡحَرۡ فعل امر ہے۔ تو ذبح کر۔ قربانی کر۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

ب	ت	ر

(ن) بَتۡرًا کاٹنا۔ اللہ کا کسی کو بے اولاد کرنا۔ کسی کی نسل کو کاٹنا۔
(س) بَتَرًا کٹ جانا۔ بے اولاد ہونا۔ نسل کٹا ہونا۔

اَبْتَرْ — اَفْعَلُ کا وزن ہے بے اولاد۔ نسل کٹا۔ جس کی موت کے بعد اس کا خلف یعنی نام لیوا کوئی نہ ہو، نہ اولاد ہو اور نہ رشتہ دار یا احباب میں کوئی نام لیوا ہو زیر مطالعہ آیت۔3۔ (ایسا لگتا ہے کہ یہ لفظ افعال الوان وعیوب اور افعل تفضیل، دونوں کے مفاہیم کا جامع ہے۔ بے اولاد یا نسل کٹا ہونا، الوان وعیوب کا مفہوم ہے اور کوئی خلف نہ ہونا۔ افعل وتفضیل کا مفہوم ہے)۔

ترجمہ

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ	الْكَوْثَرَ ۝۱	فَصَلِّ لِرَبِّكَ
بیشک ہم نے عطا کی آپؐ کو	بے انتہا (خیر)	تو آپ نماز پڑھیں اپنے رب کے لیے

وَانْحَرْ ۝۲	اِنَّ شَانِئَكَ	هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳
اور آپؐ اونٹ قربان کریں	بیشک آپؐ سے بغض رکھنے والا	ہی بالکل بے نام ونشان ہے

نوٹ:1

کوثر کے معنی ہیں بہت زیادہ بھلائی اور بہتری۔ یہاں اس سے کیا چیز مراد ہے اس کے متعلق متعدد اقوال ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس لفظ کے تحت ہر قسم کی دینی و دنیوی اور حسی و معنوی نعمتیں داخل ہیں جو آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے طفیل اس اُمت کو ملنے والی تھیں۔ ان میں سے ایک بہت بڑی نعمت وہ حوض کوثر ہے جس کے پانی سے آپ ﷺ اپنی اُمت کو محشر میں سیراب فرمائیں گے۔ بعض روایات سے اس کا محشر میں ہونا اور اکثر سے جنت میں ہونا ثابت ہوتا ہے۔ علماء نے اس کی تطبیق یوں کی ہے کہ اصل نہر جنت میں ہوگی اور اسی کا پانی میدان حشر میں کسی حوض میں جمع کر دیا جائے گا۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

یہ انتہائی سخت وقت ہوگا جبکہ ہر ایک اَلْعَطَش۔ اَلْعَطَش (پیاس پیاس) پکار رہا ہوگا۔ اس وقت آپ ﷺ کی اُمت اس حوض پر حاضر ہوگی اور اس سے سیراب ہوگی لیکن کچھ لوگ محروم رہیں گے۔ اس کے بارے میں حضور ﷺ نے بار بار اپنے زمانے کے لوگوں کو خبردار کیا کہ میرے بعد تم میں سے جو لوگ بھی میرے طریقے کو بدلیں گے ان کو اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا۔ میں کہوں گا یہ میرے اصحاب ہیں تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ ﷺ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا ہے۔ پھر میں ان کو دفع کروں گا اور کہوں گا کہ دور ہو۔ یہ مضمون بکثرت روایات میں بیان ہوا ہے۔ (بخاری، مسلم، مسند احمد، ابن ماجہ وغیرہ)۔

اسی طرح حضور ﷺ نے اپنے دور کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو بھی خبردار کیا ہے کہ ان میں سے جو بھی میرے طریقے سے ہٹ کر چلیں گے اور اس میں ردو بدل کریں گے انہیں اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ اے رب یہ تو میرے ہیں، میری اُمت کے لوگ ہیں۔ جواب ملے گا آپ کو نہیں معلوم کہ انہوں نے آپ ﷺ کے بعد کیا کیا تغیرات کیے اور الٹے ہی پھرتے چلے گئے۔ پھر میں ان کو دفع کروں گا۔ اور حوض پر نہ آنے دوں گا۔ اس مضمون کی بہت سی روایات احادیث میں ہیں۔
(بخاری۔ مسلم۔ مسند احمد۔ ابن ماجہ) (تفہیم القرآن۔ ج۶ ص ۴۹۳ تا ۴۹۵ سے ماخوذ)

نوٹ:2

جب حضور ﷺ نبی بنائے گیے اور آپ ﷺ نے قریش کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی کہ قریش کے لوگ کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) اپنی قوم سے کٹ کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے کوئی درخت اپنی جڑ سے کٹ گیا ہو اور کچھ مدت بعد سوکھ کر پیوند خاک ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی اولاد نرینہ میں بڑے صاحب زادے قاسمؓ تھے اور چھوٹے حضرت عبداللہؓ تھے۔ پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا پھر حضرت عبداللہؓ نے بھی وفات پائی۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا کہ محمد (ﷺ) ابتر ہیں۔ ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے۔ جب وہ مر جائیں گے تو ان کا نام دنیا سے مٹ جائے گا اور ان سے تمہارا پیچھا چھوٹ جائے گا۔ ایسی ہی باتیں

ابوجہل، عقبہ بن ابی معیط وغیرہ سے بھی منقول ہیں۔ حضور ﷺ کا اپنا چچا، جس کا گھر بالکل آپ ﷺ کے گھر سے ملا ہوا تھا، دوڑتا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور ان کو یہ خوشخبری دی کہ آج رات محمد ﷺ کی جڑ کٹ گئی۔ قریش اس لیے آپ ﷺ سے بگڑے تھے کہ آپ ﷺ صرف اللہ ہی کی بندگی کرتے تھے اور ان کے شرک کو آپ ﷺ نے اعلانیہ رد کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے پوری قوم میں جو مرتبہ اور مقام آپ ﷺ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا وہ آپ ﷺ سے چھین لیا گیا تھا اور آپ ﷺ گویا برادری سے کاٹ کر پھینک دیئے گئے تھے۔ آپ ﷺ کے چند مٹھی بھر ساتھی سب بے یار و مددگار تھے۔ یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورۂ کوثر حضور ﷺ پر نازل کی گئی۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶، ص۴۸۹ تا ۴۹۰ سے ماخوذ)

اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی ﷺ ابتر آپ ﷺ نہیں ہیں بلکہ آپ ﷺ کے یہ دشمن ابتر ہیں۔ یہ قرآن کی اہم پیشینگوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی تھی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ اس وقت کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کیسے ابتر ہو جائیں گے۔ لیکن چند سالوں میں حالات بالکل پلٹ گئے اور وہ بالکل بے نام نشان ہو گئے۔ آج لاکھوں انسان آپ ﷺ ہی سے نہیں بلکہ آپ ﷺ کے ساتھیوں کے خاندانوں سے اپنی نسبت کو باعث عزت و شرف سمجھتے ہیں۔ کوئی سید ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی، ہاشمی، صدیقی، فاروقی، عثمانی، زبیری ہے تو کوئی انصاری ہے۔ مگر نام کو بھی کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ابتر حضور ﷺ نہیں بلکہ آپ ﷺ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶۔ ص۴۹۷ سے ماخوذ)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الکفرون (109)

آیت نمبر (1 تا 7)

ترجمہ

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾	لَاۤ اَعۡبُدُ	مَا	تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾	وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ
آپ کہہ دیجیے اے کافرو	میں بندگی نہیں کرتا	اس کی جس کی	تم لوگ بندگی کرتے ہو	اور نہ تم لوگ بندگی کرنے والے ہو

مَاۤ	اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾	وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ	مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ﴿۴﴾	وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ
اس کی جس کی	میں بندگی کرتا ہوں	اور نہ (ہی) میں بندگی کرنے والا ہوں	اس کی جس کی تم لوگوں نے بندگی کی	اور نہ تم لوگ بندگی کرنے والے ہو

مَاۤ اَعۡبُدُ ۬ؕ﴿۵﴾	لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ	وَلِیَ دِیۡنِ ﴿۶﴾
اس کی جس کی میں بندگی کرتا ہوں	تمہارے لیے تمہارا دین ہے	اور میرے لیے میرا دین ہے

نوٹ: 1

مکہ معظّمہ میں ایک دور ایسا گزرا ہے جب نبی ﷺ کی دعوت اسلام کے خالف قریش کے معاشرے میں مخالفت کا طوفان توبرپا ہو چکا تھا، لیکن ابھی قریش کے سردار اس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضور ﷺ کو کسی نہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ اس لیے وقتاً فوقتاً وہ آپ ﷺ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے تاکہ آپ ﷺ ان میں سے کسی کو مان لیں۔ اس سلسلہ میں متعدد روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفارِ قریش نے اِس قسم کی تجویزیں پیش کی تھیں۔ اور اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک ہی دفعہ دوٹوک جواب دے کر

ان کی اس اُمید کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ دین کے معاملہ میں کچھ دو اور کچھ لو کے طریقے پر ان سے کوئی مصالحت کر لیں گے۔

اس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مذہبی رواداری کی تلقین کے لیے نازل نہیں ہوئی تھی، جیسا کہ آج کل کے بعض لوگ خیال کرتے ہیں، بلکہ اس لیے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین، ان کی پوجا پاٹ اور ان کے معبودوں سے قطعی براءت کا اعلان کر دیا جائے۔ اور انہیں بتا دیا جائے کہ دین کفر اور دین اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ان کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اگرچہ ابتداءً قریش نے کفار کو مخاطب کر کے ان کی تجاویز مصالحت کے جواب میں کہی گئی تھی لیکن اسے قرآن مجید میں درج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لیے یہ تعلیم دے دی گئی ہے کہ دین کفر جہاں جس شکل میں بھی ہے مسلمانوں کو اس سے براءت کا اظہار کرنا چاہیے۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶۔ ص ۵۰۰۔۵۰۱ سے ماخوذ)

نوٹ: 2

آیت۔3۔ میں اور۔5۔ میں مَا اَعْبُدُ آیا ہے۔ عربی زبان میں ما کا لفظ عموماً بے جان یا بے عقل چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور ذی عقل ہستیوں کے لیے مَنْ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں مَنْ اَعْبُدُ کہنے کے بجائے مَا اَعْبُدُ کیوں کہا گیا۔ عام طور پر اس کے چار جواب مفسرین نے دیئے ہیں۔ یہ چاروں تاویلات اگرچہ ایک ایک لحاظ سے درست ہیں اور عربی زبان میں ان سب کی گنجائش ہے، لیکن ان میں سے کسی سے بھی وہ اصل مدعا واضح نہیں ہوتا جس کے لیے مَنْ اَعْبُدُ کہنے کے بجائے مَا اَعْبُدُ کہا گیا ہے۔

دراصل عربی زبان میں کسی شخص کے لیے جب مَن کا لفظ استعمال ہو تو اس سے مقصود اس کی ذات کے متعلق کچھ کہنا یا پوچھنا ہوتا ہے۔ اور جب مَا کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مقصود اس کی صفت کے بارے میں استفسار یا اظہار خیال ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اردو میں جب ہم کہتے ہیں یہ صاحب کون ہیں تو مقصد اس شخص کی ذات سے تعارف حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مگر جب ہم کہتے ہیں یہ صاحب کیا ہیں۔ تو اس سے معلوم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ وہ شخص کیا کرتا ہے یا اس کے پیشے میں اس کا مقام و منصب کیا ہے۔ مثلاً اگر وہ کسی درسگاہ سے تعلق رکھتا ہے تو کیا وہ لیکچرر ہے۔ پروفیسر ہے کس علم یا فن کا استاد ہے۔ کیا ڈگریاں رکھتا ہے وغیرہ۔ اگر آیت میں یہ کہا جاتا کہ لَا اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَنْ اَعْبُدُ تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ تم اس ہستی کی عبادت کرنے والے نہیں جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں مشرکین یہ کہہ سکتے تھے کہ اللہ کی ہستی کو تو ہم مانتے ہیں اور ہم اس کی بھی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ لَا اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن صفات کے معبود کی عبادت میں کرتا ہوں ان صفات کے معبود کی عبادت کرنے والے تم نہیں ہو اور یہی وہ اصل بات ہے جس کی بنا پر نبی ﷺ کا دین منکرین خدا (یعنی دہریوں) کے سوا تمام اقسام کے کفار کے دین سے قطعی طور پر الگ ہو جاتا ہے کیونکہ نبی ﷺ کا خدا ان سب کے خدا سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں سے کسی کا خدا چھ دن میں دنیا پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام کرنے والا ہے۔ حضرت یعقوب سے کشتی لڑتا ہے اور عُزَیر نامی ایک بیٹا رکھتا ہے۔ کسی کا خدا دوسرے کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو صلیب پر چڑھا دیتا ہے۔ کسی کا خدا بیوی بچے رکھتا ہے مگر اس کے ہاں صرف بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کسی کا خدا انسانی شکل میں روپ دھار کر زمین پر انسانوں کے لیے کام کرتا ہے وغیرہ۔ غرض خدا کو ماننے والے کفار بھی اس خدا کو نہیں مانتے جس کی صفات کی تعلیم قرآن دیتا ہے۔ ان صفات کے معبود کی عبادت محمد ﷺ اور ان کی پیروی کرنے والوں کے سوا دنیا میں کوئی بھی نہیں کر رہا ہے۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶، ص ۵۰۵۔۵۰۶ سے ماخوذ)

نوٹ:3

اس سورہ میں کافروں کی طرف سے پیش کی ہوئی مصالحت کی مختلف صورتوں کو بالکل رد کر کے اعلان براءت کیا گیا۔ 2050 سورۃ الانفال کی آیت ۔۶۱۔ میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ کفار اگر صلح کی طرف جھکیں تو آپ ﷺ بھی جھک جایئے یعنی صلح کر لیجئے اور مدینہ میں یہود سے آپ ﷺ کا معاہدۂ صلح مشہور و معروف ہے۔ اس ضمن میں صحیح بات یہ ہے کہ جس قسم کی مصالحت سے اس سورہ میں اعلان براءت کیا گیا وہ جیسے اُس وقت حرام تھی، آج بھی حرام ہے اور جس صورت کی اجازت سورۂ انفال میں آئی ہے اور میثاقِ مدینہ سے عملاً ظاہر ہوئی، وہ جیسے اس وقت جائز تھی آج بھی جائز ہے۔ بات صرف موقع و محل اور شرائط صلح کو دیکھنے اور سمجھنے کی ہے۔ اس کا فیصلہ خود رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے جس میں کفار سے معاہدہ کو جائز قرار دینے کے ساتھ ایک استثنا کا ارشاد ہے اِلاَّ صُلْحًا اَحَلَّ حَرَامًا اَوْ حَرَّمَ حَلَالًا۔ یعنی ہر صلح جائز ہے سوائے اس صلح کے جس کی رو سے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال یا حلال کی ہوی چیز کو حرام قرار دیا گیا ہو۔ (معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ النصر (110)

آیت نمبر (1 تا 3)

ترجمہ

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ	وَالۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾	وَرَاَیۡتَ النَّاسَ	یَدۡخُلُوۡنَ
جب آئے اللہ کی مدد	اور وہ فتح	اور آپ دیکھیں لوگوں کو	داخل ہوتے ہوئے

فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾	فَسَبِّحۡ	بِحَمۡدِ رَبِّکَ
اللہ کے دین میں گروہ در گروہ ہوتے ہوئے	تو آپ تسبیح کریں	اپنے رب کی حمد کے ساتھ

وَاسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ	اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾
اور آپ مغفرت مانگیں اس سے	بیشک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے

نوٹ:1

آیت ۔2۔ کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ زمانہ رخصت ہو جائے جب ایک ایک دو دو کر کے لوگ اسلام میں داخل ہوتے تھے اور وہ وقت آجائے جب پورے پورے قبیلے از خود مسلمان ہونے لگیں۔ آیت ۔3۔ کا مطلب ہے کہ اپنے رب کی قدرت کا یہ کرشمہ جب تم دیکھ لو تو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اس میں حمد کا مطلب یہ ہے کہ اس عظیم کامیابی کے متعلق تمہارے دل میں کبھی یہ خیال نہ آئے کہ یہ تمہارے اپنے کمال کا نتیجہ ہے۔ بلکہ اس کو سراسر اللہ کا فضل و کرم سمجھو۔ اس پر اس کا شکر ادا کرو اور دل و زبان سے اس کا اعتراف کرو۔ تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنے میں ایک پہلو تعجب کا بھی ہے۔ جب کوئی مُحیّر العقول واقعہ پیش آتا ہے تو آدمی سبحان اللہ کہتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ ہی کی قدرت سے ایسا حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا ہے ورنہ دنیا کی کسی طاقت کے بس میں یہ نہیں تھا۔

وَاسۡتَغۡفِرۡہُ کا مطلب ہے کہ اپنے رب سے دعا مانگو کہ جو خدمت اس نے تمہارے سپرد کی تھی اس کو انجام دینے میں جو بھول چوک کوتاہی ہوئی ہو، اس سے درگزر فرمائے۔ یہ ہے وہ ادب جو اسلام میں بندے کو سکھایا گیا ہے۔ کسی انسان سے اللہ کے دین کی کیسی بھی بڑی سے بڑی خدمت انجام پائی ہو اور اس کی عبادت و بندگی میں کتنی بھی محنت اس نے کی ہو، اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہ آنا چاہیے کہ میں نے

اپنے رب کا حق ادا کر دیا۔ بلکہ اسے ہمیشہ یہی سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نہیں کر سکا اور اسے دعا مانگنی چاہیے کہ مجھ سے جو بھی کوتاہی ہوئی ہے اس سے درگزر فرما کر میری حقیر سی خدمت قبول فرمائے۔ (تفہیم القران)۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ جب کوئی نماز پڑھتے تو یہ دعا کرتے تھے۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نزول کے بعد اٹھتے بیٹھتے اور آتے جاتے ہر وقت یہ دعا پڑھتے تھے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ (معارف القرآن)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ اللہب (111)

آیت نمبر (1 تا 5)

ترکیب

آیت۔1) تَبَّتْ واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اسی کا فاعل یَدَآ اِبِیْ لَهَبٍ ہے۔ مضاف ہونے کی وجہ سے نون تثنیہ گرا ہوا ہے۔ تَبَّ واحد مذکر غائب ہے۔ اس کا فاعل اس میں شامل هُوَ کی ضمیر ہے۔ افعال ماضی میں خبر دینے کا مفہوم بھی ہوتا ہے اور دعا مانگنے کا بھی۔ (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ 72، نوٹ۔2) اس آیت کے خبریہ اور دعائیہ، دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔ ہم دعائیہ کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔2) مَا اَغْنٰى مَا کو نافیہ بھی مانا جا سکتا ہے اور استفہامیہ بھی، دونوں ترجمے درست ہوں گے۔ ہم نافیہ کو ترجیح دیں گے۔ مَا كَسَبَ میں مَا موصولہ ہے آیت۔3) سَيَصْلٰى کا فاعل اس میں شامل هُوَ کی ضمیر ہے۔ (آیت۔4) وَامْرَاَتُهٗ کی رفع بتا رہی ہے کہ یہ سَيَصْلٰى کا فاعل ثانی ہے۔ اس کا حال ہونے کی وجہ سے حَمَّالَةَ حالتِ نصب میں ہے۔

ترجمہ

تَبَّتْ	يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ	وَّتَبَّ ۝۱	مَآ اَغْنٰى عَنْهُ	مَالُهٗ
تباہ ہوں	ابولہب کے دونوں ہاتھ	اور وہ (بھی) تباہ ہو	کام نہ آئے اس کے	اس کا مال

وَمَا	كَسَبَ ۝۲	سَيَصْلٰى نَارًا	ذَاتَ لَهَبٍ ۝۳
اور وہ جو	اس نے کمایا	وہ گرے گا ایک ایسی آگ میں جو	شعلے والی ہے

وَّامْرَاَتُهٗ ۝۴	حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝۴
اور اس کی عورت (بھی)	بہت ہی اٹھانے (لیے پھرنے) والی ہوتے ہوئے لگا بجھائی کو

فِیْ جِيْدِهَا	حَبْلٌ	مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵
اس کی گردن میں	ایک ایسی رسی ہے جو	کھجور کے ریشے سے (بٹی) ہے

نوٹ: 1

قرآن مجید میں یہ ایک ہی مقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ہے حالانکہ مکہ میں بھی اور مدینہ میں بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسلام اور محمد ﷺ کی عداوت میں ابولہب سے کس طرح کم نہ تھے۔ سوال یہ

ہے کہ اس شخص کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی۔ وجہ یہ ہے کہ عربی معاشرے کی اخلاقی قدروں میں صلۂ رحمی کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور قطعی رحمی کو بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ عرب کی انہی روایات کا یہ اثر تھا کہ قریش کے دوسرے خاندانوں اور ان کے سرداروں نے تو حضور ﷺ کی شدید مخالفت کی مگر بنو ہاشم نے نہ صرف آپ ﷺ کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہ آپ ﷺ کی حمایت کرتے رہے، حالانکہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے تھے۔ قریش کے دوسرے خاندان اس حمایت کو عرب کی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کبھی بنو ہاشم کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ تم اپنے آبائی دین سے منحرف ہو گئے ہو۔ اس اخلاقی اصول کو صرف ایک شخص نے توڑ ڈالا۔ اور وہ تھا ابولہب جو آپ ﷺ کا سگا چچا تھا۔ یہاں تک کہ نبوت کے ساتویں سال جب قریش نے بنو ہاشم کا معاشرتی اور معاشی مقاطعہ کیا اور بنو ہاشم کے تمام خاندانوں نے رسول اللہ ﷺ کی حمایت پر ثابت قدم رہتے ہوئے شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے تو تنہا یہی ابولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کے بجائے قریش کا ساتھ دیا۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶، ص ۵۲۰ تا ۵۲۵ سے ماخوذ۔ اس کے باقی جرائم کی تفصیل ان ہی صفات میں دیکھی جا سکتی ہے)۔

نوٹ: 2

جب رسول اللہ ﷺ پر آیت وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر قبیلہ قریش کے لوگوں کو آواز دی تو لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ دشمن صبح شام میں تم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے تو کیا تم لوگ میری تصدیق کرو گے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا ہاں ضرور تصدیق کریں گے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں ڈراتا ہوں ایک عذاب شدید سے۔ یہ سن کر ابولہب نے کہا تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا۔ اس آیت۔ ۱۔ میں پہلا جملہ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ بطور بددعا کے ہے یعنی ابولہب ہلاک ہو جائے۔ اور دوسرا جملہ وَ تَبَّ خبر یہ ہے۔ گویا بددعا کے ساتھ اس کا اثر بھی بتا دیا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ بددعا کا جملہ مسلمانوں کے شفاء غیظ کے لیے ارشاد فرمایا گیا کیونکہ جب ابولہب نے آپ ﷺ کی شان میں تَبًّا کہا تو مسلمانوں کے دل کی خواہش تھی کہ وہ اس کے لیے بددعا کریں۔ حق تعالیٰ نے گویا ان کے دل کی بات خود فرما دی۔ (معارف القرآن)۔

یہاں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے کہ ایک فعل کو دعائیہ اور دوسرے کو خبر یہ مانا جائے۔ اس لیے منطقی تقاضا یہ ہے کہ تَبَّتْ، تَبَّ، اور مَا اَغْنٰی تینوں افعال کو یا تو دعائیہ مانا جائے یا خبر یہ۔ ہم نے دعائیہ کو ترجیح دی ہے کیونکہ یہ اس وقت کے اہل ایمان کے دل کی آواز تھی۔ اور جہاں تک دعا کے پورا ہونے کا مسئلہ ہے تو اس وقت بھی آج بھی ہر اہل ایمان کا ایمان ہے کہ اللہ کا فرمان اٹل ہے۔ اس لیے خبر دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ (مرتب)۔

نوٹ: 3

کَسَبَ کے معنی ہیں کمانا۔ یعنی وقت، محنت اور اپنے وسائل خرچ کر کے کوئی چیز حاصل کرنا۔ ظاہر ہے اس میں وہ مال بھی آتا ہے جو انسان کماتا ہے، معاشرے میں وہ مقام و مرتبہ بھی جو وہ کوشش کر کے اپنے لیے بناتا ہے، وہ انصار و اعوان بھی جو وہ اپنے تعلقات کے ذریعہ بناتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق آدمی کا بیٹا بھی اس کا کسب ہے۔ یہاں آیت۔ ۲۔ میں مال کا ذکر پہلے آ چکا ہے اس لیے وَمَا کَسَبَ میں مال کے علاوہ باقی دوسری کمائیاں مراد ہیں جس میں بیٹے بھی شامل ہیں۔ ابولہب کے انجام سے یہ سب معانی مناسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ بدر کی شکست کے سات روز بعد اس کو طاعون کی گلٹی نکلی جس کو عرب میں عَدَسَہ کہتے ہیں اور جو چھوت کی بیماری ہے۔ اس لیے سب گھر والوں نے اس کو الگ ڈال دیا اور اسی بے کسی کی حالت میں وہ مر گیا۔ تین روز تک لاش پڑی رہی۔ جب سڑنے لگا تو بیٹوں نے مزدوروں سے اٹھوا کر مٹی میں دبوا دیا۔ اس وقت مال، اولاد، تعلقات، کچھ بھی اس کے کام نہ آیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

2050

سورۃ الاخلاص (112)

آیت نمبر (1 تا 4)

ص	م	د

(ن۔ض) صَمْدًا حاجت روائی کے لیے کسی کا قصد کرنا۔ رجوع کرنا۔
صَمَدٌ ایسی ہستی جس کی طرف حاجت روائی کے لیے رجوع کیا جائے اور جس کو کسی سے بھی رجوع کرنے کی ضرورت نہ ہو، بے نیاز۔ ﴿اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ﴾ (112/الاخلاص:2) ''اللہ قطعی بے نیاز ہے۔''

ك	ف	ء

(ف) كَفْأً لوٹنا۔ اعتدال سے متجاوز ہونا۔
(مفاعلہ) مُكَافَئَةً برابری کرنا۔ ہم پلہ ہونے کی کوشش کرنا۔
كُفُوًا برابری والا۔ ہم پلہ۔ مماثل۔ آیت۔ 112/البقرۃ:4۔

ترکیب

(آیت۔1) اس کی مختلف ترکیبیں کی گئی ہیں۔ ہماری ترجیح یہ ہے کہ هُوَ ضمیر الشان ہے۔ اَللّٰہُ مبتدا اور اَحَدٌ اس کی خبر ہے۔ (آیت۔2) اَللّٰہُ مبتدا اور اَلصَّمَدُ اس کی خبر معرفہ ہے۔ اس پر جو الف لام ہے اس کو اگر لام تعریف مانیں تو بین السطور مطلب یہ ہوگا کہ متعدد ہستیاں صمد ہیں اور یہاں کسی مخصوص صمد کی بات ہو رہی ہے یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس پر لام جنس ہے۔ (آیت۔4) لَمْ يَكُنْ کا اسم اَحَدٌ ہے اس لیے یہ حالت رفع میں ہے۔ اور يَكُنْ کی خبر ہونے کی وجہ سے كُفُوًا حالت نصب میں ہے۔ سادہ جملہ یوں ہوسکتا ہے وَلَمْ يَكُنْ اَحَدٌ كُفُوًا لَّهٗ۔

ترجمہ

قُلْ	هُوَ	اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ①	اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ②	لَمْ يَلِدْ ۙ
آپؐ کہیے	حقیقت بس یہ ہے کہ	اللہ یکتا ہے	اللہ ہی قطعی بے نیاز ہے	اس نے جنا ہی نہیں

وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ②	وَلَمْ يَكُنْ	لَّهٗ كُفُوًا	اَحَدٌ ۚ④
اور نہ ہی وہ جنا گیا	اور ہوا ہی نہیں	اس کا مماثل (اس کے جیسا)	کوئی ایک بھی

نوٹ: 1

قرآن مجید کی دوسری سورتوں میں بالعموم کسی ایسے لفظ کو ان کا نام قرار دیا گیا ہے جو ان میں وارد ہوا ہو۔ لیکن اس سورہ میں لفظ اخلاص کہیں وارد نہیں ہوا۔ اس کو یہ نام اس کے معنی کے لحاظ سے دیا گیا ہے جو شخص بھی اس کو سمجھ کر اس کی تعلیم پر ایمان لے آئے گا وہ شرک سے خلاصی پا جائے گا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم توحید کی دعوت لے کر اٹھے تھے اس وقت دنیا کے مذہبی تصورات کیا تھے۔ (اس کا ایک ہلکا سا جائزہ سورۂ کافرون کے نوٹ۔2۔ کے آخر میں دیا ہوا ہے۔ مرتب) اس حالت میں جب اللہ وحدہٗ لاشریک کو ماننے کی دعوت دی گئی تو لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا لازمی تھا کہ وہ رب آخر کس قسم کا ہے کہ تمام معبودوں کو چھوڑ کر تنہا ایک ہی رب اور معبود ماننے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے ان سوالات کا جواب چند الفاظ میں دے کر اللہ کی ہستی کا ایسا واضح

تصور پیش کر دیا جو تمام مشرکانہ تصورات کا قلع قمع کر دیتا ہے اور اس کی ذات کے ساتھ مخلوقات کی صفات میں سے کسی صفت کی آلودگی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نگاہ میں اس سورت کی بڑی عظمت تھی اور آپ ﷺ مسلمانوں کو اس کی اہمیت محسوس کراتے تھے تاکہ وہ کثرت سے اس کو پڑھیں اور لوگوں میں اسے پھیلائیں۔ احادیث میں کثرت سے یہ روایات بیان ہوئی ہیں کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو بتایا کہ یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ مفسرین نے اس ارشاد کی بہت سی توجیہات بیان کی ہیں۔ ہمارے نزدیک سیدھی بات یہ ہے کہ قرآن جس دین کو پیش کرتا ہے اس کی بنیاد تین عقیدے ہیں۔ توحید، رسالت اور آخرت۔ یہ سورہ چونکہ خالص توحید کو بیان کرتی ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس کو ایک تہائی قرآن کے برابر قرار دیا۔ (تفہیم القرآن۔ ج6۔ص530 تا533 سے ماخوذ)

نوٹ:2 ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے اس سورہ سے بڑی محبت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی محبت نے تمہیں جنت میں داخل کر دیا۔ ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص صبح اور شام قل ھو اللہ احد اور مُعَوِّذَتَیْنِ (یعنی سورہ فلق اور سورہ الناس) پڑھ لیا کرے تو یہ اس کو ہر بلا سے بچانے کے لیے کافی ہے۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم کو ایسی تین سورتیں بتاتا ہوں کہ جو تورات، انجیل، زبور اور قرآن، سب میں نازل ہوئی ہیں۔ اور فرمایا کہ رات کو اس وقت تک مت سوؤ جب تک ان تین کو نہ پڑھ لو۔ (یعنی مُعَوِّذَتَیْنِ اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ) (معارف القرآن)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورۃ الفلق (113)

آیت نمبر (1 تا 5)

و ق ب

(ض) وَقْبًا آنا۔ جیسے چاند کا گہن میں آنا۔ تاریکی پھیلنا۔ آیت۔ 113 / الفلق:3۔

ن ف ث

(ن۔ض) نَفْثًا منہ سے تھوڑا سا تھوک نکالنا یا تھوتھو کرنا۔ جادو کے گنڈوں پر پھونک مارنا۔

نَفَّاثٌ مؤنث نَفَّاثَۃٌ۔ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بار بار یا کثرت سے پھونک مارنے والا۔ آیت۔ 113 / الفلق:4۔

ترجمہ

قُلْ اَعُوْذُ	بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ﴿۱﴾	مِنْ شَرِّ مَا	خَلَقَ ۙ﴿۲﴾
آپؐ کہیے میں پناہ میں آتا ہوں	صبح کے مالک کی	اس کے شر سے جو	اس نے پیدا کیا

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ	اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾	وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ
اور اندھیرا کرنے والے (یعنی رات) کے شر سے	جب وہ چھا جائے	اور پھونک مارنے والیوں کے شر سے

فِي الْعُقَدِ ۙ﴿۴﴾	وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ	اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾ ع
گرہوں میں	اور حسد کرنے والے کے شر سے	جب وہ حسد کرے

2050

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الناس (114)

آیت نمبر (1 تا 6)

ترکیب

اَلْوَسْوَاسِ اور اَلْخَنَّاسِ دونوں اسم المبالغہ ہیں جو ایک طرح سے اسم الصّفہ ہوتے ہیں۔ (دیکھیں آسان عربی گرامر، حصہ سوم پیرا گراف: 60:1۔ اس لیے اَلْخَنَّاسِ کو مضاف الیہ اَلْوَسْوَاسِ کی صفت ماننے کی گنجائش نہیں ہے اور اَلْخَنَّاسِ کو شَرِّ کا مضاف الیہ ثانی مانا جائے گا۔ اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ کا موصوف یہاں محذوف ہے۔ آگے آیات۔ 4۔5۔ میں اسی محذوف موصوف کی وضاحت ہے۔

ترجمہ

قُلْ اَعُوْذُ	بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾	مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾
آپؐ کہیے میں پناہ میں آتا ہوں	انسانوں کے پروردگار کی	انسانوں کے بادشاہ کی

اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾	مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ﴿۴﴾ ۙ
انسانوں کے حاجت روا، مشکل کشا، پناہ دہندہ کی	بار بار وسوسہ اندازی کرنے والے بار بار دبک جانے والے کے شر سے

الَّذِيْ يُوَسْوِسُ	فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾	مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿۶﴾ ع
وہ جو وسوسہ اندازی کرتا ہے	انسانوں کے دلوں میں	جو جنوں اور انسانوں میں سے ہوتا ہے

نوٹ: 1

سورہ فلق اور سورۂ ناس، یہ دونوں سورتیں ایک ساتھ، ایک ہی واقعہ میں نازل ہوئیں۔ ابن قیمؒ نے ان دونوں سورتوں کی تفسیر یکجا لکھی ہے۔ اس میں فرمایا کہ ان دونوں سورتوں کے منافع اور برکات سے سب لوگوں کی ضرورت ایسی ہے کہ کوئی انسان ان سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ ان کو سحر، نظر بد اور تمام جسمانی اور روحانی آفات دور کرنے میں تاثیر عظیم حاصل ہے۔ اس کا واقعہ اس طرح ہے کہ نبی کریم ﷺ پر ایک یہودی نے جادو کر دیا تھا جس کے اثر سے آپ ﷺ بیمار ہو گئے تھے۔ جبرئیلؑ نے آکر آپ ﷺ کو اطلاع دی کہ آپ ﷺ پر ایک یہودی نے جادو کیا ہے اور جس چیز پر عمل کیا گیا ہے وہ فلاں کنویں میں ہے۔ آپ ﷺ نے وہاں آدمی بھیجے جو وہ چیز کنویں میں سے نکال لائے۔ اس میں گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے ان گرہوں کو کھول کو دیا اور آپ ﷺ تندرست ہو گئے۔ جبرئیلؑ نے آپ ﷺ کو اس یہودی کا نام بتا دیا تھا اور آپ ﷺ اس کو جانتے تھے۔ مگر اپنے نفس کے معاملہ میں کسی سے انتقام لیں آپ ﷺ کی عادت نہیں تھی، اس لیے آپ ﷺ نے اس یہودی سے عمر بھر کچھ نہ کہا۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 2

جو لوگ سحر (جادو) کی حقیقت سے ناواقف ہیں ان کو تعجب ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جادو کا اثر کیسے ہوسکتا ہے۔ سحر کی حقیقت اور اس کے اقسام و احکام پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں جلد اول صفحہ 217 تا 223 میں بیان کیے جا چکے ہیں،

وہاں دیکھ لیے جائیں۔ یہاں اس کا جو خلاصہ جاننا ضروری ہے وہ اتنا ہے کہ سحر کا اثر بھی طبعی اسباب کا اثر ہوتا ہے۔ جیسے آگ سے جلنا یا گرم ہونا، پانی سے سرد ہونا، کسی سبب سے بخار آجانا یا کسی مرض کا پیدا ہو جانا وغیرہ۔ یہ سب امر طبعی ہیں جن سے انبیاء مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ اسی طرح جادو کا اثر بھی اسی قسم سے ہے اس لیے بعید نہیں۔ (معارف القرآن)

اس جادو کے واقعہ میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے ہے جو آپ ﷺ کے منصب نبوت میں قادح (عیب لگانے والی) ہو۔ ذاتی حیثیت سے اگر آپ ﷺ کو زخمی کیا جا سکتا ہے، اگر آپ ﷺ کو گھوڑے سے گر کو چوٹ لگ سکتی ہے، اگر آپ ﷺ کو بچھو کاٹ سکتا ہے، اور ان میں سے کوئی چیز بھی اس تحفظ کے منافی نہیں ہے جس کا نبوی ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا تھا، تو آپ ﷺ اپنی ذاتی حیثیت میں جادو کے اثر سے بیمار بھی ہو سکتے تھے۔ نبی۔ پر جادو کا اثر ہونا تو قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ فرعون کے جادوگروں نے جو لاٹھیاں اور رسیاں پھینکی تھیں ان کے متعلق عام لوگوں نے ہی نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی سمجھا کہ وہ ان کی طرف سانپوں کی طرح دوڑی چلی آرہی ہیں۔ اور اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام خوفزدہ ہو گئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی کہ خوف نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے۔ اب رہا یہ اعتراض کہ اس طرح تو کفار مکہ کے اس الزام کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ نبی ﷺ کو وہ سحر زدہ آدمی کہتے تھے۔ لیکن یہ اعتراض درست نہیں ہے کیونکہ کفار آپ ﷺ کو سحر زدہ آدمی اس معنی میں نہیں کہتے تھے کہ آپ ﷺ جادو کے اثر سے بیمار ہو گئے ہیں، بلکہ اس معنی میں کہتے تھے کہ کسی جادوگر نے معاذ اللہ آپ کو پاگل کر دیا ہے اور اسی پاگل پن میں آپ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں۔ اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ کفار کا یہ الزام ایسے واقعہ پر سرے سے چسپا ہی نہیں ہوتا جس کے متعلق تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ جادو کا اثر صرف ذاتِ محمد (ﷺ) پر ہوا تھا، نبوت محمد (ﷺ) اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔ (تفہیم القرآن، ج۶، ص۵۵۵۔۵۵۶)

نوٹ: 3

ان سورتوں کے معاملہ میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جھاڑ پھونک کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے اور یہ کہ جھاڑ پھونک مؤثر بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ بکثرت احادیث میں یہ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر رات کو سوتے وقت موذتین (یعنی سورۂ فلق اور سورۂ ناس) یا بعض روایت کے مطابق معوذات (یعنی سورۂ اخلاص اور معوذتین) تین مرتبہ پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونکتے اور پورے جسم پر ہاتھ پھیر لیتے۔

اس معاملہ میں شرعی مسئلہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے ایک طویل حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے وہ لوگ بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے جو نہ داغنے کا علاج کراتے ہیں نہ جھاڑ پھونک کراتے ہیں، نہ فال لیتے ہیں بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے داغنے سے علاج کرایا اور جھاڑ پھونک کرائی، وہ اللہ پر توکل سے بے تعلق ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے جن میں سے ایک جھاڑ پھونک بھی ہے سوائے معوذتین یا معوذات کے۔ بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں حضور ﷺ نے جھاڑ پھونک سے بالکل منع فرما دیا تھا پھر بعد میں اس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے دی کہ اس میں شرک نہ ہو، اللہ کے پاک ناموں یا اس کے کلام سے جھاڑا جائے۔ کلام ایسا ہو جو سمجھ میں آئے اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس میں کوئی گناہ کی چیز نہیں ہے۔ بھروسہ جھاڑ پھونک پر نہ کیا جائے کہ وہ شفا دینے والی ہے بلکہ اللہ پر بھروسہ کیا جائے کہ وہ چاہے گا تو اسے نافع بنا دے گا۔

2050

ایک مرتبہ نبی ﷺ بیمار ہوئے تو جبرئیلؑ نے آکر پوچھا کہ کیا آپ ﷺ بیمار ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ جبرئیلؑ نے کہا:

بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ	مِنْ كُلِّ شَيْءٍ	يُؤْذِيْكَ	مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ
اللہ کے نام سے میں جھاڑتا ہوں آپ کو	تمام ایسی چیز سے جو	اذیت دے آپ کو	ہر ایک نفس کے شر سے

اَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ	اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ	بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ
یا حسد کرنے والے کی آنکھ (کے شر) سے	اللہ شفا دے آپ کو	اللہ کے نام سے میں جھاڑتا ہوں آپ کو

اس کے علاوہ متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے زہریلے جانوروں کے کاٹے، ذباب کے مرض اور نظر بد کے جھاڑنے کی اجازت دی۔ جبکہ دوا سے علاج کرنے کی آپ ﷺ نے تاکید کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے اور تم لوگ دوا کیا کرو۔ آپ ﷺ نے خود بھی لوگوں کو بعض امراض کے علاج بتائے جیسا کہ احادیث میں باب الطب کو دیکھنے سے معلوم ہو سکا ہے۔ لیکن دوا بھی اللہ ہی کے حکم اور اذن سے نافع ہوتی ہے۔ اب اگر دوا سے علاج کرنے کے ساتھ اللہ کے کلام اور اس کے اسماء حسنیٰ سے بھی استفادہ کیا جائے تو یہ بات مادہ پرستوں کے سوا کسی کی عقل کے بھی خلاف نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح نہیں ہے۔ کہ دوا سے علاج کو چھوڑ دیا جائے اور صرف جھاڑ پھونک سے ہی کام لینے پر اکتفا کیا جائے۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶۔ ص: ۵۷۷ تا ۵۶۰ سے ماخوذ)

نوٹ: 4

سورۂ فلق کی آیت۔ ۲۔ میں یہ بات قابل غور ہے کہ شر کو پیدا کرنے کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی گئی بلکہ مخلوقات کی پیدائش کی نسبت اللہ کی طرف اور شر کی نسبت مخلوقات کی طرف کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو شر کے لیے نہیں پیدا کیا ہے۔ اس کا ہر کام خیر اور کسی مصلحت ہی کے لیے ہوتا ہے۔ البتہ مخلوقات کے اندر جو اوصاف اس نے اس لیے پیدا کیے ہیں کہ ان کی تخلیق کی مصلحت پوری ہو، ان سے بعض اوقات اور بعض اقسام کی مخلوقات سے اکثر شر رونما ہوتا ہے۔

نوٹ: 5

قرآن مجید کے آغاز اور اس کے اختتام میں جو مناسبت ہے وہ بھی ذہن میں واضح ہونی چاہیے۔ قران کریم کو حق تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ سے شروع فرمایا ہے جس کا خلاصہ حق تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد اس کی مدد حاصل کرنا اور اس سے صراطِ مستقیم کی توفیق مانگنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور صراطِ مستقیم یہی دو چیزیں ہیں جن میں انسان کی دنیا و دین کے سب مقاصد کی کامیابی مضمر ہے۔ لیکن ان دونوں چیزوں کے حصول میں اور حصول کے بعد ان کے استعمال میں ہر قدم پر شیاطین جن وانس کے مکر وفریب اور وسوسوں کا جال بچھا رہتا ہے۔ اس لیے اس جال کو پاش پاش کرنے کی موثر تدابیر استعاذہ پر قرآن کو ختم کیا گیا۔ (معارف القرآن)۔

دُعَاءُ خَتْمِ الْقُرْاٰنِ

اَللّٰهُمَّ اٰنِسْ	وَحْشَتَنَا	فِيْ قُبُوْرِنَا	اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا	بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ
اے اللہ تو مانوس کر دے	ہماری وحشت کو	ہماری قبروں میں	اے اللہ تو رحم کر ہم پر	اس عظیم قرآن (کی برکت) کے سبب سے

وَاجْعَلْهُ لَنَا	اِمَامًا وَّنُوْرًا	وَّهُدًى وَّرَحْمَةً	اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا
اور تو بنا دے اس کو ہمارے لیے	پیشوا اور روشنی	اور رہنمائی اور رحمت (کا ذریعہ)	اے اللہ تو یاد دلا دے ہم کو

مِنْهُمَا	نَسِيْنَا	وَعَلِّمْنَا	مِنْهُ مَا	جَهِلْنَا
اس میں سے وہ جو	ہم بھول جائیں	اور تو علم دے ہم کو	اس میں سے اس کا جس سے	ہم ناواقف رہیں

وَارْزُقْنَا	تِلَاوَتَهٗ	اٰنَاءَ الَّيْلِ	وَاٰنَاءَ النَّهَارِ
اور تو عطا کر ہم کو	اس کی تلاوت (کی توفیق)	رات کے وقتوں میں	اور دن کے وقتوں میں

وَاجْعَلْهُ لَنَا	حُجَّةً	يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ
اور تو بنا دے اس کو ہمارے لیے	ایک حجت	اے تمام جہانوں کے پالنہار

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ	اَوَّلًا وَّاٰخِرًا	وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا	رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا
اور اللہ ہی کے لیے تمام شکر و سپاس ہے	اوّل و آخر میں	اور ظاہر و باطن میں	اے ہمارے رب تو مواخذہ نہ کرنا ہمارا

اِنْ نَّسِيْنَا	اَوْ اَخْطَاْنَا	رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا	اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ
اگر ہم بھول گئے (کچھ)	یا ہم چوک گئے (کہیں)	اے ہمارے رب تو قبول کر لے ہم سے (یہ ختم قرآن)	بیشک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔

السلام وعلیکم رحمۃ اللہ وبرکاۃ

اللہ تعالیٰ ہم سب کی یہ سعی قبول فرمائے اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بنائے۔ جس جس نے بھی اس کار خیر میں مال، جان اور صلاحیتوں کو لگایا اللہ قبول و منظور فرمائے

انجمن خدام القرآن فیصل آباد میں اس کے فوٹو کاپی بھی دستیاب ہیں اور محترم ڈاکٹر جہاں زیب صاحب

کے اس کتاب میں اضافہ جات کے ساتھ مطالعہ قرآن حکیم کے نام سے دستیاب ہیں

رابطہ کے لئے:info@khuddam-ul-quran.com,www.khuddam-ul-quran.com

0412437781,0412437618,03217805614

قرآن اکیڈمی سعید کالونی نمبر 2 کینال روڈ فیصل آباد

2050

2050

2050

2050

2050

2050

2050

2050

2050

2050

2050

2050

انڈیکس برائے لغت (حصہ دوم)

4

پ

مادہ	آیت نمبر
ء	
ء ب ب	80/عبس:31
ع ص د	90/البلد:20
ب	
ب ت ر	108/الکوثر:3
ب ت ل	73/مزمل:8
ب س ر	74/مدثر:22
ب ع ث ر	82/الانفطار:4
ث	
ث ج ج	78/النبا:14
ج	
ج م م	89/الفجر:19
ح	
ح ر د	68/القلم:25
ح ر س	74/المدثر:8
ح ر ك	75/القیامۃ:16
ح ر ی	72/:14
ح س م	69/الحاقۃ:7
ح ص ل	100/العدیات:10
ح ض ض	69/الحاقۃ:34
ح ط ب	72/الجن:15
خ	
خ ن س	81/التکویر:15
د	
د ث ر	74/المدثر:1
د ح ی	79/النزیات:30

مادہ	آیت نمبر
د ح ق	78/النبا:34
ر	
ر ی ن	83/المطففین:14
ز	
ز ب ن	96/العلق:18
ز م ل	73/المزمل:1
س	
س ج و	93/الضحیٰ:2
س ط ہ	88/الغاشیۃ:20
س غ ب	90/البلد:14
س ف ع	96/العلق:15
س م ك	79/النزیات:28
س ہ ر	79/النزیات:14
ش	
ش ف ھ	90/البلد:9
ش م خ	77/المرسلت:27
ص	
ص خ خ	80/عبس:33
ص ر ع	69/الحاقۃ:7
ص ر م	68/القلم:17
ص م د	112/الاخلاص:2
ض	
ض ب ح	100/العدیات:1

مادہ	آیت نمبر
ض ن ن	81/التکویر:24
ط	
ط ب ق	67/الملک:3
ط خ ی	91/الشمس:6
ط ف ف	83/المطففین:1
ط م م	79/النزیات:34
ع	
ع ب س	74/المدثر:22
ع ز و	70/المعارج:37
ع ہ ن	70/المعارج:9
غ	
غ د ق	72/الجن:16
غ ص ص	73/مزمل:13
غ ط ش	79/النزیات:29
ق	
ق د ح	100/العدیات:2
ق ر ع	13/الرعد:31
ق ض ب	80/عبس:28
ق ط ف	69/الحاقۃ:31
ک	
ک ب د	90/البلد:4

مادہ	آیت نمبر
ک ث ب	73/مزمل:14
ک د ح	84/الانشقاق:6
ک د ر	81/التکویر:2
ک ش ط	81/التکویر:11
ک ف ت	77/المرسلات:25
ک ن د	100/العدیات:6
ک ن س	81/التکویر:16

ل

ل ب د	72/الجن:19
ل ظ ی	70/المعارج:15
ل ھ ب	77/المرسلات:31
ل ھ م	91/الشّمس:8

م

م ز ج	76/الدھر:5
م ش ج	76/الدھر:2
م ط ی	75/القیامۃ:33

ن

ن ج د	90/البلد:10
ن ح ر	108/التکویر:2
ن خ ر	79/النزیات:11
ن ط ش	79/النزیات:2
ن ض ر	75/القیامۃ:22
ن ف ث	113/الفلق:4
ن ق ع	100/العدیات:4

و

و ء د	81/التکویر:8
و ت ن	69/الحاقۃ:46
و ح ش	81/التکویر:5
و س ق	84/الانشقاق:17
و ف ض	70/المعارج:43
و ق ب	113/الفلق:3
و ھ ج	78/النبا:13
و ھ ی	69/الحاقۃ:17

ھ

ھ ر ب	72/الجن:12
ھ ز ل	86/الطارق:14
ھ ل ع	70/المعارج:19
ھ ی ل	73/المزمل:14

انڈیکس برائے قواعد و موضوعات (حصہ دوم) 4

قواعد و موضوعات	حوالہ
ع	
1۔ اَحَدٌ میں جمع کا مفہوم	69/الحاقۃ:47،ترکیب
2۔ آخرت پر یقین کا اثر	83/المطففین:4،نوٹ۔3
3۔ آخرت کے مضامین میں تکرار کی وجہ	78/النبا:2،نوٹ۔2
4۔ استغفار کی برکات	71/نوح:10،نوٹ۔4
5۔استفہام کے مفاہیم	76/الدھر:1،نوٹ۔1
6۔اصحاب الاخدود کا قصہ	85/البروج:4،نوٹ۔2
7۔اصلاح کی کوشش کا ہدف	80/عبس:1،نوٹ۔1
8۔الہام فطری کی وضاحت	91/الشمس:8،نوٹ۔2
9۔ انسانی اختیارات اور مشیت الٰہی کا تعلق	76/الدھر:29،نوٹ۔3
10۔انگلیوں کے پور کی اہمیت	75/القیامۃ:4،نوٹ۔3
11۔اونٹ کی خصوصیت	88/الغاشیۃ:17،نوٹ۔2
12۔اہل کتاب اور مشرک کا فرق	97/القدر:1،نوٹ۔2
13۔ایک دن پچاس ہزار کے برابر ہونے کا مفہوم	70/المعارج:4،نوٹ۔1
ب	
1۔بت پرستی کی ابتداء	71/نوح:23،نوٹ۔2
ت	
1۔تائے تانیث اور بائے سکت کا فرق	69/الحاقۃ:19،نوٹ۔2 ترکیب
2۔تخلیق انسانی کا ماخذ اور مراحل	76/الدھر:2،نوٹ۔2
3۔ترتیل کا مطلب	73/المزمل:4،نوٹ۔1
4۔ تقدیر کی وضاحت	80/عبس:19،نوٹ۔3۔4

قواعد و موضوعات	حوالہ
ث	
1۔ثَمَّ کا استعمال	81/التکویر:21،نوٹ۔2
ج	
1۔جذباتی بلوغت کا حصول	70/المعارج:19،نوٹ۔2
2۔ جنتی کی سب سے بڑی نعمت	98/البینۃ:8،نوٹ۔2
3۔ جنات کی حقیقت	72/الجن:1،نوٹ۔1
4۔جھاڑ پھونک کی شرعی حیثیت	113/الفلق:4،نوٹ۔3
ح	
1۔حکمت تبلیغ کی تعلیم	79/النزیات:18،نوٹ۔2
2۔حیات بعد الموت کی دلیل	84/الانشقاق:16،نوٹ۔1
خ	
1۔خشیت کا مفہوم	98/البینۃ:8،نوٹ۔3
د	
1۔دوزخی اور جنتی کی علامات	79/النزیات:31،نوٹ۔3
ر	
1۔راہ نجات کے تقاضے	103/العصر:3،نوٹ۔2
2۔رسول اللہ ﷺ پر جادو کا اثر ہونا	113/الفلق:4،نوٹ۔2
3۔ رسول اللہ ﷺ کے ضالاً ہونے کا مطلب	93/الضحیٰ:7،نوٹ۔7
س	
1۔سجدے میں دعا مانگنے کا مسئلہ	95/التین:19،نوٹ۔3

قواعد وموضوعات	حوالہ
2۔ سمندر میں آگ کیسے لگے گی	81/التکویر:6،نوٹ۔4
3۔ سورۃ فیل کا تاریخی پس منظر	105/الفیل:1،نوٹ۔1
4۔ سورۃ مزمل کے آخری رکوع کا زمانہ نزول	73/المزمل:20،نوٹ۔1
5۔ سورۃ ملک کی فضیلت	67/الملک:1،نوٹ۔1
ص	
1۔ صحف ابراہیم وموسیٰ کی وضاحت	87/الاعلیٰ:19،نوٹ۔5
ع	
1۔ عَذَابًا صَعَدًا کا مفہوم	72/الجن:17،نوٹ۔3
2۔ علم الیقین اور عین الیقین کا فرق	102/التکاثر:5،نوٹ۔2
3۔ عمر میں کمی بیشی ہونا	71/نوح:4،نوٹ۔3
غ	
1۔ غلط کاروں کو ڈھیل دینے کی حکمت	86/الطارق:17،نوٹ۔3
ف	
1۔ فرعون خدائی کا دعویدار نہیں تھا	79/النزیات:24،نوٹ۔4
ق	
1۔ قتل اولاد اور فیملی پلاننگ	81/التکویر:8،نوٹ۔5
2۔ قرب الٰہی کی منزلیں	76/الدھر:21،نوٹ۔3
3۔ قریش کا تاریخی پس منظر	106/قریش:1،نوٹ۔2
4۔ قیامت کی عقلی دلیل	68/القلم:35،نوٹ۔1
ک	
1۔ کفار سے معاہدہ کی مشروط اجازت	109/الکفرون:6،نوٹ۔3

قواعد وموضوعات	حوالہ
گ	
1۔ گناہوں کی معافی کے ضابطے	71/نوح:3،نوٹ۔2
م	
1۔ مال ودولت کے لیے متوازن رویہ	100/العدیات:8،نوٹ۔2
2۔ مسلمان کے دوزخی ہونے کے اسباب	74/المدثر:42،نوٹ۔1
3۔ مشرقوں اور مغربوں کا مطلب	70/المعارج:40،نوٹ۔3
4۔ من اور ما کا استعمال	109/الکفرون:3،نوٹ۔2
5۔ منکرین حدیث کی تردید	75/القیامۃ:19،نوٹ۔3
6۔ موت وحیات کی حقیقت	67/الملک:2،نوٹ۔2
7۔ موسیٰؑ کا مقصد بعثت	79/النزیات:19،نوٹ۔3
8۔ میدان حشر میں حاضری کا نقشہ	78/النبا:18،نوٹ۔1
ن	
1۔ ناقص وادی اور یائی کے الفاظ کی پہچان	91/الشمس:6،ترکیب۔
2۔ نامۂ اعمال کی ریکارڈنگ	82/الانفطار:10،نوٹ۔1
3۔ نذر ماننے کے احکام	76/الدھر:7،نوٹ۔3
4۔ نظر بد کا علاج	68/القلم:51،نوٹ۔4
5۔ نفس لوامہ کی وضاحت	75/القیامۃ:2،نوٹ۔2
6۔ نفس مطمئنہ کی وضاحت	89/الفجر:15،نوٹ۔1۔4